علم تصوف واحسان

مؤلف :

مفتی عبیدالرحمان صاحب، مردان

تاثرات

حضرت مولانا مفتی محمد وہاب منگلوری صاحب

دامت برکاتہم العالیۃ

مکتبہ دارالتقویٰ، مردان

نام کتاب۔۔۔۔۔ علم تصوف واحسان

مصنف۔۔۔۔۔۔ مفتی عبید الرحمان صاحب، مردان

صفحات۔۔۔۔۔۔۳۹۶

تاریخ اشاعت۔۔۔۔۔۔رجب ۱۴۴۵ھ

ناشر۔۔۔۔۔۔مکتبہ دار التقویٰ، مردان

فون نمبر:۰۳۰۰۹۳۲۶۱۰۱

Darultaqwamardan@gmail.com

فہرست مضامین

تاثرات: حضرت مولانا مفتی محمد وہاب منگلوری صاحب ۱۷

بابِ اول: مبادی عشرہ ۲۰

تصوف کی لغوی تعریف ۲۰

اصطلاحی تعریف ۲۱

علم تصوف کا موضوع ۲۵

علمِ تصوف کے اغراض واہداف ۲۷

علامہ ابن جوزی کا وقیع تجربہ ۲۸

علم تصوف کی تاریخ ۳۰

علم تصوف کے مآخذ و مصادر ۳۲

علم تصوف کے بنیادی مسائل اور اجمالی تصور ۳۴

علم تصوف کی مشروعیت ۳۷

قرآن و سنت اور تصوف ۳۸

اجماع اور تصوف ۳۸

قیاس اور تصوف ۳۹

علم تصوف کا شرعی حکم ۴۰

علم تصوف اور دیگر علوم ۴۴

فلاسفہ کا علم الاخلاق اور علم تصوف ۴۷

علمِ تصوف کی فضیلت ۴۸

علم تصوف کا غرض اور اس کے فوائد و ثمرات ۴۹
تصوف اور اصلاح اخلاق کے دیگر ذرائع ۵۱
ہندوستان کے ایک عالم دین کی کارگزاری ۵۴
کیا تصوف دین ہے؟ ۵۶
کسی چیز کے دین ہونے نہ ہونے کا معیار ۵۶
تصوف کے دین ہونے کی وجوہات ۵۸
مقاصد تصوف اور اہتمام سلف ۶۱
سلف کے ہاں باطنی احوال کا اہتمام ۶۲
حضرت حنظلہ اور ابو بکر صدیق کا قصہ ۶۵
حضرت عمرؓ کا خود پسندی پر بیٹے کو مارنا ۶۸
علامہ ابن خلدون کا تجزیہ ۶۹
تصوف کی اہمیت عقل و فکر کی روشنی میں ۷۲
اہمیتِ تصوف علماء اسلام کی نظر میں ۷۳
تصوف کی اہمیت اقوال سلف و اکابر کی روشنی میں ۷۳
امام قشیری رحمہ اللہ اور تصوف ۷۳
امام غزالی رحمہ اللہ اور اہمیت تصوف ۷۵
امام رازی رحمہ اللہ کی تحقیق ۷۶
علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ کی تحقیق ۷۶
امام سبکی رحمہ اللہ کا اظہارِ عقیدت ۷۸

علامہ برکوی رحمہ اللہ کا فیصلہ ۷۹

امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تحقیق انیق ۸۰

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی تصریح ۸۱

قاضی محمد تھانوی کی رائے ۸۳

اہمیتِ تصوف کے پانچ مختلف پہلوؤں ۸۳

باب دوم: ۸۹

قلب سے متعلق دینی احکام اور اخلاق ۸۹

قلب اور اس کے صلاح وفساد کی اہمیت ۸۹

قلب سے متعلق چند قرآنی آیات ۹۰

دل سے متعلق چند روایات مبارکہ ۹۷

نصوص سے حاصل ہونے والے چند مسائل ۱۰۰

دل سے متعلق شرعی احکام ۱۰۳

مذموم صفات کی تعداد ۱۰۴

کیا اخلاق میں تبدیلی اختیاری ہے؟ ۱۰۶

بعض اہل علم کی طرف سے دوسرا جواب ۱۰۹

اخلاق کے باب میں خیر وشر کے پیمانے ۱۱۴

بعض فلاسفہ کا موقف ۱۱۴

دین اسلام کا موقف ۱۱۶

حصولِ اخلاق کے طریقے ماہرین کی نظر میں ۱۱۷

علمی اور نظریاتی علاج ۱۱۸
دوام و تسلسل کی اہمیت وافادیت ۱۱۹
حضرت شاہ صاحب کا وقیع تجربہ ۱۲۰
تہذیب اخلاق کے پانچ نکاتی تدبیر ۱۲۲
کچھ دیگر معاون امور ۱۲۴
با اخلاق افراد کی صحبت ۱۲۴
ریاضت اور مجاہدہ ۱۲۵
مجاہدے کا دو نکاتی مفید طریقہ کار ۱۲۶
نفس کی مخالفت: اہمیت وافادیت ۱۲۷
فلاسفہ کے ہاں حصول اخلاق کے پانچ طریقے ۱۲۸
تصوف اور اخلاق حسنہ کی تکمیل ۱۳۰
اذکار واشغال کا اصلاح اخلاق سے تعلق کیا؟ ۱۳۵
نقلی دلائل ۱۳۶
اللہ تعالیٰ کا ذاکرین کے ساتھ ہونے کے فوائد ۱۳۷
عقلی دلیل ۱۴۲
شرعی تکلیف کا دائرہ کار ۱۴۴
ظاہری اور باطنی اعمال کا باہم ربط و تعلق ۱۴۴
باب سوم: ۱۴۸
مذموم اخلاق وعادات ۱۴۸

کھانے پینے کا ہوس و حرص ۱۴۸

نقصانات ۱۴۸

اس ہوس کی مذمت میں چند روایات ۱۴۹

باعث واسباب ۱۵۰

علاج ۱۵۱

بھوک کے فوائد ۱۵۱

زیادہ بولنے کی حرص وہوس ۱۵۳

نقصانات ۱۵۳

مذمت میں چند احادیث: ۱۵۴

بواعث واسباب ۱۵۵

حل وعلاج ۱۵۷

غیظ وغضب کی صفت ۱۵۸

روایات ۱۵۸

نقصانات ۱۶۰

بواعث واسباب ۱۶۰

علاج و تجویز ۱۶۱

عملی تدبیر ۱۶۱

بغض وحسد ۱۶۲

نقصانات ۱۶۴

بواعث واسباب ۱۶۶

علاج وتدبیر ۱۶۷

علمی اور نظریاتی علاج ۱۶۸

عملی علاج: ۱۶۸

حبّ مال ۱۶۹

شرعی حکم ۱۶۹

وعیدات ۱۷۰

نقصانات ۱۷۱

اسباب وعلاج ۱۷۲

حب مال کی ایک ذیلی شاخ: بخل ۱۷۳

بخل کا مفہوم وحکم ۱۷۵

حبّ جاہ ۱۷۶

وعیدات ۱۷۶

نقصانات ۱۷۸

حب جاہ ومال کا نفسیاتی نقصان ۱۷۸

حکم ۱۷۹

علاج وتجاویز ۱۷۹

حب جاہ کی ایک شاخ: شہرت وتعریف چاہنا ۱۸۱

ضروری تنبیہ: ۱۸۲

حب دنیا ۱۸۲
دنیااور اس کا مفہوم ومقام ۱۸۳
دینی رہنمائی کی اہمیت وافادیت ۱۸۵
اسلام میں دین ودنیا کا تصور ۱۸۶
دنیا کی دلچسپ مثال ۱۸۷
دور حاضر کا عالمگیر فتنہ ۱۸۹
مادیت کا شکار کون؟ ۱۸۹
وعیدات ۱۹۰
چند قرآنی آیات ۱۹۰
چند فرمودات رسول صلی اللہ علیہ وسلم ۱۹۲
دین ومادیت میں اختلاف کے مظاہر ۱۹۴
مادیت کا علاج کیونکر ممکن ہے؟ ۱۹۵
کبر وتکبّر ۱۹۶
کیا ہر بھلائی میں تفوق کا احساس تکبر ہے؟ ۱۹۹
تکبر کا حقیقی مفہوم ۲۰۰
اہل فن کا تائیدی نکتہ ۲۰۱
وعیدات ۲۰۱
نقصانات ۲۰۳
اسباب تکبر ۲۰۳

علم بھی باعثِ کبر ہے.. ۲۰۵
علاج وحل.. ۲۰۶
عجب اور خود پسندی.. ۲۰۷
نقصانات.. ۲۰۸
علاج وحل.. ۲۰۸
ریاء.. ۲۱۰
ریاء کی مختلف تعریفات کا حل.. ۲۱۳
وعیدات.. ۲۱۵
نقصانات.. ۲۱۷
ریاء کا شرعی حکم.. ۲۱۷
ریاء کے مراتب اور درجات.. ۲۱۹
ریاء شامل ہونے کی چار صورتوں کا حکم.. ۲۲۱
باب چہارم:.. ۲۲۵
اخلاق حسنہ وصفات حمیدہ.. ۲۲۵
توبہ کا مفہوم واہمیت.. ۲۲۵
توبہ کی فضیلت واہمیت سے متعلق چند نصوص.. ۲۲۷
توبہ کا حکم.. ۲۲۸
علاج وحل.. ۲۳۱
خوف خدا.. ۲۳۱

حکم ۲۳۱
خوف خدا سے متعلق چند نصوص واقوال ۲۳۲
فوائد ۲۳۴
خوف خداوندی پیدا کرنے کا طریقہ ۲۳۵
اطمینانی اور بے خوفی کے اسباب ۲۳۶
زہد مفہوم ومقام ۲۳۹
زہد کے مراتب واحکام ۲۴۰
زہد کے فضائل ومناقب ۲۴۳
فوائد وثمرات ۲۴۵
حصول زہد کا طریقہ ۲۴۷
صبر ۲۴۸
فضائل ۲۵۰
صبر کا مادہ پیدا کرنے کا طریقہ کار ۲۵۱
صبر کے لحاظ سے لوگوں کے چار درجات ۲۵۳
صبر کے تین اجزاء ۲۵۴
صبر کا شرعی حکم ۲۵۶
شکر کا مفہوم وتعارف ۲۵۸
فضائل ۲۵۹
فوائد وثمرات ۲۶۰

شکر کے تین اجزاء ۲۶۱
شکر کا حکم ۲۶۴
ہر عضو کے بدلے صدقہ کا مفہوم ۲۶۶
روایات کا خلاصہ ۲۶۸
شکر کی واجب اور نفل قسمیں ۲۶۸
اخلاص ۲۶۹
اخلاص کے دو ارکان ۲۷۰
اخلاص کا پہلا رکن ۲۷۱
نیت کا مفہوم ۲۷۱
اخلاص کا دوسرا رکن ۲۷۲
اخلاص کی اہمیت ۲۷۲
اخلاص کے فضائل ۲۷۴
اخلاص کا حکم ۲۷۶
اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد ۲۷۸
مفہوم وتعارف ۲۷۸
توکل کے فضائل ۲۷۹
اہمیت وفوائد ۲۸۱
توکل کی بنیاد اور اس کے دو اجزاء ۲۸۲
پہلا جزء: اعتقاد وتصور ۲۸۳

دوسرا جزء: کردار عمل ۲۸۳

محبت الٰہی ۲۸۵

نصوص ۲۸۵

محبت الٰہی کی اہمیت و فوائد ۲۸۷

اللہ کی محبت کیوں؟ ۲۸۹

معیارِ محبت ۲۹۰

محبت پیدا کرنے کی ترکیب ۲۹۲

اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہنا (رضا بالقضاء) ۲۹۳

اہمیت اور فوائد ۲۹۳

نصوص وار وایات ۲۹۴

رضاء بالقضاء عقل سلیم کی روشنی میں ۲۹۵

کچھ شبہات کا دفعیہ ۲۹۶

محاسبہ ۲۹۷

محاسبہ کی افادیت نصوص و فرمودات کی روشنی میں ۲۹۷

محاسبہ کی غیر اہمیت اور فوائد ۳۰۲

محاسبہ کا مناسب طریقہ کار ۳۰۲

باب پنجم: ۳۰۶

انکارِ تصوف اور اس کا پس منظر ۳۰۶

تصوف کے خلاف لکھی گئی چند کتابیں ۳۰۸

اشکالات واعتراضات کی تنقیح ۳۰۹
اشکالات کے جوابات ۳۱۲
پہلا اشکال: تصوف بدعت ہے؟ ۳۱۲
علامہ شاطبی رحمہ اللہ کی تحقیق ۳۱۷
بدعت اور ائمہ تصوف ۳۱۸
دوسرے اشکال کا جواب ۳۱۹
کیا تصوف کا پودا دیگر ادیان سے بر آمد ہوا؟ ۳۱۹
تیسرے اشکال کا جواب ۳۲۲
کیا تصوف دین اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے؟ ۳۲۲
ائمہ تصوف اور اتباع سنت ۳۲۵
حضرت مجدّد صاحب اور اتباع شریعت کی اہمیت ۳۲۹
چوتھا اشکال اور اس کا جواب ۳۳۰
کیا تصوف عملی زندگی کے لئے رکاوٹ ہے؟ ۳۳۰
پانچواں اشکال: ۳۳۵
تصوف اور رہبانیت ۳۳۵
عزلت نشینی کا حکم اور بنیاد ۳۳۸
ایک عمومی اشکال اور اس کا جواب ۳۳۹
تصوف اور عہدِ سلف ۳۳۹
ایک غیر مقلد عالم کا ادیبانہ معروض ۳۴۰

غلط فہمیاں اور ان کی وجوہات واسباب ۳۴۲
ناقدین کی کوتاہیاں ۳۴۳
تصوف سے وابستہ افراد کی کوتاہیاں ۳۴۵
موجودہ خانقاہی نظام کی ناکامی اور اس کی وجوہات وتجاویز ۳۴۹
کامیابی اور ناکامی کی کسوٹی ۳۴۹
خانقاہی کام کو مستقل کام نہ سمجھنا ۳۵۰
رسمیت کی پابندی اور مقاصد سے غفلت ۳۵۳
اتباع شریعت میں کمزوری ۳۵۴
قول وفعل کا تضاد ۳۵۵
نااہل لوگوں کا براجماں ہونا ۳۵۶
نااہل کی دخل اندازی کی دوصورتیں ۳۵۹
دینی شعبوں کی مزاحمتی فضاء ۳۶۲
فتنوں کا سیلِ رواں ۳۶۳
راہِ تصوف اور تطہیر کی ضرورت ۳۶۶
کیا تصوف کو بالکل چھوڑا نہ جائے! ۳۶۶
اصلاحِ تصوف کا تسلسل ۳۶۷
امام قشیری رحمہ اللہ کی اصلاحات ۳۶۸
علامہ زرّوق مالکی رحمہ اللہ ۳۶۸
حضرت مجدّد صاحب رحمہ اللہ کی اصلاحات ۳۶۹

امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی اصلاحات ۳۶۹
علامہ رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کی اصلاحات ۳۷۰
مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ کی اصلاحات ۳۷۰
"پہلا اشکال وجواب" ۳۷۳
"دوسرا اشکال وجواب" ۳۷۵
"تیسرا اشکال وجواب" ۳۷۵
"چوتھا اشکال وجواب" ۳۷۸
"پانچواں اشکال وجواب" ۳۷۹
"چھٹا اشکال وجواب" ۳۸۱
"ساتواں اشکال وجواب" ۳۸۲
"آٹھواں اشکال وجواب" ۳۸۲
"نواں اشکال وجواب" ۳۸۳
"دسواں اشکال وجواب" ۳۸۳
"گیارہوں اشکال وجواب" ۳۸۴
"بارہواں اشکال وجواب" ۳۸۴
"تیرہواں اشکال وجواب" ۳۸۶
"چودہواں اشکال وجواب" ۳۸۷
"پندرہوں اشکال وجواب" ۳۸۷
مصادر و مراجع ۳۸۸

تاثرات: حضرت مولانا مفتی محمد وہاب منگلوری صاحب

اندراسِ علم اور ذوقِ علمی کے کمی کے اس دور دورہ میں برادر مکرم مولانا مفتی عبید الرحمن صاحب، مردان کا علمی اور تحقیقی ذوق یقینا قابل رشک اور قابل داد ہے۔ مختلف علوم اور موضوعات پر آپ کی تحقیقی کتب اور مطالعہ جات منصہ شہود پر آچکے ہیں جس کے انوارات ،برکات اور تجلیات سے علمی اور مطالعاتی مکتب فکر کے لوگ مستفید ہورہے ہیں۔ جس کے روحانی فیض اور علمی تحقیق معیار کی شہادت مختلف رسائل میں تبصروں کی صورت میں ارباب علم وفضل اور ثقہ ومحتاط اساطین علم دے چکے ہیں۔

مے کشوں کے چشم ولب سے جو نمایاں ہوسکے
اس سے بڑھ کر مستند روداد ہے خانہ نہیں

حضرت مفتی صاحب کا کمال یہ ہے کہ موضوع کا حق ادا کرتے ہیں اور ہمہ جہت پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر لکھا کرتے ہیں جو ایک باکمال انسان اور علمی معیار کی علامت ہے، نیز آپ کا کسی مسئلہ میں رجحان جس طرف بھی ہوتا ہے اعتدال اور احتیاط کا دامن تھامے ہوئے اس کے وجوہ ترجیح بھی بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی مخالف نکتہ نظر رکھنے والوں کی دلائل بھی ذکر کرکے خوش اسلوبی کے ساتھ اس کا مرجوح یا غلط ہونا ثابت کرتا ہے۔

الحمدللہ اس بار آپ نے ایک حساس موضوع علم سلوک اور تصوف پر قلم اٹھا کر یقینا ایک بڑا علمی میدان سر کرلیا ہے۔ تصوف اور سلوک انسان کے باطنی صلاحیتوں اور قوتوں سے بحث کرتا ہے جو بذات خود بعض لحاظ سے ایک دقیق اور خشک موضوع ہے۔ ایک طرف اگر یہ مقاصد شریعت کا خلاصہ اور نفسانی ونفسیاتی علم سمجھا جاتا ہے، تو

دوسری طرف عجمی متصوفانہ خیالات اور فلاسفہ کے منہ شگافیوں نے اسے مزید مشکل بنا دیا ہے، جس کی وجہ سے اس راہ کے راہرو باطنی کیفیات کے ساتھ ساتھ علمی طور پر بھی ٹھوکر کھانے کے بہت مواقع پیش آتے ہیں۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردای
بازمے گوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش

حضرت مفتی مدظلہ کی یہ تصنیفِ لطیف اگر ایک طرف تصوف وسلوک سے انکاری لوگوں کے لئے راہ ہدایت ہے تو دوسری طرف تصوف کے راہزنوں، بھیڑیوں اور نفس پرست اور گمراہ پیروں کی بدعات و گمراہوں کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے عامۃ مسلمین اور طالبان حق کو ان سے دور رہنے کی تلقین بھی ہے، بہر حال یہ عظیم علمی ذخیرہ اکابر اولیاء کرام اور محققین علماء کی ایسی زرین اقوال، فیوضات اور تعلیمات سے مزین ہے اور ایسی مفید ونافع ذخیرہ ہے جو اہل سلوک کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس قدر مفید اور دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اللہ کریم مؤلف اور تمام معاونین کے لئے سعادت دارین کا ذریعہ بنا دے اور امت کے لئے ہدایت کا عظیم سبب بنا کر قبول فرمائے۔ آمین

(حضرت مولانا مفتی) محمد وہاب (منگلوری، دامت برکاتہم العالیۃ)
۲۹/۰۹/۲۰۲۲

☆☆☆☆☆☆☆

- ✓ باب اول: مبادی عشرہ
- ✓ تصوف کی لغوی واصطلاحی تعریف
- ✓ اغراض واہداف، ثمرات، فضائل
- ✓ علم تصوف کی تاریخ اور بنیادی مصادر
- ✓ ادلہ اربعہ سے اثبات
- ✓ علم تصوف کا شرعی حکم
- ✓ علم تصوف کے بنیادی مسائل اور اجمالہ خاکہ
- ✓ علم تصوف اور دیگر علوم
- ✓ تصوف اور اصلاح خلق کے دیگر ذرائع
- ✓ مقاصد تصوف اور اہتمام سلف

بابِ اول: مبادی عشرہ

تصوف کی لغوی تعریف

اس علم کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، کبھی اس کو "سلوک واحسان" کہا جاتا ہے کیونکہ ایک تو حدیث جبرئیل میں لفظ احسان وارد ہوا ہے اور ساتھ یہی اس علم کا منتہائے مقصود بھی ہے۔ بسا اوقات اس کو" علم تزکیہ" کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس کا مقصد یہی ہے کہ لوگوں کے باطنی اخلاق وصفات کی اصلاح کی جائے اور خود حضور نبی کریم ﷺ کے مقاصد بعثت میں سے ایک اہم مقصد یہی شمار فرمایا گیا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کریں گے۔ اسی طرح اخلاق کے ساتھ متعلق ہونے کی وجہ سے اس کو "علم الاخلاق" بھی کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس علم کے اہداف ومباحث کا تعلق دل کے ساتھ ہے، اس لئے بعض کتابوں میں اس کو "علم القلب" کے ساتھ بھی تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "در مختار" میں اسی نام سے اس کو ذکر کیا گیا ہے۔

لیکن عام طور پر اس علم کا جو نام مشہور ہے وہ "علم تصوف" ہے اور عموماً اسی نام سے یہ جانا جاتا ہے۔ تصوف کا ماخذ اور لغوی معنیٰ کیا ہے؟ اس کے متعلق آراء مختلف ہیں البتہ بہت سے محققین کے نزدیک راجح یہی ہے کہ یہ لفظ "صوف" سے بنا ہے جو اون کے لباس کو کہا جاتا ہے، پہلے زمانے میں ریاضات وعبادات سے وابستہ لوگ اور سلوک واحسان کے مقاصد سے شناور افراد کا عام طور پر یہی متواضعانہ لباس تھا، اس لئے اسی نسبت سے اس فن کو "تصوف" اور اس سے وابستہ حضرات کو "صوفیاء کرام" کہا جانے لگا۔

اصطلاحی تعریف

علامہ ابو بکر محمد کلاباذی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "التعرّف" میں حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے حوالہ سے تصوف کا تعارف یوں نقل فرمایا ہے:

"سئل الجنيد عن التصوّف، فقال:" تصفية القلب عنْ موافقة البريّة ومفارقة الأخلاق الطّبيعية وإخماد الصّفات البشريّة ومجانبُ الدّواعي النّفسانية ومنازلة الصّفات الرّوحانية والتعلّق بالعلوم الحقيقية واستعمال ما هو أولىٰ علىٰ الأبدية والنّصح لجميع الأمّة والوفاء لله علىٰ الحقيقة واتّباع الرّسول صلّىٰ الله عليه وآلة وسلّم في الشّريعة".[١]

ترجمہ:"حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ سے تصوف کے بارے میں پوچھا گیا، توانہوں نے فرمایا: مخلوق کی موافقت سے دل کو صاف کرنا، طبعی اخلاق سے جدائی، صفاتِ بشریہ کو مارڈالنا، نفسانی خواہشات سے دوری، روحانی صفات میں قدم رکھنا، علوم حقیقیہ سے تعلق، وہ عمل کرنا جو آخرت کے لئے بہتر ہو، تمام امت کی خیر خواہی، اللہ تعالیٰ سے وفاداری اور رسول اللہ ﷺ کی تابعداری کو تصوف کہتے ہے"۔

---

[١] التعرّف لمذهب أهل التصوّف ،ص٧٢.

٢إتمام الدراية لقراء النقاية، علم التصوف، ص: ١٦٣.

امام بیہقی رحمہ اللہ، امام ابو عبد الرحمن سلمی سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابو سہل محمد بن سلیمان رحمہ اللہ سے تصوف کی حقیقت کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ یہ تصوف کیا چیز ہے؟ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

«الإعراض عن الاعتراض».[1]

ترجمہ: "اعتراض سے روگردانی کرنا"۔

امام غزالی رحمہ اللہ ایک دوسری بات کے ضمن میں تصوف کا تعارف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

«أما التصوف فهو عبارة عن تجرد القلب لله تعالیٰ واستحقار ما سویٰ الله».[2]

ترجمہ: "تصوف دل کو اللہ کے لئے فارغ کرنے اور اللہ تعالی کے ماسوا کو حقیر جاننے سے عبارت ہے"۔

امام سیوطی رحمہ اللہ امام غزالی رحمہ اللہ سے تصوف کی تعریف نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تَجْرِيد الْقلب لله تَعَالَىٰ واحتقار مَا سواهُ وَلذَلِك سمي بِهِ أخذا من الصفاء لتصفيته للقلوب كَمَا قيل.[3]

۳الزهد الكبير للبيهقي،ص: ۲۸۹.

۴إحياء علوم الدين، كتاب أداب السّفر، ج۲ص۲۵۰.

ترجمہ:"تصوف دل کو اللہ کے لئے فارغ کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ماسوا کا دل میں بے وقعت ہونے کا نام ہے۔ اور یہ صفاء سے مأخوذ ہے اور اس کو تصوف اس لئے کہتے ہے کہ اس کے ذریعے دلوں کی صفائی ہوتی ہے"۔

اس کے مطابق علم تصوف وہ علم ہے جس کے ذریعے دل کو اللہ تعالیٰ کی خاطر خالی رکھنے کا طریقہ بتایا جاتا ہے اور غیر اللہ کی حقارت پیدا ہوتی ہے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ کی ایک دوسری کتاب میں تصوف کی تعریف یہ لکھی ہے:

هُوَ الْعلم بالأصول الموروثة من تَصْحِيح الْأَعْمَال ظَاهرا وَبَاطنا.[1]

ترجمہ:"تصوف ان موروثی اصولوں کے علم کا نام ہے جن کے ذریعے ظاہری اور باطنی اعمال کی درستگی ہوتی ہے"۔

حاجی خلیفہ رحمہ اللہ نے بعض حضرات سے اس کی یہ تعریف نقل فرمائی:

علم الأخلاق وهو قسم من: الحكمة العملية.. وهو علم بالفضائل، وكيفية اقتنائها، لتتحلى النفس بها، وبالرذائل: وكيفية توقيها، لتتخلى عنها.[2]

ترجمہ:"علمِ اخلاق حکمت عملی کی ایک قسم ہے، اور وہ خوبیوں اور ان کے حاصل کرنے کی کیفیت اور بری خصلتوں اور ان بچنے کی کیفیت کے علم کا نام ہے، تاکہ خوبیوں کے ساتھ نفس آراستہ ہو اور بری خصلتوں سے پاک ہو"۔

---

[1] معجم مقاليد العلوم في الحدود والرسوم،ص: ٢١٠.

[2] كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون ج١ص١.

قاضی محمد تھانوی صاحب رحمہ اللہ اس کی تعریف اور مختلف نام ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

علم السلوك: وهو معرفة النفس ما لها وما عليها من الوجدانيات على ما عرفت قبيل هذا، ويسمّى بعلم الأخلاق وبعلم التصوّف أيضا.[١]

ترجمہ: "علم سلوک: انسان کی ان چیزوں کی پہچان کو کہتے ہے جو انسان کے لئے (اخروی لحاظ سے) مفید یا مضر ہوں، اور اسے علمِ اخلاق اور علمِ تصوف بھی کہتے ہے"۔

شیخ فقیر اللہ صاحب رحمہ اللہ "احسان" اور "تصوف" کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هو عبارة عن رياضة النّفس بالمجاهدة الشّاقّة المشروعة وتجريدها عن الكدورات البشريّة والعوائق الجسدية مع صدق التوجّه إلى الحضرة الصّمدية والمواظبة على الطّاعات والأذكار السنّة السنّية.[٢]

ترجمہ: "تصوف نفس کی سخت اور جائز مجاہدہ کی مشق اور بشری کدورتوں اور جسمانی رکاوٹوں سے پاک کرنے کے ساتھ ساتھ اس بے نیاز ذات کی طرف حقیقی توجہ، اور دینی احکامات اور مسنون اذکار پر دوام اور پابندی کا نام ہے"۔

---

٧ كشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، ج١ ص٤٢.

٨ قطب الإرشاد، ص٦.

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے بھی اس کے قریب قریب تعریف نقل فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں:

هو علم يعرف به أنواع الفضائل وكيفية اكتسابها وأنواع الرذائل وكيفية اجتنابها. اه۔[1]

ترجمہ: "تصوف وہ علم ہے جس کے ذریعے بہترین اعمال اوران کو حاصل کرنے کی کیفیت جانی جاتی ہے، اوراسی کے ذریعے برے اعمال اوران سے بچنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے"۔

مقصود کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان تعریفات میں کوئی فرق نہیں ہے اور سب کا حاصل یہ ہے کہ تصوف اخلاق حسنہ حاصل کرنے، برے و مذموم صفات و اخلاق کی درستگی کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ قلبی ربط و تعلق قائم کرنے کا نام ہے اور جس علم سے اس منزل کو حاصل کرنے کے طور وطریقے بیان کئے جاتے ہیں، اس کو "علم تصوف" کہا جاتا ہے۔

علم تصوف کا موضوع

اخلاق حمیدہ اور اخلاق مذمومہ علم تصوف کا موضوع ہے کہ اچھے اور نیک صفات واخلاق کو کیونکر حاصل کیا جاسکے اور مذموم وناپسندیدہ اخلاق وصفات سے کس طرح دل کو محفوظ کیا جائے۔ علم تصوف میں اسی سے بحث کی جاتی ہے کہ انسانی نفس کو اچھے اخلاق سے کس طرح متصف کیا جاسکتا ہے اور برے اخلاق واطوار سے

---

[1] حاشیةابن عابدين علي الدرالمختار: ج١ص٤٣

کیونکر اس کو پاک وصاف کیاجاسکتاہے!اس لئے یہی اس علم کاموضوع ہے۔حاجی خلیفہ صاحب نے علم اخلاق کا تقریباًیہی موضوع ذکر کیاہے۔

علامہ محمد بن علی تھانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وموضوعه أخلاق النفس إذ يبحث فيه عن عوارضها الذاتية، مثلا حبّ الدنيا في قولهم: حبّ الدنيا رأس كل خطيئة، خلق من أخلاق النفس حكم عليه بكونه رأس الخطايا ورأس الأخلاق الرذيلة التي تتضرر بسببها النفس، وكذا الحال في قولهم: بغض الدنيا رأس الحسنات؛ وغرضه التقرّب والوصول إلى الله تعالى.[1]

ترجمہ:"علم تصوف کاموضوع نفس کی عادات ہیں،کیوں کہ اس علم میں اس کے عوارضِ ذاتیہ سے بحث کی جاتی ہے ،مثلاً:صوفیاء کرام کے اس قول کہ:"دنیاکی محبت ہر خطاکی ابتداء ہے"میں "دنیاکی محبت"نفس کی عادات میں سے ایک عادت ہے،اس پر حکم لگایاگیاکہ یہ خطاؤں اوران عاداتِ رذیلہ کی بنیادہے جن کی وجہ سے نفس کوضرر پہنچتاہے،اوریہی حال صوفیاءکرام کےاس قول کاہے کہ:"دنیاسے نفرت بھلائیوں کی بنیاد ہے"اور تصوّف سے مقصوداللہ تعالیٰ کاقرب حاصل کرناہے"۔

١٠كشاف اصطلاحات الفنون،ج١ص٤٢. ونقله العلامة صديق حسن خان القنوجي في أبجد العلوم ،ص٤١٩.

علم تصوف کے اغراض واہداف

قرآن وسنت کی روشنی میں جن اخلاق حسنہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا ان کی ترغیب وارد ہوئی ہے، ان کو حاصل کرنا اور نفس کو ان سے عادی بنانا اور مذموم وناپسندیدہ اخلاق سے نفس کو محفوظ رکھنا اس علم کا بنیادی فرض اور اساسی ہدف ہے۔ بعض حضرات صرف اخلاص واحسان کے حاصل کرنے کو اس علم کا مقصود سمجھتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے کیونکہ اخلاص واحسان تو ان نیک صفات واخلاق میں سے صرف ایک صفت ہے جن کو شریعت اخلاق حسنہ کے درجہ میں رکھتی ہے جبکہ تصوف کا مقصود اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ تاہم اگر احسان کا یہ معنیٰ قرار دیا جائے کہ انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے استحضار کے تصور میں رہے اور اس کی وجہ سے اس کا ظاہری باطنی ہر قول وفعل اللہ تعالیٰ کی مرضی اور شریعت کے سانچے میں ڈھلتا رہے تو البتہ مناسب ہے۔

اب چونکہ ان اخلاق کی رہنمائی شریعت نے فرمائی ہے اور اچھے اخلاق کو اختیار کرنا ہو یا برے اخلاق سے اپنی حفاظت کا قضیہ ہو، دونوں کی ترغیب وترہیب شریعت نے دی ہے اور اس سلسلے میں بلا مبالغہ سینکڑوں نصوص وارد ہوئی ہیں، اس لئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "علم تصوف" کا غرض ان تمام نصوص پر عمل کی راہ ہموار کرنا بھی ہے۔ اور پھر صرف یہی نہیں ہے بلکہ انہی اخلاق باطنہ کی وجہ سے دین کے دیگر تمام احکام پر درستگی کے ساتھ عمل کرنے کی توفیق ہوتی ہے اور دیگر اعمال وافعال میں مرتبہ اخلاص واحسان نصیب ہوتا ہے جو ہر عمل کی روح اور اس کے قبولیت کی بنیاد ہے اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ اس علم کی برکت سے صرف

باطنی اخلاق وصفات ہی حاصل نہیں ہوتے بلکہ پورے دین پر دلی آمادگی، دلجمعی اور خوش اسلوبی کے ساتھ عمل کرنے کی توفیق نصیب ہوتی ہے تو یہ کچھ بعید نہیں ہے بلکہ انصاف اور ہزاروں افراد کا آزمودہ تجربہ ہے اور اسی مناسبت سے تصوف کو پورے دین ومذہب کا روح قرار دیا جاتا ہے۔

علامہ ابن جوزی کا وقیع تجربہ

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ، باوجودیکہ کچھ لوگ ان کو منکرین تصوف میں سے گردانتے ہیں، وہ اپنا وقیع تجربہ پوری صفائی کے ساتھ بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

رأيت الاشتغال بالفقه وسماع الحديث لا يكاد يكفي في صلاح القلب؛ إلا أن يمزج بالرقائق، والنظر في سير السلف الصالحين. فأما مجرد العلم بالحلال والحرام، فليس له كبير عمل في رقة القلب؛ وإنما ترق القلوب بذكر رقائق الأحديث، وأخبار السلف الصالحين؛ لأنهم تناولا مقصود النقل، وخرجوا عن صور الأفعال المأمور بها إلى ذوق معانيها والمراد بها. وما أخبرتك بهذا إلا بعد معالجة وذوق، لأني وجدت جمهور المحدثين وطلاب الحديث همة أحدهم في الحديث العالي، وتكثير الأجزاء، وجمهور الفقهاء في علوم الجدل، وما يغالب به الخصم. وكيف يرق القلب مع هذه الأشياء؟![1]

---

[1] صيد الخاطر،فصل:الرقائق والنظر في سير الصالحين،ج١ص ٢٢٨.

ترجمہ: "میں سمجھتا ہوں کہ باطن کی اصلاح کے لئے فقہ اور علم حدیث کافی نہیں، جب تک اس کے ساتھ علم باطن اور سلف صالحین کی زندگی پر نظر ہو، دل کی نرمی (اصلاح) میں حلال وحرام کے جاننے کا کچھ زیادہ دخل نہیں ہے، دل تو زہد کے احادیث اور سلف صالحین کے قصوں سے ہی نرم ہوتے ہیں، اس لئے کہ وہ حضرات نصوص کے عملی مصداق تھے اور مامورات کی ظاہری صورتوں سے نکل کر ان کے ذوقی معنی اور مراد کی طرف نکل گئے ہیں اور جو کچھ ان حضرات نے آپ کو بتایا تجربہ اور ذوق کے بعد ہی بتایا، اس لئے کہ میں نے بہت سے محدثین اور حدیث کے طالب علم کو حدیث کی سند عالی کرنے اور زیادہ حدیث جمع کرنے ہی میں پایا اور بہت سے فقہاء اختلافی مسائل اور مخالف کو ہرانے کی طریقوں کو سیکھنے میں پایا تو ان حالات میں دل کیسے نرم ہو"؟

یہاں تک تو اپنا ذاتی تجربہ بیان فرمایا، اس کے بعد اس سوال کا جواب دینا چاہتے ہیں کہ سلف صالحین کا اس حوالہ سے کیا معمول رہا ہے؟ وہ دل کی نرمی ودرستگی کے لئے کیا اور کونسا طریقہ اختیار کرتے تھے؟ فرماتے ہیں:

وقد كان جماعة من السلف يقصدون العبد الصالح للنظر إلى سمته وهديه لا لاقتباس علمه، وذلك أن ثمرة علمه هديه وسمته. فافهم هذا، وامزج طلب الفقه والحديث بمطالعة سير السلف والزهاد في الدنيا، ليكون سببًا لرقة قلبك.[1]

ترجمہ: "اسلاف کی ایک جماعت کسی بزرگ کی سیرت وزندگی اپنے لئے مشعل راہ بنالیتی، صرف اس کی علمی اقتباسات مقصد نہیں بناتی اور یہ اس لئے کہ اس بزرگ کے

---

[1] أيضا، ج١ص٢٢٩.

علم کا خلاصہ اور فائدہ اس کی زندگی ہوتی تھی، خوب سمجھ لو! فقہ اور علم حدیث کے ساتھ اسلاف اور تارک الدنیا بزرگوں کی زندگی کا مطالعہ شامل کرو تاکہ وہ آپ کے دل کی نرمی کا سبب بنے"۔

علم تصوف کی تاریخ

اس کے متعلق بہت سے لوگ غلط فہمی کے شکار ہو جاتے ہیں اور پہلی صدی کے بعد مختلف ادوار کے بزرگوں کا نام لیکر ان کو اس علم کا موجد / بانی / یا مدون باور کرا لیتے ہیں، کوئی بایزید بسطامی رحمہ اللہ کا نام لیتا ہے تو کوئی حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا، کوئی ابراہیم ابن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیتا ہے تو کوئی امام عبد الکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا بانی سمجھتا ہے، یوں ہی بعض لوگ حضرت امام غزالی رحمہ اللہ کو اس کا مدون قرار دیتے ہیں اور بعض تصوف کے چار رائج اور مشہور سلاسل کے حضرات کے سر اس علم کی تدوین کا تاج رکھ لیتے ہیں۔

یہ سب غلط فہمی ہی ہے۔ تصوف کا ابھی تک جو کچھ تعارف کیا گیا ہے، اس کے مطابق طلوع اسلام کے وقت سے ہی اس کی ابتدا ہوئی، اور کیوں نہ ہو کہ جب ضرورت ہی روزِ اول سے تھی تو ابتدا ہی وہی سے ہوگی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جیسا کہ ابھی تک تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، تصوف اخلاص واحسان سمیت تمام اخلاقِ حسنہ کے حاصل کرنے اور کبر وریاء سمیت تمام مذموم صفات واخلاق سے اپنے نفس کو بچائے رکھنے کا نام ہے، دل کی دنیا کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اسی کی غیر معمولی محبت سے آباد و سرشاد رکھنے سے عبارت ہے۔ مسلمانوں کو روزِ اول ہی سے اس کی ضرورت بھی تھی اور عملی طور پر یہ سلسلہ جاری بھی تھا۔

کیااس بات کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ:

الف: زمانہ نزول وحی میں ان باتوں کی ضرورت نہ تھی اور انسانیت اس وقت ان باتوں کی مکلف نہ تھی۔

ب: یااس کی ضرورت بھی تھی اور لوگ اس کے مکلف بھی تھے لیکن عملی طور پر اس وقت کے مسلمان ان فرائض کی تکمیل کرنے سے قاصر وغافل رہیں؟

ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں شرعاًنا قابل تسلیم ہیں، لہٰذا نتیجہ یہی ہوا کہ جب سے باطنی اخلاق وصفات کے متعلق نصوص نازل ہوئی ہیں، اسی وقت سے اس کو حاصل کرنے کا تسلسل بھی جاری رہااور اسی کو تصوف کہا جاتا ہے۔

فرق اگر ہے تو یہی کہ ہمارے زمانے میں تصوف کا موجودہ طریقہ کار اوراس کی معاصر شکل اس زمانے میں رائج نہیں تھی۔یہی چیز بہت سے لوگوں کے لئے رکاوٹ بن جاتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ تصوف تو بہت بعد کے زمانے کی پیداوار ہے۔حالانکہ ان صورتوں وشکلوں کی حیثیت تصوف کے رکن کی نہیں ہوتی جس کے نہ ہونے سے تصوف کے موجود نہ ہونے پر استدلال کیا جاسکے بلکہ تصوف کا اصل مقصود اصلاح قلب ہے جس کی ضرورت ہر زمانے میں برابر قائم رہے گی ، اس مقصود کو حاصل کرنے کے لئے کونسا طریقہ کار اختیار کیا جائے؟اور کن کن منازل سے گزر کر اس گوہرِ مقصود کو دریافت کیا جاسکتا ہے؟ اس میں زمانے،ماحول، افراد اور طبیعتوں کے لحاظ سے فرق کا ہونا ایک ایسی بدیہی بات ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔لہٰذا ضروری نہیں ہے کہ جو طریقہ کار ایک زمانے میں اس مقصود کو حاصل کرنے کے لئے مفید ومعتبر ہو ،وہی طریقہ تمام

زمانوں میں کار آمد ثابت ہو جائے، اسی طرح ماحول وغیرہ عناصر کا بھی یہی حال ہے۔

اب دورِ نبوت میں محض حضور نبی اکرم ﷺ کی صحبت میں ہی یہ عجیب وغریب تاثیر تھی کہ جو شخص تصدیق وایمان کے ساتھ اس سعادت کو پالیتا تھا، اس کے دل کی دنیا صرف معمور ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ ترقی اور ولایت کے اعلیٰ مراتب تک پہنچ جاتی تھی اور بعد کے ادوار میں یہ چیز اتنی عام نہ رہی، ہر مجلس میں یہ تاثیر باقی نہ رہی کہ محض حاضری سے دل کا قبلہ درست ہو سکے بلکہ اس کے لئے دیگر امور کی بھی ضرورت پڑتی رہی، لیکن یہ امور بذات خود مقصود نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت ایک علاج ودواء کی ہے جو خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ صحت وشفاء یابی اصل مقصود ہوتی ہے، علاج ومعالجہ اس کا ایک وسیلہ ہوتا ہے۔

علم تصوف کے مآخذ ومصادر

تصوف دینی علوم وفنون کی طرح ایک دینی اور اسلامی علم بلکہ چمنستان علم کا گلِ سرسبد ہے، اس کے مآخذ ومصادر وہی ہیں جو شریعت کے مصادر ہیں یعنیٰ کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع امت اور قیاس شرعی۔ محقق اصولیین نے ذکر فرمایا ہیں کہ یہ چاروں چیزیں صرف اصطلاحی فقہ ہی کے مصادر نہیں ہیں بلکہ پورے دین وشریعت کے یہی چار مآخذ ہیں اور یہی سے دین اسلام کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ نیز متقدمین کے زمانے میں خود لفظ "علم فقہ "کا اطلاق بھی صرف ان مسائل کے مجموعے پر نہ ہوتا تھا جو ظاہری اعضاء وجوارح سے متعلق ہیں جیسا کہ متاخرین حضرات کے ہاں یہ اصطلاح رائج ہوئی ہے بلکہ "فقہ "کا اطلاق ان تمام مسائل

واحکام پر کیاجاتا تھاجو اخروی لحاظ سے انسان کے لئے مفید یا مضر ہوں، اس کے ضمن میں مروج علم کلام، علم تصوف اور علم فقہ داخل ہو جاتے ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے فقہ کی یہ تعریف نقل کی گئی ہے کہ:

الفقه: معرفة النفس مالها وما عليها، وهو المنقول عن أبي حنيفة.[1]

ترجمہ: "فقہ انسان کے ان چیزوں کی پہچان کو کہتے ہیں جو انسان کے لئے (اخروی لحاظ سے) مفید یا مضر ہوں، اور یہی تعریف امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے"۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم فقہ اور علم کلام کی طرح علم تصوف کے بنیادی مصادر و مآخذ بھی یہی چار چیزیں ہیں، یہی سے تصوف سے متعلق مسائل واحکام کا اخذ واستنباط کیاجاتاہے۔ البتہ جس طرح فقہ وکلام کی کتابوں میں بہت سی ایسی باتیں جمع کردی گئیں ہیں جو ان فنون کے مقاصد اور بنیادی مسائل کی حیثیت تو نہیں رکھتے تھے لیکن بعض ضرورتوں اور فوائد کے پیش نظر عقل و تجربے کی روشنی میں ان کو متعلقہ کتابوں کا حصہ بنادیا گیاہے، یوں ہی علم تصوف میں بھی علاج وانتظام کی حد تک کچھ باتیں شامل ہو گئیں ہیں جن کا مقصود اصلاح دل اور تزکیہ نفس ہے، اس نوعیت کی باتیں مختلف تجربات وغیرہ کی روشنی میں حاصل ہوئی ہیں اور اپنی غیر معمولی افادیت کے پیشِ نظر علم تصوف کی کتابوں میں شامل کردی گئیں ہیں۔

لیکن ان باتوں کی حیثیت مقاصد کی نہیں بلکہ ذرائع کی ہے، ذریعہ کا حکم یہی ہے کہ اس میں اگر خود کوئی ناجائز عنصر شامل نہ ہو اور مقصود بھی شرعاً درست

---

[1] الكافي شرح البزدوي: ج١ص١٤٤.

ہو تو اس کے اختیار کرنے میں شرعاً مضائقہ نہیں بلکہ جن ذرائع پر ضروری دینی مقاصد موقوف ہو جاتے ہیں، ان کو اختیار کرنا شرعاً ضروری بن جاتا ہے، لہٰذا ان انتظامی نوعیت کے مباحث کے لئے الگ سے کسی خاص نص کی ضرورت نہیں۔

علم تصوف کے بنیادی مسائل اور اجمالی تصور

یوں تو دیگر تمام علوم وفنون کی طرح علم تصوف میں بھی زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ توسع ہوتا رہا اور مختلف جہات سے اس میں مختلف مباحث اور متنوع مسائل داخل ہوتے رہیں جن کی پوری فہرست خاصی طویل ہونے کے ساتھ ساتھ غیر ضروری بھی ہے۔ تاہم یہاں آسانی کی خاطر اس علم اوراس کے کتابی ذخیرے کے اہم مباحث کو اجمالی طور پر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس فن کی اہم کتابوں کی طرف مراجعت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن سے متعلقہ مباحث کی دو قسمیں ہیں:

الف: وہ مباحث و مسائل جو اس فن کے مقاصد میں سے ہیں اور جن کو حاصل کرنے کی خاطر تصوف کا عملی طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ ان کو یہاں آسانی کے لئے "مقصودی مباحث" کا نام دیا جاتا ہے۔

ب: وہ مباحث و مسائل جو بنیادی مقاصد میں سے نہیں ہیں لیکن ان کا اس فن کے ساتھ کسی نوعیت کا تعلق ہوتا ہے چاہے مبادی و مقدمات کی حیثیت سے تعلق ہو یا زوائد و نتائج کے لحاظ سے اس فن کے ساتھ مربوط ہوں۔ ان کو یہاں سہولت کی خاطر "انتظامی مباحث" کا عنوان دیا جاتا ہے۔

پہلی قسم کے مباحث درج ذیل ہیں:

باب اول: منجیات یعنیٰ وہ احکام جن پر نجات اخروی موقوف ہے، اس میں درج ذیل مباحث آتے ہیں:

۱: توبہ

۲: صبر وشکر

۳: خوف ورجاء

۴: فقر وزہد

۵: حسن نیت، صدق واخلاص اور احسان

۶: نفس کا محاسبہ ومراقبہ

۷: تفکر

۸: توکل واعتماد علی اللہ

۹: اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت، شوق اور اس کے فیصلوں پر رضامندی

۱۰: موت کی یاد۔

باب دوم: مہلکات یعنیٰ وہ چیزیں جو انسان کی ہلاکت اور اخروی خسارے ونقصان کا باعث ہیں، اس کے تحت یہ مباحث داخل ہوتے ہیں:

۱: نفس، روح اور قلب کی حقیقت، ان کو سدھارنے یا بگاڑنے کے اسباب اوران کے طریقے۔ ترقی اور تنزل کے لحاظ سے اس کے مختلف درجات ومنازل۔

۲: پیٹ اور شرمگاہ کی شہوت وخواہشات۔

۳: زبان کے آفات ومنکرات

۴: کینہ، بغض وحسد

۵:حبِّ دنیا

٦:مال کی محبت، بخل و حرص اور جود و سخاوت

۷:جاہ و حشمت کی محبت

۸:ریاء

۹:کبر و عجب

۱۰:غفلت و غرور

ان دونوں ابواب میں نجات یا ہلاکت کے جتنے اسباب ذکر کئے گئے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی حقیقت، اس کا شرعی مفہوم، اس کے اسباب بتائے جاتے ہیں اور اگر وہ موجب نجات ہو تو اس کے فضائل، اہمیت اور حاصل کرنے کا طریقہ کار سکھایا جاتا ہے اور اگر ہلاکت کے باعث اعمال ہوں تو اس کی مذمت، نقصانات اور بچنے کی مختلف صورتیں ذکر کی جاتی ہیں۔[1]

تصوف کی کتابوں میں درج ہونے والے مباحث کی دوسری قسم "انتظامی مباحث" کی ہے، اس میں ہر کتاب کے لکھنے والے مصنف،، اس کے مقاصد واہداف، ماحول وزمانے اور مخاطب کے لحاظ سے خاصا تفاوت ہو جاتا ہے لیکن عام طور پر اس میں درج ذیل مباحث ذکر کئے جاتے ہیں:

---

[1] اس سلسلے میں دیگر کتابوں کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر امام غزالی رحمہ اللہ کی درجِ ذیل چار اہم کتابوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، تفصیلات جاننے کے لئے ان اصل مصادر کی طرف مراجعت کی جائے۔

وہ چار کتابیں یہ ہیں: احیاء علوم الدین۔ الاربعین فی اصول الدین۔ کیمیائے سعادت اور المرشد الامین جو احیاء العلوم کی تلخیص کے مانند ہے۔

ا: اصلاح باطن کی مختلف صورتیں اور ان کے اسباب وذرائع، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ذکر، اس کی اہمیت، فضائل اور طریقہ کار۔ ریاضات ومجاہدات کی مختلف شکلیں۔ اصلاح باطن کی راہ میں معاون دیگر چیزیں۔

۲: اصلاح باطن کی راہ میں موانع ورکاوٹیں۔ شیطان کے مختلف طریقہ واردات اوران سے بچاؤ کی تدبیریں۔

۳: مرید اور مرشد سے متعلق مباحث: مثلاً شیخ ومرشد بننے کی لیاقت کس میں ہے؟ مرشد میں کن صفات ہوناضروری ہے؟ مرشد کا طریقہ انتخاب کیاہے؟ مرشد کے آداب وحقوق کیاہیں اور کن باتوں میں اس کی اطاعت ضروری ہے؟ مرشد کے ذمہ مرید کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں؟ بیعت کا طریقہ کار اور حکم کیاہے؟

۴: روحانی ترقی کے مختلف مدارج ومنازل، سلوک کے مختلف مقامات اور ان میں ترقی کرنے کے طریقے۔

۵: سلوک وتصوف کی راہ میں پیش آنے والے مختلف احوال: مثلاً کشف وکرامات۔ شطحیات۔ وجد وتواجد اور قبض وبسط وغیرہ احوال ومصطلحات اور ان کی تشریح وتوضیح۔

علم تصوف کی مشروعیت

علم تصوف ایک مشروع دینی علم ہے اس کی مشروعیت بلکہ ترغیب واہمیت شریعت کے چاروں اساسی دلائل یعنی کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ، اجماع امت اور قیاس سے مستفاد ہوتی ہے۔

قرآن وسنت اور تصوف

اس کی تھوڑی سے تفصیل یہ ہے کہ تصوف میں اچھے اخلاق اور ان کو حاصل کرنے کے طریقے، برے اخلاق اور اس سے جان بچا کر رہنے کی تدبیریں بتلائی جاتی ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم یعنی اچھے اخلاق کا حاصل کرنا شرعاً مطلوب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں، قرآن وسنت کے بلا مبالغہ سینکڑوں نصوص اس پر دلالت کرتے ہیں اور دوسری قسم یعنی برے اخلاق سے اپنے آپ کو بچانا بھی شرعاً مطلوب ہے۔ اب قرآن وسنت میں میں اچھے یا برے اخلاق کے متعلق اجمالی طور پر یا ان میں سے کسی خاص صفت وخلق کے بارے میں تفصیلی طور پر جو کچھ نصوص وارد ہوئے ہیں، وہ سب نصوص ضمناً تصوف کی مشروعیت ہی نہیں بلکہ اس کی اہمیت، فضیلت اور مستحسن ہونے پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ اخلاق حسنہ حاصل کرنے اور مذموم اخلاق سے بچنے کی مختلف راستوں میں سے ایک اہم اور بنیادی شاہراہ یہ علم تصوف ہے۔

اجماع اور تصوف

درج ذیل دو باتوں پر پوری امت کا اجماع واتفاق ہے:

الف: قرآن وسنت میں جن اخلاق حسنہ کی ترغیب وتلقین کی گئی ہے، ان کا حاصل کرنا مطلوب، محمود اور کارِ ثواب ہے، اسی طرح جن مذموم صفات واخلاق سے ممانعت وارد ہوئی ہے، ان سے بچنا اور اپنے باطن کو ان کی کدروتوں سے پاک وصاف رکھنا محمود ومستحسن ہے۔

ب:اخلاق حسنہ کے حاصل کرنے اور اخلاق رذیلہ سے بچنے کے لئے جو بھی راستہ اختیار کیا جائے، وہ جائز ہے جبکہ نصوص میں صراحۃً اس کی ممانعت نہ کی گئی ہو اور شریعت کے عام قواعد کے بھی وہ مخالف نہ ہو، جبکہ اصل تصوف ان دونوں قیودات پر پورا پورا اترتا ہے۔

ان دونوں باتوں پر اتفاق سے علم تصوف کی مشروعیت پر بھی اتفاق ہو گیا کیونکہ اس فن کی حقیقت یہی ہے چنانچہ تعریف و تعارف کے وقت اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کے زمانے سے لیکر آج تک ہر دور میں کچھ ایسے حضرات رہے ہیں جن کی زندگی کا بڑا مقصد یہی تھا کہ اپنی اور دیگر افراد کی باطنی اصلاح کریں اور دیگر اعضاء و جوارح کی طرح دل کو بھی شریعت کے زیر نگین کریں۔ آج کے دور کے اور ان سابقہ ادوار کے طریقہ کار میں زمانے، ماحول اور مخاطب لوگ وغیرہ عناصر کی وجہ سے کچھ فروق اگرچہ موجود ہیں لیکن فی الجملہ ذکر وریاضت وغیرہ تدابیر ہمیشہ اس کام کے لئے استعمال ہوتے رہے اور امت کے فقہاء و محدثین کے ہاں ان جیسے لوگوں کی بڑی قدر واہمیت تھی، ان کی اس خدمت کو ہر زمانے کے معتمد اہلِ علم صرف مشروع ہی نہیں بلکہ مطلوب و محمود کام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، جس کو اصولی زبان میں "اجماع عملی" سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

قیاس اور تصوف

ہمارے سامنے دینی علوم وفنون کا جو ضخیم ذخیرہ موجود ہے، دور نبوت میں اس کا کوئی وجود نہیں تھا، علوم وفنون کی یہ معاصر شکلیں اور متعلقہ اصطلاحات وترتیب کا شاید اس وقت تصور بھی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود بھی ان کو دینی علوم وفنون ہی

کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے اور دین واسلام ہی کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے۔ کیونکہ جن مسائل سے ان علوم میں بحث ہوتی ہے اور جن مقاصد واہداف کو حاصل کرنے کے لئے یہ علوم ایجاد ہوئے ہیں، ان کا دین اسلام کے ساتھ تعلق مسلم ہے اور کسی علم وفن کو دینی علم قرار دینے کے لئے اتنی بات کافی ہے، فنون کی با قاعدہ تدوین، ترتیب اور اصطلاحات وغیرہ چیزیں تو زمانے کے ارتقاء اور ماحول ومعاشرے کی ضرورت کے لحاظ سے وجود میں آتی ہیں۔

یہی حال علم تصوف کا بھی ہے کہ جن مسائل ومباحث سے اس فن میں بحث کی جاتی ہے اور جن مقاصد کو حاصل کرنے کی اس میں تدابیر وذرائع بیان کئے جاتے ہیں، وہ یقیناً شریعت مطہرہ میں مطلوب ومحمود ہیں بلکہ اس کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو شرعاً ہر مسلمان پر لازم ہے، لہٰذا دیگر تمام علوم وفنون کی طرح یہ بھی باقاعدہ ایک دینی وشرعی علم ہے بلکہ دینی علوم میں سے اہم ترین علم کی حیثیت رکھتا ہے اگرچہ موجودہ ترتیب اور رائج اصطلاحات دورِ سلف میں مروج نہ تھیں۔

علم تصوف کا شرعی حکم

ا: علم تصوف کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔ کسی علم کے فرض کفایہ ہونے کا معیار یہی ہے کہ اس پر کوئی شرعی ضروری حکم موقوف ہو اور یہ معیار یہاں بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ بہت سے باطنی اخلاق وصفات ایسی ہیں جو شرعاً ضروری ہیں اور ان کی تکمیل واتمام کسی نہ کسی درجے میں اس علم پر موقوف ہے۔

۲: جہاں تک عملی طور پر اس علم سے وابستگی کا حکم ہے تو اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ علم تصوف بذات خود مقصود نہیں ہے بلکہ کچھ مقاصد کے حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے اور وسائل کا حکم یہی ہوتا ہے کہ:

الف: اگر مقاصد کا حصول کسی وسیلے پر موقوف ہو جائے تو ایسی صورت میں جو حکم مقاصد کا ہو گا، وہی حکم اس خاص وسیلے کا بھی ہو گا جس پر مقصود موقوف ہے، اگر مقصود واجب ہو تو وسیلہ بھی واجب ہو گا اور اگر مقصود مستحب یا مباح ہو تو وسیلے کا بھی یہی حکم ہو گا۔

ب: اور اگر مقصود حاصل کرنے کے دیگر ذرائع بھی ہوں تو ایسی صورت میں کسی خاص ذریعے کو ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اصل مقصود اگر ضروری یا مندوب ہو تو اسی کے حصول کو ضروری یا مندوب کے درجہ میں رکھا جائے گا، جہاں تک اس تک پہنچنے کے وسائل کا تعلق ہے تو ان کو مجموعی طور پر مقصود کی نوعیت کے مطابق واجب یا مندوب قرار دیا جائے گا لیکن کسی خاص وسیلے کو ضروری سمجھنا درست نہیں ہو گا۔ البتہ اگر کسی خاص صورت میں مقصود کی تحصیل کسی خاص وسیلے پر موقوف ہو جائے اور دیگر وسائل سے وہ ضروری مقصود حاصل نہ ہو سکے تو اس خاص واقعے کی حد تک اس وسیلے کو ضروری قرار دیا جائے گا۔

ج: اس تفصیل کے تناظر میں غور کیا جائے تو علم تصوف کا بڑا اور بنیادی مقصود قلب کی اصلاح اور نفس کا تزکیہ و تطہیر ہے، پھر اس اصلاح و تزکیے کی ایک حد وہ ہے جو شرعاً ضروری ہے اور بعض درجات وہ ہیں جو شرعاً لازم تو نہیں ہے البتہ ندب واستحباب کی حد تک مطلوب ہیں۔

ر: علم تصوف کا یہاں یہ جو مقصود بتایا گیا ہے یعنیٰ اصلاح نفس، اس کا حاصل کرنا تصوف کے ظاہری اعمال واشغال ہی پر عقلاً موقوف نہیں ہے بلکہ بعض دیگر ذرائع سے بھی اس مقصود کو حاصل کرنا ممکن ہے، مثلاً اصلاح نفس کے باوصف لوگوں کی صحبت، ریاضت اور مجاہدہ وغیرہ۔ البتہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ تصوف کی شاہرہ معرفت پر چل کر ہی اصلاح نفس کی منزل تک رسائی ہو جاتی ہے، دیگر راستوں سے یہاں تک رسائی گو ممکن بلکہ واقع ہے لیکن بہت کم۔

د: اس تفصیل کے تناظر میں غور کیا جائے تو تصوف کا راستہ اختیار کرنے کا حکم واضح ہو جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ اس پر چلنا مستحب اور مندوب تو بہر حال ہے، البتہ واجب ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں اصلاح نفس کا ضروری درجہ حاصل کرنا اس پر موقوف ہو جائے وہاں اس کو ضروری قرار دیا جائے گا اور جہاں ایسا نہ ہو کہ مثلاً یا تو اصلاح کا کوئی بھی درجہ اس پر موقوف نہ ہو یا صرف مستحب درجات کی تحصیل اس پر موقوف ہو جائے، وہاں خاص طور پر اس راستہ کو اپنانا شرعاً واجب نہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اصلاح کا کونسا درجہ واجب ہے اور کونسا مستحب؟ اور ان مختلف درجات کو کیونکر اور کن طریقوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے؟ ان جیسی دقیق اور غامض باتوں کا فیصلہ وہی افراد کرسکتے ہیں جو دینی علم کے بھی شناور ہوں اور خود اصلاح کے درجات سے عملی طور پر بھی بہرہ ور ہوں۔ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی مفقود ہو جائے تو ایسے شخص کے لئے ایسا فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے۔

علامہ محمد ساجقلی زادہ رحمہ اللہ "علم اخلاق" اور اس کے ضمن "علم تصوف" کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اعلم أن بعض علم الأخلاق فرض عين، وكلها فرض كفاية، ما عدا علم التصوف، فليس بفرض عين، وهو ظاهر، ولا فرض كفاية، إذ لا يجب شيء من أحوال المتصوفين على أحد في حال ما، بل هي مستحبة، وفائدة الاطلاع على أحوال المتصوفين، لمن لم يرد الاقتداء بهم، معرفة تقصيره في السلوك.[١]

ترجمہ:"جان لو کہ علمِ اخلاق کا بعض حصہ فرض عین ہے،اور علمِ تصوف کے علاوہ پورا علمِ اخلاق فرضِ کفایہ ہے،علمِ تصوف نہ فرض عین ہے نہ فرضِ کفایہ،اور یہ بات ظاہر ہے،کیوں کہ صوفیاءکرام کے احوال کسی پر واجب نہیں،بلکہ مستحب ہے،اور جس کا صوفیاءکرام کی اقتداءکاارادہ نہ ہواس کو ان کے احوال پر مطلع ہونے کافائدہ یہ ہو گا کہ اسے علمِ تصوف میں اپنی کوتاہی کاادراک ہو جائے گا"۔

درج بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ حکم تمام صورتوں کا نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں تصوف کا یہی حکم ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں اس کا حکم تبدیل ہو سکتا ہے جس کی تفصیل اوپر درج کی گئی ہے۔

علامہ عبد اللہ بن الصدیق الغماری رحمہ اللہ اپنے والد ماجد کا فتویٰ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[١] ترتيب العلوم للمرعشي،الفصل الثامن،في حكم علم الأخلاق،ص: ١٧٠.

"مَن أخلّ بمقام الإحسان الّذي هو الطّريقة فدينه ناقص بلا شكّ لتركه ركنا مِن أركانه، ولهذا نصّ المحقّقون على وجوب الدّخول في الطّريقة وسلوك طريق التصوّف وجوبا عينيّا واستدلّوا على الوجوب بما هو ظاهر عقلا ونقلا."[1]

ترجمہ:"جس نے مقامِ احسان کے حصول میں کوتاہی کی جو کہ طریقت ہے اس کے دین میں نقص ہو گا،اس لئے کہ اس نے دین کے ارکان میں سے ایک رکن کو چھوڑا،یہی وجہ ہے کہ محققین حضرات نے طریقت میں داخل ہونے اور تصوف کے راستے پر چلنے پر وجوب کی تصریح فرمائی ہیں،اوراس کے وجوب پر عقلی اور نقلی واضح دلائل سے استدلال فرمایاہے"۔

اور خود ہی اسی موضوع پر اپنے ایک دوسرے رسالے میں لکھتے ہیں:

سلوك طريق التصوّف واجب متحتّم لا يكمل دين المرء إلّا به.[2]

ترجمہ:"تصوف کے راستے پر چلناواجب اور لازم ہے،اس کے بغیر انسان کادین کامل نہیں ہوتا"۔

علم تصوف اور دیگر علوم

دین اسلام سے متعلق تمام علوم وفنون کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور کسی بھی علم وفن کی اہمیت کا انکار کرنا دانشمندی نہیں ہے چاہے وہ علوم آلیہ ہوں یا علوم عالیہ اور مقصودہ ہوں۔ لیکن تمام چیزوں کی طرح علوم وفنون بھی اہمیت وفضیلت

[1] الإعلام بأنّ التصوّف من شريعة الإسلام،ص١٢.

[2] حسن التلطّف في بيان وجوب سلوك التصوف،ص١٠.

میں مساوی نہیں ہیں بلکہ اس لحاظ سے ان میں تفاوت پایا جاتا ہے۔اب علوم وفنون کی گلشن نما کہکشاں میں کس علم و فن کی فضیلت واہمیت زیادہ ہے؟ اوراس کا معیار ومیزان کیا ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ علوم کی باہمی فضیلت کے مختلف اسباب ہیں جن میں سے اہم اسباب کا تعلق علم کے موضوع، مقاصد واہداف اور اس کی افادیت کے دائرہ کار کے ساتھ ہے، چنانچہ جس علم کا موضوع جس قدر شرافت اور اہمیت والا ہو گا، اتنا ہی اس علم کی بھی اہمیت وشرافت زیادہ ہو گی، یوں ہی جس قدر کسی کے مقاصد واہداف بلند تر ہوں گے ،اسی قدر اس علم کا مقام ومرتبہ بھی دیگر فنون کی بنسبت زیادہ ہو گا، اسی طرح کسی علم کی فضیلت وبرتری کا ایک چوتھا سبب یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو کس حد تک اس کی ضرورت ہے؟

اس معیار کے واضح ہو جانے کے بعد جب ہم تصوف کا جائزہ لیتے ہیں تو صاف واضح ہوتا ہے کہ دیگر بہت سے علوم وفنون کی بنسبت اس کی اہمیت وفوقیت کہیں زیادہ ہے، چنانچہ اس کا موضوع دل اور اس کے اندر نشوو نما پانے والے صفات واخلاق ہیں جبکہ نصوص میں دل اوراس کے صفات واخلاق کی خوب خوب اہمیت وارد ہوئی ہیں اور نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ قلب کی صلاح وفساد تمام جسم کے صلاح وفساد کا ذریعہ بن جاتا ہے،

لہٰذا موضوع کی اہمیت اور شرافت کی وجہ سے اصل علم میں بھی فوقیت پیدا ہو جائے گی۔

مقاصد واہداف کے لحاظ سے بھی یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کیونکہ اس علم کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ دل کو مذموم صفات واخلاق سے پاک وصاف کرکے اخلاق

حسنہ سے مزین کیا جائے اور دل کو ہر ماسوی اللہ سے فارغ کر کے خاص اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت کو اس میں سمو دیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑی دولت اور انسانی زندگی کی اہم اور بنیادی مقصد ہے جس پر اگر خاتمہ نصیب ہو جائے تو زہے قسمت۔ اس سے افادیت کے لحاظ سے شرافت و فوقیت بھی معلوم ہو گئی کہ اس فن سے متعدد فرائض کی تکمیل ہوتی ہے اور کئی محرمات سے بچنے کی توفیق میسر ہوتی ہے۔

جہاں تک چوتھا سبب ہے یعنیٰ مسلمانوں کے احتیاج و ضرورت کے لحاظ سے کسی علم و فن کو فوقیت کا حاصل ہونا۔ تو زیر بحث علم اس لحاظ سے بھی دیگر فنون کی بنسبت بڑی فوقیت اور اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اخلاق و صفات کی درستگی کی ضرورت ہر مسلمان کو پیش آتی ہے اور تمام ہی مسلمان اس بات کے مکلف ہیں کہ دل کو کبر و عجب اور ناجائز حد تک حرص و ریاء کی خرابی سے پاک و صاف رکھیں، اس کو تواضع وغیرہ صفات حسنہ سے مزین و آراستہ کریں۔ حاصل یہ ہے کہ ضرورت بھی تقریباً ہر مسلمان کی ہے اور وہ بھی کسی مندوب و مستحسن کام کی تکمیل میں نہیں بلکہ ایک فرض و واجب کی تکمیل میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ علوم و فنون کے باہمی تفاضل کا عمومی معیار درج ذیل چار چیزیں ہیں:

الف: موضوع شرافت و اہمیت کا حامل ہو۔

ب: مقاصد و اہداف اہم تر ہوں۔

ج: افادیت زیادہ ہو۔

د: اس کی طرف مسلمان کی ضرورت زیادہ پیش آتی ہو۔

ان چاروں اسباب کے اعتبار سے علم تصوف دیگر اکثر علوم وفنون سے زیادہ اہم، افضل اور فائق تر علم ثابت ہو جاتا ہے۔

فلاسفہ کا علم الاخلاق اور علم تصوف

فلاسفہ یونان کے یہاں جو مختلف علوم وفنون رائج تھے، ان میں سے ایک اہم علم "علم الاخلاق" بھی تھا، یہ اس دور کے اہم اور مفید علوم میں سے شمار ہوتا تھا۔ ارسطو اور بعد میں ابن سیناء وغیرہ فلاسفہ نے اس پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ علم الاخلاق اور علم تصوف کا آپس میں غیر معمولی ربط ومشابہت ہے، چنانچہ دونوں علوم میں اخلاق اور باطنی صفات سے بحث ہوتی ہے کہ اچھے اخلاق کون کونسے ہیں اور برے کونسے؟ اچھے اخلاق کے حاصل کرنے اور برے اخلاق سے چھٹکارا پانے کا طریقہ کار کیا ہو گا؟ اس غیر معمولی مشابہت کی وجہ سے بسا اوقات ان دونوں عناوین کو مترادف الفاظ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام باتوں میں ظاہری مشابہت کے باوجود دونوں میں فرق بھی بہت ہے چنانچہ اخلاق کے اچھے برے ہونے کا معیار کیا ہے؟ کونسا خُلق کس حد تک بھلی اور کہاں بُری شمار کی جائے گی؟ مکارم اخلاق حاصل کرنے کا طریقہ کار کیا ہو گا؟ بااخلاق بننے کی غرض وغایت کیا ہے؟ ان جیسے اہم اور اساسی نکات میں دونوں علوم کی راہیں جدا جدا ہیں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فلاسفہ کا علم الاخلاق مذہب کی رہنمائی سے محروم ہے، اس لئے وہاں سب کچھ عقل وتجربے ہی

کی روشنی میں طے پاتے ہیں جبکہ علم تصوف میں ان جیسے تمام ضروری باتوں کا سرچشمہ وحی ومذہب کے پاک ستھرے تعلیمات ہیں۔

علم تصوف کی فضیلت

یہ ضروری نہیں کہ قرآن وحدیث میں کسی چیز کا نام لیکر اس کی فضیلت بیان کی گئی ہو تبھی کسی چیز کو باعثِ فضیلت قرار دیاجائے گا بلکہ نام وعنوان کا اعتبار نہیں ہوتا، مقاصد واہداف اور طریقہ کار کا لحاظ رکھاجاتا ہے، خصوصاً علوم وفنون کے متعلق تو یہ بات بالکل بدیہی ہے کیونکہ آج جو یہ فنون مستقل صورت میں مختلف اصطلاحات کے ساتھ مدون ہیں، دورِ نبوت میں ایسا بالکل نہ تھا تو خاص نام لے کر کسی فن کے بارے میں فضیلت وارد ہونے کی توقع غلط اور بے جا ہے۔

تصوف کا جو تعارف ماقبل سطور میں ذکر کیا گیاہے،اس کے اعتبار سے غور کیا جائے تو اس راہ پر چلنے کے مختلف فضائل ہیں جن کو درجِ ذیل نکات کے اندر سمویا جاسکتاہے:

۱: جن اعمال واشغال میں سالک مصروف ہوتا ہے،ان کے متعلقہ فضائل اس کو حاصل ہوں گے،مثلاً ذکر وفکر، نفل عبادات کا اہتمام وغیرہ۔

۲: تصوف چونکہ مجاہدہ نفس سے عبارت ہے ،اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضاء اور اس کا قرب حاصل کرنا ہے، اس لئے اس مجاہدہ کے فضائل بھی حاصل ہوں گے۔

۳: تصوف کا مقصود چونکہ نیک اور مطلوب اخلاق کا حاصل کرنا ہے اور برے ومذموم اخلاق وعادات سے چھٹکارا پانا ہے ، اس لئے اخلاق کے متعلق جو بیش بہا

فضائل نصوص میں مذکور ہیں، تصوف و سلوک کا عملی شغل رکھنے والا شخص ان شاء اللہ اس کا اپنے کردار کے مطابق مستحق ہو گا۔

علم تصوف کا غرض اور اس کے فوائد و ثمرات

کام کرتے وقت جس چیز کو مقصود بنایا جائے وہ اس کام کا غرض کہلاتا ہے اور جو چیزیں مقصود کے درجہ میں تو نہ ہوں لیکن کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی حاصل ہو جائیں، ان کو "فوائد و ثمرات" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اب تصوف کا اصل غرض "مرتبہ احسان" حاصل کرنا ہے جس کا ذکر حدیث جبرئیل میں کیا گیا ہے اور اس کے پیدا کرنے کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب حاصل کرنا ہے۔ اور جہاں تک اس کے "فوائد و ثمرات" کا سوال ہے تو وہ بہت ہیں، جن میں سے چند ایک کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

۱: ذکر و فکر پر مداومت کی توفیق عموماً اسی عملی سلوک و تصوف سے مل جاتی ہے۔

۲: تمام دینی اعمال واشغال میں استقامت، حلاوت اور پختگی نصیب ہوتی ہے کیونکہ دل کے نہاں خانوں میں جب ذکر راسخ ہو جاتا ہے تو اس سے اخلاص و احسان کے مختلف درجات حاصل ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ذات وصفات کا استحضار نصیب ہوتا ہے اور یہی وہ عظیم نعمت ہے جس کے بعد تمام اعمال بڑی سہولت بلکہ قلبی تقاضا اور دلی خواہش و مٹھاس کے ساتھ ادا ہو جاتے ہیں۔

۳: دین اور دینی اعمال واحکام پر شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ایسا مقام حاصل ہو جاتا ہے جس میں شریعت طبیعت بن جاتی ہے۔

۴: دل سے متعلق تمام شرعی احکام پر عمل کرنے کی سعادت مل جاتی ہے، چنانچہ نیک اخلاق حاصل ہو جاتے ہیں اور برے اخلاق سے نجات حاصل ہو جاتی ہے، دل سے غفلت، دوری اور گناہوں کے پردے چھٹ جاتے ہیں۔

۵: فرد کی زندگی میں بھی اطمینان آجاتا ہے کیونکہ ایک تو ذکر کی پابندی ہوتی ہے جو حصول اطمینان کے لئے نسخہ اکسیر کی حیثیت رکھتا ہے اور ساتھ دل کی دنیا آباد و سرشار ہوتی ہے، اور ماحول و معاشرہ بھی بڑی حد تک سکون و امن کا گہوارہ بن جاتا ہے، جس کا مشاہدہ باقاعدہ خانقاہی زندگی میں کیا جاسکتا ہے۔

٦: عیب بینی اور نقد کی آنکھ اپنے ہی عیوب پر ٹکی رہتی ہے اور مذمت و ملامت کی سوئی اپنے ہی نفس پر مسلط رہتی ہے اور وہی چبھتی ہے۔

٧: مادیت پرستی کے موجودہ عالمگیر فتنے کا اسی راستے سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے جب دل منور، پر اطمینان اور پُر کیف ہو اور دل کی محنت یہی تصوف و سلوک ہے۔ قرآن کریم میں اصحاب کہف کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

{ وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهِ إِلَٰهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا }.[١]

ترجمہ: "اور گرہ دی ان کے دل پر جب کھڑے ہوئے پھر بولے ہمارا رب ہے رب آسمان کا اور زمین کا، نہ پکاریں گے ہم اس کے سوائے کسی کو معبود، نہیں تو کہی ہم نے بات عقل سے دور"۔

---

[١] سورة الكهف، رقم الاية: ١٤.

۸: قرآن کریم میں قلب سلیم کو مدار نجات قرار دیا گیا ہے، کامل معنیٰ میں قلب سلیم اسی راہ سلوک کے طے کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

تصوف اور اصلاح اخلاق کے دیگر ذرائع

تصوف کی اہمیت اور حکم بتاتے ہوئے یہاں مکرر اصرار کیا جارہا ہے کہ اس سے نفس کی اصلاح و تہذیب اور اخلاق کی درستگی و عمدگی مطلوب ہے۔ اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ کیا اس غرض کی تکمیل کے اور ذرائع اور وسائل بھی ہیں؟ اور ابھی کچھ راستے ہیں جن پر چل کر اصلاح اخلاق کا مقصود حاصل کیا جاسکتا ہے یا صرف تصوف کی راہ چلنے سے ہی اس ہدف تک رسائی ممکن ہے؟ اگر اور ذرائع بھی ہیں تو ان کو اختیار کرنے کی تبلیغ و تلقین کیوں نہیں کی جاتی اور کیوں نہ مروج و مصطلح تصوف کو چھوڑ کر ان راستوں پر چلا جاتا ہے نہ چلایا جاتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یوں تو اصولاً تو تصوف اسی سے عبارت ہے کہ اصلاح اخلاق کے طرق پر چل کر تہذیب نفس اور تزکیہ قلب تک پہنچا جائے، اس منزل تک پہنچنے کے لئے جو بھی وسائل اختیار کئے جاتے ہیں، وہ سب تصوف ہی کے ضمن میں داخل ہے جبکہ سوال کا منشا بظاہر یہی جھلک کر دکھائی دیتا ہے کہ تصوف چند مخصوص اعمال واشغال سے عبارت ہے جن کے بغیر تصوف کا تحقق نہیں ہو سکتا۔

البتہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اصلاح اخلاق کے لئے تصوف کے عام دستور میں بندھنا فی نفسہ ایسا ضروری نہیں ہے جس کے بغیر اصلاح کا تحقق یا تصور ہی نہ ہو سکتا ہو بلکہ دیگر وسائل سے بھی اس اس کو پورا کیا جانا ممکن ہے۔ وہ دیگر

اسباب وذرائع کون کونسے ہیں؟ تو باب دوم میں اس کی پوری تفصیل مذکور ہے، وہاں اس حوالہ سے مختلف اہل علم و فضل اور واقف کار حضرات کے تجربات کی روشنی کچھ اسباب واسالیب ذکر کئے گئے ہیں، ان کے ساتھ ساتھ درج ذیل ذرائع سے بھی اس کو پانا ممکن ہے:

الف: اپنے طور پر ذکر و شغل رکھنا۔ نصوص میں جن اعمال واشغال کا ذکر کیا گیا ہے یا اصلاح نفس کی کتابوں میں جو کچھ تراکیب ذکر ہوتے ہیں، انسان ان کو بجالانے کی کوشش کرتا رہے۔

ب: ریاضات و مجاہدات۔ خواہشات اور نفس کے غیر ضروری تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے، اس طرح مجاہدہ وریاضت کرکے نفس کی قوت کو توڑنے یا کم کرنے کی کوشش کرتا رہے، اس کے بعد نفس قابو میں آجائے گا اور آسانی وسہولت کے ساتھ ہر جگہ شرعی حکم کا تابع فرمان بن جائے گا۔

ج: صحبتِ اہل کمال۔ باکمال لوگوں کی صحبت ایسا نسخہ اکسیر ہے کہ اگر استعداد و قابلیت ہو تو اس سے بھی ہزاروں لوگوں کی دنیا بدل جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ:

نگاہِ ولی میں وہ تاثیر دیکھی بدلتی ہزاروں کی تقدیر دیکھی

د: مراقبہ و محاسبہ۔ ہر اہم اقدام و عمل سے پہلے اس کو شریعت کے مطابق کرنے کا عزم کرنا اور پھر بعد میں کسی وقت تمام کئے ہوئے کاموں کا جائزہ اور شریعت کے ترازو پر سب چیزوں کو تول کر دیکھنا۔ جہاں کوئی خامی یا کمزوری محسوس ہو جائے، اس پر ایک طرف تو توبہ واستغفار کا اہتمام کیا جائے اور ساتھ آئندہ

کے لئے اس کے اصلاح کا عزم وہمت کر لیا جائے۔اس کے لئے اگر ڈائری کا اہتمام کیا جائے تو مزید سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

س:اتباع سنت کا اہتمام حضور نبی اکرم ﷺ کے صفات واخلاق، آپ ﷺ کے اعمال واقوال، غرض آپ ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو سمجھ کر سامنے رکھا جائے اور پھر اس کے مطابق چلنے کا اہتمام کرے اور چلتا رہے۔

یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن پر اگر پوری سنجیدگی، فکر مندی اور ہمیشگی کے ساتھ چلا جائے تو بعید نہیں ہے کہ اصلاحِ نفس کی منزل تک رسائی ہو جائے۔ لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ اصلاح نفس، صفائی دل اور بلندی اخلاق ایسی منزلیں ہیں جہاں تک دوسرے کے سہارا لئے بغیر محض اپنے ہی ذوق وشوق سے سلامتی کے ساتھ رسائی نہیں ہوتی۔ ان منزلوں تک پہنچنے سے پہلے متعدد ایسے دشوار گزار اور بے آب گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے جہاں اگر انسان اکیلا اور بے سہارا ہو تو عموماً غلطی کا شکار ہو کر دوسری راہ پر چلنے لگ جاتا ہے جس سے پہلے کی بنسبت دوہرا بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ نقصان ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ نرے خدشات نہیں ہیں بلکہ ہزاروں ماہرین کے آزمودہ تجربات ہیں۔

خود اس ناکارہ کا یہ حال ہے کہ عقل وشعور کے زمانے سے بھی پہلے تصوف وسلوک کی کتابوں سے دلچسپی اور محبت تھی اور اب تک ایک طویل زمانہ ان کتابوں کے پڑھنے سمجھنے میں گزرا اور پڑھا بھی بظاہر عمل ہی کے جذبے سے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم ومعلومات سے ہٹ کر عمل کی دنیا میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی اور اگر کچھ تغیر حاصل بھی ہوا تو بھی پائیدار ثابت نہیں

ہوا، بلکہ یہ سیاہ کار جس طرح پہلے سیارہ کار تھا،ویسا ہی اس قدر کثیر مطالعہ کرنے کے بعد بھی رہا۔ تصوف سے تھوڑی بہت وابستگی سے اپنی درماندگی، کمزوری کا احساس ہوا اور پایا تو کچھ نہیں لیکن راہِ منزل اور نشانِ منزل بالکل صاف ستھرے شکل میں سامنے دکھائی دیا۔

اگر غور وفکر کے ساتھ تصوف وسلوک کے عملی میدان کو دیکھا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ تصوف خود کوئی الگ چیز ہے ہی نہیں بلکہ اصلاح وہدایت کے جو طریقے پہلی تفصیل میں لکھے گئے، انہی میں سے بعض تراکیب کو اختیار کرنا کا ایک خاص منظم اسلوب ہے جس کا ہزاروں بار کامیاب تجربہ ہوچکا ہے۔

ہندوستان کے ایک عالم دین کی کارگزاری

ہندوستان کے مشہور ومستند عالمِ دین حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ پہلے پہل تو تصوف کی اہمیت وافادیت بلکہ اس کے جائز ہونے میں بھی متردد تھے، حضرت مولانا عبد القادر رائپوری رحمہ اللہ کے ساتھ کچھ سوال وجواب کرنے کے بعد جب تصوف کی اہمیت آپ کے لئے واضح ہوگئی اور حضرت کے اس ملفوظ پر تسلی ہوگئی کہ تصوف اعمال میں اخلاص اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ عشق ومحبت پیدا ہونے کا ذریعہ ہے تو عملی طور پر بھی اس کے ساتھ وابستگی اختیار فرمائی۔ اس کے بعد ان کا جو کچھ حال ہوا، وہ انہی کے متواضعانہ الفاظ میں یہ ہے:

"یہ عاجز بلا کسی انکسار کے عرض کرتا ہے کہ اپنی کم ہمّتی اور لااُبالی پن اور کچھ خاص حالات کی وجہ سے چوں کہ میں اس سلسلہ کے تجربہ کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکا، اس لیے خود تو اِن کیفیات سے خالی اور محروم ہی ہوں، لیکن جو تھوڑی سی اور برائے

نام توجہ کی جا سکی اور اس راہ کے بعض اکابرین کی خدمت میں کبھی کبھی حاضری کی جو توفیق اس سلسلے میں ملتی رہی، اسی سے الحمدللہ یہ یقین اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ تصوف اور اس کے اعمال واشغال کی غرض وغایت اور ان کی حقیقت کے متعلق ان بزرگ نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ صحیح ہے۔

اور دل ودماغ نے یہ بھی مان لیا کہ تصوف کے زریعہ جن قلبی کیفیات اور ملکات کی تحصیل کی کوشش کی جاتی ہے، دین کی تکمیل اور ایمانی حلاوت کا حصول ان پر موقوف ہے۔

اس کا بھی یقین حاصل ہوا کہ تصوف ایمان واسلام کی تکمیل کے علاوہ ایک خاص قسم کی روح اور طاقت پیدا کرنے کا بھی زریعہ ہے۔ اور اگر صلاحیت اور طبیعت کو مناسبت ہو تو یقین اور اعتماد، ہمت وعزمت، صبر وتوکل اور ماسوا اللہ سے بے خوفی جیسے اوصاف (جو طاقت کا سرچشمہ ہیں) تصوف کے زریعے ان کو پیدا کیا جا سکتا ہے اور اُبھارا جا سکتا ہے۔

اسی لیے تصوف کو اپنانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کا سب سے بڑا حق میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کو ہے جو بے دینی کی اس دنیا میں انبیا علیہم السلام کے طرز اور طریقے پر کسی بڑی اصلاحی تبدیلی کے لیے مصروفِ جدوجہد ہوں، اور مادہ پرستی کی فضا کو خدا پرستی کی فضا سے بدلنا چاہتے ہیں۔۔۔تصوف اور اہلِ تصوف سے قریب ہونے کے بعد جن چند باتوں کا یقین حاصل ہوا، ان میں سے ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی پڑھا لکھا اور کیسا ہی ذہین فطین ہو، تصوف سے صحیح واقفیت حاصل کرنے اور اس کے مالہٗ وماعلیہ کو علی وجہ البصیرت جاننے کے لیے اس کو بھی اس کی ضرورت ہے کہ تصوف کی حامل کسی شخصیت کی صحبت اور خدمت میں اس کا کچھ وقت گزرے اور اس شعبے کا عملی تجربہ حاصل کرنے پر بھی وہ

زندگی کے کچھ دن صرف کرے، اس کے بغیر تصوف کو پوری طرح سمجھا اور جانا نہیں جا سکتا۔"[1]

کیا تصوف دین ہے؟

ابھی تک جو تفصیلات ذکر کی گئیں ،اس کے بعد اس عنوان کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور خود بخود اپنے آپ جواب واضح ہو جاتا ہے، لیکن تصوف کے خلاف ماحول میں سوال عموماً اٹھایا جاتا ہے، اس لئے اس کا ذکر کرنا فائد سے خالی نہیں ہو گا۔

کسی چیز کے دین ہونے نہ ہونے کا معیار

کسی چیز کے دین میں سے ہونے کا معیار کیا ہے؟ اور کب کسی چیز کو دین یا دین کا حصہ کہا جاسکتا ہے؟ اس بات کو معلوم کرنے کے لئے خود دین کا مفہوم و مصداق سمجھنا ضروری ہے، اس کے بعد اگر کوئی چیز دین کے مفہوم میں داخل ہو تو وہ دین کا حصہ شمار ہو گا اور اگر دین کی تعریف کسی چیز کو شامل نہ ہو تو اس کو دین کے تحت شامل کرنا بھی دین میں اپنی طرف سے اضافے کی ایک مذموم کوشش ہو گی جس کا شرعی حکم واضح ہے۔ دین کا تعارف کرتے ہوئے علامہ مرتضی زبیدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(و) الدِّينُ: (اسمٌ لمَا يُتَعَبَّدُ اللهُ عَزَّ وجلَّ بِهِ.(و) الدِّينُ: (المِلَّةُ) ؛ يقالُ اعْتِباراً بالطّاعَةِ والانْقِيادِ للشَّرِيعَةِ، قالَ اللهُ تعالَىٰ: {إنَّ الدِّينَ عنْدَ

[1] تصوف کیا ہے؟ مجموعہ مقالات، ص۲۷، مکتبۃ البشریٰ.

اللهَّ الإِسْلامُ} .وقالَ ابنُ الكَمالِ: الدِّيْنُ وَضْعٌ إلهيٌّ يَدْعو أَصْحابَ العُقُولِ إِلَى قُبولِ مَا هُوَ عَن الرَّسُولِ.وقالَ غيرُه: وَضْعٌ إلهيٌّ سائِقٌ لذَوِي العُقولِ باخْتِيارِهم المَحْمودِ إِلَى الخيْرِ بالذّات.[1]

ترجمہ:"اور دین اس اداکانام ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے،دین ملت کو بھی کہتے ہے اوراطاعت اور تابعداری کی وجہ سے شریعت کے لئے بھی بولا جاتاہے ،اللہ تعالیٰ کاارشادہے:{إِنَّ الدّيْنَ عِنْدَ اللهِّ الإِسْلامُ}بیشک دین جو ہے اللہ کے یہاں سو یہی مسلمانی حکمبرداری ہے۔ابن کمالؒ فرماتے ہے:دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ وضع کردہ قانون ہے جو عقل والوں کواس پیغام کے قبول کرنے کی دعوت دیتاہے جورسول(علیہ السلام)لے کر آیاہے۔اوردیگر علماء فرماتے ہیں:دین وہ قانون الٰہی ہے جوبالذات عقل والوں کوان کے اختیارکےساتھ خیر کی جانب ہانکتاہے"۔

علامہ ابوالبقاءکفوی تحریرفرماتے ہیں:

الدّين، بِالْكَسْرِ، فِي اللُّغَة: الْعَادة مُطلقًا، وَهُوَ أوسع مجالا، يُطلق علىٰ الْحق وَالْبَاطِل أَيْضا، ويشمل أُصُول الشَّرَائِع وفروعها، لِأَنَّهُ عبارَة عَن وضع آلهي سائق لِذَوي الْعُقُول باختيارهم الْمَحْمُود إِلَى الْخَيْر بِالذَّاتِ، قلبيا كَانَ أَو قالبيا، كالاعتقاد وَالْعلم وَالصَّلَاة.[2]

ترجمہ:"دین کسرہ کے ساتھ لغت میں عادت کوکہتے ہے،اس کادائرہ کاربہت وسیع ہے،اس کااطلاق حق اورباطل پر بھی ہوتاہے،اور یہ شامل ہے شرائع کے اصول

---

[1] تاج العروس :ج٣٥ص٥٦.

[2] الكليات،ص: ٤٤٣.

اور فروع کو، کیوں کہ یہ اس قانون الٰہی سے عبارت ہے جو بالذات عقل والوں کو ان کے اختیار کے ساتھ خیر کی طرف ہانکنے والا ہے، چاہے وہ خیر دل سے تعلق رکھے یا بدن سے جیسے عقیدہ، علم اور نماز"۔

تصوف کے دین ہونے کی وجوہات

اس معیار کے واضح ہو جانے کے بعد اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ تصوف وسلوک بھی دین کا حصہ بلکہ اہم تر حصہ ہے، کیونکہ:

الف: حدیث جبرئیل میں جن تین چیزوں پر دین کا اطلاق کیا گیا ہے، ان میں سے ایک "احسان" بھی ہے، جس کی دو صورتیں یا دو مراتب خود اسی حدیث میں منصوص ہیں، تصوف انہی مراتب کے حصول کا راستہ ہے۔

حدیثِ جبریل سے واضح ہو جاتا ہے کہ دین تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے:

۱: ایمانیات۔ اس کو علم کلام یا علم عقائد کہا جاتا ہے۔

۲: عبادات، یعنی نماز، روزہ، زکوۃ اور حج۔ اس کے عموم میں دین اسلام کے وہ تمام احکام ومسائل داخل ہیں جن کا تعلق انسان کے ظاہری اعضاء وجوارح کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی تفصیلات بیان کرنے کے لئے "علم فقہ" وجود میں آیا۔

۳: مرتبہ احسان واخلاص اوراس کے ضروری مبادی: اس کے لئے "علم تصوف"، "علم سلوک واحسان" وجود میں آیا اور تصوف کا بڑا مقصد انہی درجات کو حاصل کرنا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ تصوف ایک تہائی دین ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی یہ بات بالکل حقیقت ہے کہ:

والّذي نفسي بيده إنّ هذا الأمرَ الثّالثَ أدقُّ المقاصد الشّرعية مأخذا وأعمقها أصلا ونسبتُه إلىٰ جميع الشّرائع بمنزلة الرّوح للجسم أو المعنىٰ لِللفظ، وقدْ تحمّل الصّوفيةُ الأخيار هذا العبءَ علىٰ أكتافهم فاهتدوا وهدوا وانتفعوا ونفعوا النّاس وفازوا بحصول السّعادة العظمىٰ.[١]

ترجمہ: "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری روح ہے، بیشک مقاصد شریعت میں یہ تیسرا امر باریک ترین اور بہت زیادہ مشکل ہے ماخذ اور اصل کے اعتبار سے، اس کی نسبت پوری شریعت کی طرف ایسی ہے جیسا کہ روح کا جسم اور معنی کا لفظ کی طرف، صوفیاء کرام نے یہ بوجھ اپنے کندوں پر اٹھایاہیں، تو خود بھی ہدایت یافتہ ہوئے دوسروں کو بھی ہدایت دیں، خود بھی نفع پایا دوسروں کو بھی نفع پہنچایا اور بڑی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے"۔

ب: مقاصد تصوف نیک اخلاق وعادات کو حاصل کرنا اور برے ومذموم اخلاق سے نجات حاصل کرنا ہے جو کہ سب منصوص ہیں۔

ج: ظاہری جوارح واعضاء سے جو احکام متعلق ہیں، ان میں بھی عمدگی اور سلیقہ مندی تبھی حاصل کی جاسکتی ہے کہ جب اخلاص واحسان کے استحضار کے ساتھ اس کو انجام دیاجائے اور تصوف اسی کے حاصل کرنے کی راہ ہے۔

---

[١] التّفهيمات الإلهية،ص١ ضمن مجموعة رسائله الّتي قدْ طُبعتْ بعناية فضيلة الشيخ المفتي عطاء الرحمن القاسمي، أنظر ص٣٧ مِن المجلّد السّابع منه.

د: اسی طرح بعض ظاہری اعمال واحکام کے ساتھ وابستہ مقاصد تک بھی تب ہی رسائی ہو سکتی ہے جب کہ عبادت میں صرف اعضاء وجوارح ہی شریک نہ ہوں بلکہ دل بھی اس میں برابر شریکِ کار رہے اور ظاہر ہے کہ اعمال کے ساتھ ان مقاصد کی وابستگی اگر نص سے ثابت ہو تو اس کے شرعاً مقصود ہونے میں شبہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی ایک بڑی اور اہم خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے، یہ خصوصیت بلاشبہ شرع کا مقصود ہے گو اس درجے کی نماز فرض اور واجب نہ ہو لیکن مقصودیت کے لئے وجوب کوئی ضروری نہیں ہے، مندوبات وسنن بھی شرعاً مطلوب ہوتے ہیں جو واجب سے کم درجہ ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں اس پر بڑی دقیق، عمدہ اور مفصل بحث فرمائی ہے کہ ظاہری اعمال وافعال کا اندرونی صفات وکیفیات کے ساتھ کیا اور کس نوعیت کا تعلق ہوتا ہے؟ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> اعلم أن الأعمال مظاهر الهيئات النفسانية، وشروح لها، وشركات لاقتناصها.[١]
>
> "اعمال احوالِ نفسانیہ کے جلوہ گاہیں ہیں، اعمال ان احوال کی تشریح کرتی ہیں، اور ان احوال سے فائدہ اٹھانے کے لئے جال ہیں"۔

---

[١] حجة الله البالغة، باب ارتباط الأعمال بالهيئات النفسانية ،ج١ص ٦٩.

ویسے تو یہ پوری بحث قابلِ اور لائق مطالعہ ہے لیکن اس سے خصوصیت کے ساتھ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ظاہری اعمال اور اندرونی صفات کا آپس میں غیر معمولی ربط ہے اور یہ تعلق دو طرفہ ہے، چنانچہ اعمال پر پابندی ہی کی وجہ سے متعلقہ صفات وعادات حاصل ہو سکتی ہیں اور متعلقہ صفات اگر دل میں راسخ ہوں تو اسی کے نتیجے میں ظاہری اعمال میں عمدگی اور پختگی نصیب ہو جاتی ہے۔

مقاصد تصوف اور اہتمام سلف

اس عنوان کے تحت یہ بتادینا مقصود ہے کہ باطنی احوال واخلاق کا اہتمام کرنا، جو تصوف کی روح اور اس کا شعار ہے، کوئی نئی چیز نہیں، یہ کوئی ایسا اقدام نہیں جو صوفیاء کہلانے والے افراد نے اپنی طرف سے ایجاد کی ہوں اور اس کو بے جا مبالغہ، تقشف سے موسوم کیا جاسکے، بلکہ حضرات سلف کے ہاں بھی ان باتوں کا خوب خوب اہتمام ہو تا تھا، البتہ باطنی احوال کی خرابی وفساد اور گناہوں کی آلودگی کا حال زمانے اور ماحول و معاشرے کے لحاظ سے مختلف ہے، یوں ہی طریقہ علاج بھی ہر جگہ یکساں ہونا ضروری نہیں ہے، تاہم اتنی بات متیقن ہے کہ سلف صالحین کے ہاں بھی ان باتوں کا اچھی طرح اہتمام ہو تا تھا، وہ اپنے ماحول کے مطابق اس کا خوب خوب خیال رکھا کرتے تھے۔

اس میں دو باتوں کو پیش نظر رکھ کر موضوع مکمل ہو جاتا ہے۔

الف: پہلی بات تو یہی ہے کہ سلف صالح قرآن وسنت کے خوب متبع بلکہ اتباع شریعت کے گویا مثالی عملی نمونے تھے گو معصوم نہ تھے، اور قرآن وسنت میں ان باطنی احوال واخلاق کا جابجا ذکر کیا گیا ہے، اچھی اخلاق کے حصول کا کہیں حکم

اور کہیں ترغیب دی گئی ہے، برے اخلاق پر کبھی وعید اور کبھی چھوڑنے کی فضلیت بتائی گئی ہے۔ تو ان سے کیسے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کے ہاں ان باتوں کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا! ظاہر ہے کہ باطنی احوال واخلاق تو ہر وقت ایک حالت پر نہیں رہتے کہ ایک مرتبہ اصلاح ہوگئی تو بس فارغ ہوگئے اور اس کے بعد اس پر توجہ کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس میں آئے وقت تغیر اور اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، اب اگر ان کے ہاں اس بات کا اہتمام نہیں تھا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ دین وشریعت کے اس حصے پر عامل نہ تھے، حالانکہ اس بات کا غلط ہونا محتاج بیان نہیں ہے۔

سلف کے ہاں باطنی احوال کا اہتمام

ب: ان کے تراجم اور سوانح حیات کو اسی موضوع کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایسے واقعات وقصص کی ایک ضخیم دفتر تیار کی جاسکتی ہے جہاں انہوں نے اپنے یا دوسرے افراد کے باطنی احوال وکیفیات کا مواخذہ کیا اور ان کو درست کرنے کی کوشش فرمائی ہیں۔ یہاں نمونے کے طور پر ان میں سے چند واقعات کو ذکر کیا جاتا ہے۔ "سنن ابن ماجہ" میں ہے:

ما رئي رسول الله – صلى الله عليه وسلم – يأكل متكئا قط، ولا يطأ عقبيه رجلان .[١]

---

[١] سنن ابن ماجه ت الأرنؤوط:باب من كره أن يوطأ عقباه، ج١ص ١٦٥.

"حضرت عبداللہ بن عمرو اپنے والدؓ سے روایت کرتے ہیں کہ: انہوں نے فرمایا کہ: رسول اللہ ﷺ کو ٹیک لگا کر کھاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا اور نہ آپ ﷺ کے پیچھے آدمی چلتے تھے"۔

یہاں جن دو کاموں کی نفی کی گئی کہ حضور ﷺ ان کے کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا، ان دونوں کاموں کے نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ تواضع اور عبدیت کے شان کے خلاف محسوس ہوتے ہیں۔ اسی کے بعد "ابن ماجہ" ہی میں دوسری روایت ذکر کی گئی ہے کہ:

عن أبي أمامة، قال: مر النبي - صلى الله عليه وسلم - في يوم شديد الحر نحو بقيع الغرقد، وكان الناس يمشون خلفه، فلما سمع صوت النعال وقر ذلك في نفسه، فجلس حتى قدمهم أمامه، لئلا يقع في نفسه شيء من الكبر.[1]

"حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک مرتبہ سخت گرمی کے دن رسول اللہ ﷺ بقیع غرقد کی طرف جا رہے تھے، کچھ لوگوں نے آپ ﷺ کے پیچھے چلنا شروع کر دیا، جب آپ ﷺ کو جوتوں کی آواز سنائی دی تو آپ ﷺ نے اسے محسوس کیا، چنانچہ آپ ﷺ بیٹھ گئے یہاں تک کہ لوگ آپ ﷺ سے آگے نکل گئے، تاکہ آپ ﷺ کے دل میں ذرا سا تکبر بھی پیدا نہ ہو"۔

یہاں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ خود توجیہ فرمارہے ہیں کہ حضور ﷺ نے چلتے ہوئے کیوں جلوس اختیار فرمایا اور چلنے والے حضرات کو اپنے سے آگے کیوں

---

[1] سنن ابن ماجه ت الأرنؤوط : باب من كره أن يوطأ عقباه ،ج ١ص ١٦٥

فرمایا؟ اس سے سنت طریقہ تو معلوم ہوتا ہی ہے ساتھ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی جو ان کے ذہن وعادت سے بعید تر محسوس ہوتی تھی بلکہ بے تکلف وہ ان باتوں کو سمجھتے تھے۔

واضح رہے کہ بعض محدثین کرام نے اس روایت کے اسنادی حیثیت پر کلام کیاہے اور بعض رواۃ کی وجہ سے اس کو درست قرار دینے میں تامل فرمایاہیں، لیکن ان جیسے واقعات خود حضور ﷺ کی زندگی میں متعدد جگہوں پر ملتی ہیں جہاں عبدیت کے خلاف کوئی کام محسوس ہوا تو فوراًترک فرمایا اور جن چیزوں میں شانِ تواضع کے خلاف کبر کی بو تک آسکتی تھی ،اس کے اختیار کرنے سے اجتناب فرماتے تھے،چنانچہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ ﷺ کے لئے کھڑے نہ ہوتے تھے۔

"صحیح مسلم" کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:" اس دوران کہ ایک شخص اپنی دو دھاری دار چادروں میں اترا کر چل رہاتھا اور عجب کا شکار تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین کے اندر دھنسادیا تو وہ اس میں قیامت تک نیچے (ہی) چلا جاتا رہے گا"[1]۔ اس شخص کا جرم کیا تھا جو اتنی سخت سزا دی گئی ؟ وہی باطنی حالات واخلاق سے متعلق کوتاہی تھی جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آئی اور اسی کی وجہ سے یہ شخص اپنے کیفر کردار تک جا پہنچا۔جن حضرات صحابہ کرام نے یہ روایت

---

[1] صحيح مسلم:باب تحريم التبختر في المشي مع إعجابه بثيابه، ج٣ص١٦٥٤.

حضور ﷺ سے خود سماعت فرمائی یا کسی واسطے سے ان تک یہ روایت پہنچی، ان کا اس حوالے سے کیا طرزِ عمل ہوا ہو گا؟ کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ اس چیز کے تذکرہ اور عملی طور پر اس کی درستگی کا ان کو اہتمام نہیں ہو گا!

حضرت حنظلہ اور ابو بکر صدیق کا قصہ

حضرت حنظلہ اسیدی اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قصہ تو مشہور ہی ہے، امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی اپنی "صحیح مسلم" میں اس کو روایت فرمایا ہے[١]، اس میں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہما جس نفاق کی شکایت لے کر حضور ﷺ کی مجلس میں جا پہنچیں، وہ کونسی منافقت تھی؟ کیوں ان کو اپنے متعلق یہ شبہ پیش آیا؟ اور حضور ﷺ نے ان کا شبہ معلوم ہو جانے کے بعد کیا ہدایت ارشاد فرمائی؟ یہ چند ایسے پہلوؤں ہیں جن سے بڑی رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں حقیقی منافقت تو مراد نہیں ہو سکتا کہ اعتقادی طور پر منافقت مراد لی جائے، اس سے وہی اندرونی حالات وکیفیات میں تغیر مراد ہے، اسی کو نفاق سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ حضور ﷺ اس سوال کی حوصلہ شکنی نہیں فرمارہے بلکہ تسلی دے رہے ہیں اور گویا یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ ہر وقت اس طرح ترقی کی کیفیات واحوال کو برقرار رکھنا شرعاً ایسا لازم نہیں ہے جس کا انسان مکلف ہو اور اس کے نہ ہونے سے پریشان ہو جائے۔

---

[١] صحيح مسلم : باب فضل دوام الذكر والفكر في أمور الآخرة والمراقبة وجواز ترك ذلك في بعض الأوقات والاشتغال بالدنيا، ج٤ص٢١٠٦.

امام نووی رحمہ اللہ اس کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

قوله (نافق حنظلة) معناه أنه خاف أنه منافق حيث كان يحصل له الخوف في مجلس النبي صلى الله عليه وسلم ويظهر عليه ذلك مع المراقبة والفكر والإقبال على الآخرة فإذا خرج اشتغل بالزوجة والأولاد ومعاش الدنيا وأصل النفاق إظهار ما يكتم خلافه من الشر فخاف أن يكون ذلك نفاقا فأعلمهم النبي صلى الله عليه وسلم أنه ليس بنفاق وأنهم لا يكلفون الدوام على ذلك ساعة وساعة.[1]

ترجمہ: "حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے اس فرمان کہ: "حنظلہ منافق ہو گیا" کا معنی ڈرہے کہ ان کو یہ خوف لاحق ہو گیا کہ وہ منافق ہو گئے، کیوں کہ جب وہ نبی کریم ﷺ کی مجلس میں ہوتے، تو ان کو خوف کی کیفیت حاصل ہوتی، اور ان پر خوف کا اثر ظاہر ہوتا، فکر مندی اور آخرت کی حضوری کی کیفیت ہوتی، اور جب وہ مجلس نبوی سے نکلتے، تو اپنی بیوی، اولاد اور کسب معاش کے ساتھ مشغول ہو جاتے، اور نفاق دراصل اس کو کہتے ہے کہ جو شر چھپایا ہوا ہوتا ہے اس کے خلاف ظاہر کرنا، تو حنظلہ رضی اللہ عنہ اس بات سے ڈرے کہ کہیں یہ نفاق نہ ہو، حضور نبی کریم ﷺ نے ان کو خبر دی کہ یہ نفاق نہیں، اور لوگ اس کیفیت پر ہمیشہ رہنے کے مکلف نہیں ہیں"۔

---

[1] شرح النووي على مسلم: باب فضل دوام الذكر والفكر في أمور الآخرة والمراقبة وجواز ترك ذلك في بعض الأوقات والاشتغال بالدنيا، ج١٧ص ٦٦.

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان جیسی باتوں کا بڑا ہی اہتمام ہوتا تھا، امام ابو بکر ابن ابی الدنیا نے اپنے رسالے "الصمت" میں اس کے مختلف واقعات ذکر فرماتے ہیں۔

ایک جگہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے اتنے میں "جارود" نمودار ہوئے، دیکھتے ہی ایک شخص نے کہا کہ یہ قبیلہ ربیعہ کا سردار ہے، یہ جملہ حضرت عمر، ان کے ساتھ بیٹھے لوگوں اور خود جارود نے بھی سنا، جارود جب حضرت فاروق کے قریب ہوئے تو آپ نے اس کو اپنا درہ لگایا۔ جارود نے کہا کہ حضرت کیا ہوا؟ میرا جرم؟ حضرت فاروق نے ارشاد فرمایا: "کیا آپ نے یہ جملہ نہیں سنا؟" جارود نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ: "مجھے خطرہ ہوا کہ اس سے آپ کے دل میں کچھ (کبر وبڑائی کا خیال) پیدا نہ ہو جائے، اس لئے مناسب سمجھا کہ میں تیری حیثیت تھوڑی کم دکھاؤں۔"[1]

دوسری جگہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ہی سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف کی، تو آپ نے اس کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ "تم مجھے بھی ہلاک کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھی"۔[2] حضرت عبید اللہ ابن ابی جعفر کے حوالہ سے نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا: "اگر کوئی شخص

---

[1] الصمت لابن أبي الدنيا،ص: ٢٧٣.

[2] الصمت لابن أبي الدنيا،ص: ٢٧٥.

مجلس میں کچھ گفتگو کرتا ہے اور اس کی وجہ سے عجب میں مبتلا ہو جائے تو چاہئے کہ وہ خاموش رہے اور اگر خاموش ہو اور خاموشی کی وجہ سے عجب پیدا ہونا شروع ہو جائے تو بات کر لینی چاہئے۔"[1]

حضرت عمرؓ کا خود پسندی پر بیٹے کو مارنا

مشہور محدث حضرت حافظ معمر بن راشد رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا ایک عجیب قصہ نقل کرتے ہے کہ:

دخل ابن لعمر بن الخطاب عليه، وقد ترجل، ولبس ثيابا حسنا، فضربه عمر بالدرة حتى أبكاه، فقالت له حفصة: لم يكن فاحشا، لم ضربته؟ فقال: «رأيته قد أعجبته نفسه، فأحببت أن أصغرها إليه».[2]

ترجمہ:"حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بیٹے آپ کے ہاں تشریف لائیں، اور انہوں نے بالوں میں کنگھی کی ہوئی تھی، اور اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں درہ سے مارا، یہاں تک کہ انہیں رلا دیا، تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: انہوں نے تو کوئی برائی نہیں کی تھی، آپ نے انہیں کیوں مارا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ اسے اپنے نفس نے تعجب میں ڈالا ہے، تو میں نے چاہا کہ ان کے نفس کو ان کی نگاہ میں چھوٹا بناؤں"

---

[1] الصمت لابن أبي الدنيا،ص: ٢٨١.

[2] جامع معمر بن راشد :باب الكبر،ج١٠ص ٤١٦.

سنن سعید بن منصور میں ہے کہ ایک بار حضرت عمر بن عبید اللہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ سوال کیا کہ: "میں جہاد میں جاتا ہوں اور اللہ کی رضاء کے لئے (جان) خرچ کرتا ہوں اور (گھر سے) اسی (نیت کے ساتھ) لئے نکلتا ہوں لیکن لڑائی کے وقت میری خواہش ہوتی ہے کہ میری لڑائی اور میری حاضری لوگ دیکھ لیں (تو اس میں کوئی حرج ہے؟)" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "میں آپ کو ریاء کار شخص سمجھتا ہوں"۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ریاء واخلاص کی باتوں کا تذکرہ کوئی محدث چیز نہیں ہے بلکہ دو سلف میں بھی اس کا رواج تھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ باوجودیکہ حد درجہ اتباع سنت کرتے تھے اور یہ اس کا گویا علامتی نشان بن گیا تھا لیکن بایں ہمہ انہوں نے اس سوال کو مذموم خیال کیا نہ ہی کوئی حوصلہ شکنی فرمائی، بلکہ جواب دیا۔ حالانکہ ان سے یہ بات بالکل مخفی نہیں تھی کہ دین میں غلو اور تجاوز ممنوع ہے اور غلو آمیز یا لایعنی سوالات کے موقع پر حضور ﷺ کا کیا طرزِ عمل ہوتا تھا؟ وہ بھی ان سے پوشیدہ نہ تھا۔

علامہ ابن خلدون کا تجزیہ

علامہ عبد الرحمن ابن خلدون صاحب رحمہ اللہ نے تصوف کے مباحث کے متعلق ایک کتاب تحریر فرمائی ہے، اس میں وہ ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

---

[1] سنن سعید بن منصور ج٢ص ٢٥.

" ثمّ إنّ الصّحابة رضوان الله عليهم لما شرح الله صدورَهم للإسلام وقبلوا مِن الهداية ما كانوا فيه على بيّنة مِن ربّهم، صرفوا الاهتمام إلى أعمال الباطن أكثر مِن أعمال الظّاهر، فكانوا يراعون أنفاسهم ويُراقبون خطراتهم ويحذرون غوائل قلوبهم. وفي هذا كانت أكثر مفاوضتهم وفزع بعضهم إلى بعض، ومِن فلتاتها معظّم تحرّزهم.[١]

ترجمہ:"جب اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سینے اسلام کے لئے کھول دئے،اورانہوں نے اس ہدایت کوقبول کرلیاجوان کے پروردگار کی جانب سے تھی،توانہوں نے ظاہری اعمال کی بنسبت باطنی اعمال کی درستگی کازیادہ اہتمام فرمایا، وہاپنی نفسوں کی نگرانی کرتے تھے ،اور اپنے خیالات کی حفاظت کرتے تھے ،اوردلوں کی برائیوں سے بچتے تھے ،اوراسی بارے میں ان کی اکثرگفتگوہوتی تھی، اورنفس کی برائیوں سے بچاؤکازیادہ اہتمام تھا"-

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ،حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے جو اصرار و تکرار کے ساتھ پوچھتے تھے کہ کہیں میرانام تو منافقین میں شامل نہیں ہے؟ اس واقعہ کو ذکر کرنے اور اس میں تامل کرنے کا مشورہ دینے کے بعد علامہ مزید لکھتے ہیں:

فانظرْ إلى حذر عمر رضي الله عنه مِن هذا النّفاق وتأمّلْ ما هو؟ كيف تجده ؟ كثيرا ما يحذر مِن خفيات الأعمال الباطنة المذمومة المجتنبة ويعرفك ذلك أنّ شأنها مهمّ وخطرها في الدّين عظيم، إذ

١

لو كان مراد عمر وحذيفة بهذا النّفاق ومدلوله المشــهور.. لما حذر عمر مِن ذلك وفزع فيه إلى علم حذيفة إذ هو يعلم مِن نفســه أنّه مبرّأ منه..فالّذي حذره عمر صــنف آخر مِن النّفاق وهو ما يكون مِن أعمال الباطن مِن خفايا المهلكات تقع فلتة ولا يعلمها الإنســان مِن نفسه".[١]

ترجمہ:"حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پرہیز کو دیکھو اس نفاق سے اور سوچو کہ وہ کیا ہے؟ کیسے پاتے ہو اسے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت پرہیز کرتے تھے ان مذموم مخفی باطنی اعمال سے، اور یہ آپ کو واقف کرا دیتا ہے اس بات سے کہ ان امور کا خطرہ بہت بڑا ہے دین میں، اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا اس سے مراد مشہور نفاق ہوتا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سے خوف نہیں کرتے، کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ وہ اس سے بری ہے، پس جس نفاق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ڈر رہے تھے وہ نفاق کی دوسری قسم ہے، اور وہ ہلاک کرنے والے باطنی اعمال کا نفاق ہے جو بغیر غور و فکر کے واقع ہوتے ہیں، اور انسان ان کو نہیں جانتا"۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے درج بالا عبارت میں جو بات تحریر فرمائی ہے، وہ بالکل درست ہے، پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ معقول بھی ہے اور منقول بھی۔ یعنیٰ حضرات صحابہ کرام کے ہاں دینی احکام و شعائر کی پابندی کا جو کچھ حال

---

[١] شفاء السّائل وتهذيب المسائل، الكلام في تحقيق طرق الصّوفية،ص٤٠.

تھا،اس کو دیکھ کر عقلی طور پر یہی نتیجہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو اوپر درج کر دیا گیا ہے، صحابہ کی زندگیوں کے واقعات سے بھی اس کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے۔

تصوف کی اہمیت عقل وفکر کی روشنی میں

کوئی چیز اہم ہے یا نہیں؟اور اگر اہم تو کس قدر؟اس بات کا دار مدار عام طورپر اس بات پر ہوتا ہے کہ اس چیز کے ساتھ وابستہ مقاصد کی نوعیت کیا ہے؟اوراس کے نتائج وثمرات کیا ہیں؟ چنانچہ بعض اوقات کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جس میں بذات خود اہتمام ولیاقت کا کوئی جوہر موجود نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ کچھ ضروری مصالح اور اساسی مقاصد متعلق ہوجاتے ہیں اوراس کی وجہ سے اس چیز کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں بذات خود کوئی خاص برائی نہیں ہوتی لیکن اس کے نتیجہ میں کچھ دوررس مفاسد اور نقصانات جنم لیتے ہیں جن کی وجہ سے اس کی برائی زیادہ ہوجاتی ہے۔

علم سلوک وتصوف اوراس کی اہمیت ومقام کا معاملہ بھی یہی سے حل ہوجاتا ہے، چنانچہ اسی باب میں تصوف کی تعریف،غرض اور فوائد وثمرات کے عناوین کے تحت ذکر کیا جاچکا ہے کہ تصوف کے ساتھ اخلاق کی درستگی اور اخلاص واحسان متعلق ہیں اور اس کے علاوہ بھی متعدد فوائد وثمرات اسی فن سے وابستہ ہیں۔اس سے اجمالی اور اصولی طور پر اس علم کی اہمیت اور اس کا مقام ومرتبہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔

اہمیتِ تصوف علماء اسلام کی نظر میں

تصوف کی اہمیت اقوال سلف واکابر کی روشنی میں

امام ابو نعیم اصبہانی رحمہ اللہ کی "حلیۃ الاولیاء"، امام ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ نے "الرسالۃ القشیریۃ" اور علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے "صفۃ الصفوۃ" میں ایسے سینکڑوں اہل علم کے اقوال وملفوظات جمع کئے گئے ہیں، جن میں اس فن اور اس کے ساتھ اشتغال واہتمام کرنے کی اہمیت بیان کی گئی ہیں اور مختلف پہلوؤں سے اس قضیہ کو اچھی طرح واضح کیا گیا ہے[1]۔ اگر کوئی شخص اس پہلو کو پیش نظر ان تمام اقوال کو نکال کر مرتب کرلے تو پوری ضخیم کتاب بن سکتی ہے ،اس سے یہ بات اچھی طرح نکھر کر صاف ہو جاتی ہے کہ اسلاف واکابر کے ہاں تصوف وسلوک کی بہت ہی اہمیت تھی، اس کے اشتغال ان کی زندگیوں کا اہم جزء تھا، ان کے علمی وعملی کمالات میں اعمالِ تصوف کے ساتھ ربط وتعلق کا بڑی کلیدی کردار رہاہے۔

یہاں اختصار کے پیش نظر چند اہلِ علم کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں:

امام قشیری رحمہ اللہ اور تصوف

امام ابوالقاسم قشیری رحمہ اللہ اپنے مشہور "رسالہ قشیریہ" کے بالکل ابتداء میں تحریر فرماتے ہیں:

[1] شیخ عبد القادر عیسیٰ رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "حقائق عن التصوف" میں اس نوعیت کے بعض ائمہ علماء کے اقوال وآراء نقل فرمائی ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: "حقائق عن التصوف، الباب الخامس شہادات علماء الامۃ الاسلامیۃ من سلفہا الی خلفہا للتصوف ورجالہ" ص ۴۵۵.

قد جعل الله هذه الطائفة صفوة أوليائه، وفضلهم على الكافة من عباده، بعد رسله وأنبيائه، صلوات الله وسلامه عليهم، وجعل قلوبهم معادن أسراره، واختصهم من بين الأمة بطوالع أنواره.

فهم الغياث للخلق، والدائرون في عموم أحوالهم مع الحق بالحق. صفاهم من كدورات البشرية، ورقاهم إلى محال المشاهدات بما تجلى لهم من حقائق الأحدية. ووفقهم للقيام بآداب العبودية، وأشهد مجاري أحكام الربوبية. فقاموا بأداء ما عليهم من واجبات تكليف، وتحققوا بما منه سبحانه لهم من التقليب والتصريف.[١]

ترجمہ: "اللہ تعالی نے اپنے اولیاء میں سے اس گروہ کو خالص بنایا، انبیاء اور رسل علیہم السلام کے بعد اپنے تمام بندوں میں ان کو فضیلت دی، ان کے دلوں کو اپنے رموز کا خزانہ بنایا، اور امت میں سے ان کو اس نور کے ذریعے خاص کیا جہاں سے نور طلوع ہوتا ہے، پس یہ لوگوں کے لئے مددگار ہیں، اپنے عام حالات میں حق کو حق کے ساتھ لیکر گھومتے پرتے ہیں، اللہ تعالی نے انہیں انسانی گندگیوں سے پاک کیا ہے، اور ان کو مشاہدات کے مقامات تک پہنچایا جہاں انہیں احدیّت کی حقیقتیں ظاہر ہوئیں، اور اپنی بندگی کے آداب کا انہیں توفیق دی، ان کو خدائی احکام کا مشاہدہ کرایا، تو جن واجبات پر وہ مکلف ہے ان کے ادا کرنے کے لئے وہ تیار ہوئے، اللہ تعالی کی طرف سے ان کے لئے جو تصریف وتقلیب اس کی وجہ سے وہ ثابت قدم ہوگئے"۔

---

[١] الرسالة القشيرية، باب في ذكر مشايخ هذه الطريقة وَمَا يدل من سيرهم وأقوالهم عَلَى تعظيم الشريعة، ج١ص ١٥.

امام غزالی رحمہ اللہ اور اہمیت تصوف

چھٹی صدی ہجری کے علماء میں سے حضرت امام غزالی رحمہ اللہ کا نام محتاج بیان نہیں ہے، وہ تصوف کے اصل مقصود یعنی اصلاح اخلاق کو فرض عین قرار دیتے ہیں اور علم و عمل کے اس اہم گوشہ سے جو "فقہاء" غفلت کا رویہ برتتے ہیں، ان پر بڑے درد و کرب کے ساتھ اظہارِ افسوس بھی کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

فهذه وأمثالها من صفات القلب مغارس الفواحش ومنابت الأعمال المحظورة وأضدادها وهي الأخلاق المحمودة منبع الطاعات والقربات فالعلم بحدود هذه الأمور وحقائقها وأسبابها وثمراتها وعلاجها هو علم الآخرة وهو فرض عين في فتوىٰ علماء الآخرة فالمعرض عنها هالك بسطوة ملك الملوك في الآخرة كما أن المعرض عن الأعمال الظاهرة هالك بسيف سلاطين الدنيا بحكم فتوىٰ فقهاء الدنيا فنظر الفقهاء في فروض العين بالإضافة إلىٰ صلاح الدنيا وهذا بالإضافة إلىٰ صلاح الآخرة.[1]

ترجمہ: "یہ اور اس کی طرح اور دل کی صفات برے اور ممنوع اعمال کی جڑ اور بنیاد ہیں، اور اس کے مقابل اچھے اعمال وہ ہیں جو طاعات اور نیکیوں کا سرچشمہ ہیں، پس ان اعمال کی تعریفیں، حقیقتیں، اسباب اور ثمرات اور ان کا علاج کا جاننا ہی آخرت کا علم ہے، علماء آخرت کے فتوی کے مطابق یہ علم فرض عین ہے، تو ان سے اعراض کرنے

---

[1] إحياء علوم الدين، كتاب العلم، الباب الثاني في العلم المحمود والمذموم وأقسامهما وأحكامهما، ج١ص ٢١.

والا آخرت میں بادشاہوں کے بادشاہ کے غلبہ سے ہلاک ہے،جیسا کہ دنیا کے دانشوروں کے فتوی کے مطابق ظاہری اعمال سے اعراض کرنے والا دنیا کے بادشاہوں کی تلوار سے ہلاک ہے، دنیا کی درستگی کی خاطر فقہاء کا محور فرض عین ہے اور یہ (علم) آخرت کی درستگی کی خاطر ہے"۔

امام رازی رحمہ اللہ کی تحقیق

امام رازی رحمہ اللہ، باوجودیکہ پوری زندگی ان فنون کی خدمت میں گزاردی جن کو معقولات کہاجاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ، تحریر فرماتے ہیں:

اعْلَم أَن أَكثر من قصّ فرق الْأمة لم يذكر الصُّـوفِيَّة وَذَلِكَ خطأ لِأَن حَاصِـل قَول الصُّوفِيَّة وَلِأَن الطَّرِيق الى معرفَة الله تَعَالَىٰ هُوَ التصفية والتجرد من العلائق الْبَدَنِيَّة وَهَذَا طَرِيق حسن.[1]

ترجمہ:" جان لو! کہ جس شخص نے امت کے فرقوں میں صوفیاء کا ذکر نہیں کیا تو یہ غلط ہے، کیونکہ صوفیاء کے قول کا حاصل اور اللہ تعالی کی معرفت کا راستہ صرف اوصرف تصفیہ اور دنیوی تعلقات سے پاک ہونا ہے اور یہ راستہ بہتر ہے"۔

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ کی تحقیق

علامہ ابن قدامہ مقدسی رحمہ اللہ، باوجودیکہ حنبلی مسلک تھے جن کی طرف بدعات کے باب میں شدت منسوب کی جاتی ہے، علم تصوف کو حقیقی علم قرار دیتے ہیں، اس کے فرض ہونے کی صراحت کرتے ہیں اور ساتھ اس حقیقت سے بھی نقاب کشائی فرماتے ہیں کہ سلف میں سے جو حضرات بڑی بڑی خدمات

---

[1] اعتقادات فرق المسلمين والمشركين،الْبَاب الثَّامِن فِي أَحْوَال الصوفيه ص: ٧٢.

انجام دیکر شہرہ آفاق ہوئے ہیں،ان کے کارناموں میں باطنی اخلاق وکیفیات کی درستگی اور اہتمام کا کلیدی کردار رہاہے،لکھتے ہیں:

فأما علم المعاملة وهو علم أحوال القلب، كالخوف، والرجاء، والرضى، والصدق، والإخلاص وغير ذلك، فهذا العلم ارتفع به كبار العلماء، وبتحقيقه اشتهرت أذكارهم، كسفيان [الثوري]، وأبي حنيفة، ومالك، والشافعي، وأحمد.وإنما انحطت رتبة المسمين بالفقهاء والعلماء عن تلك المقامات، لتشاغلهم بصورة العلم من غير أخذ على النفس أن تبلغ إلى حقائقه وتعمل بخفاياه.[1]

ترجمہ:"پس علم معاملہ یہ قلب کے احوال کا علم ہے جیسے خوف،امید،رضا اور سچ ،اخلاص اس کے علاوہ اور،پس اس علم کے ذریعے بڑے علماء نے اونچے رتبے حاصل کئے،اس کی تحقیق کی وجہ سے ان کا ذکر مشہور ہوا جیسے سفیان ثوریؒ،امام ابو حنیفہؒ،امام مالکؒ،امام شافعیؒ اور امام احمدؒ۔وہ لوگ جو فقہاء اور علماء کے نام سے موسوم ہے ان کا رتبہ ان مقامات سے اس لئے کم ہوا کہ وہ نفس کے مواخذہ کو چھوڑ کر ظاہری علم میں مشغول ہوئے اور اس کے حقائق تک رسائی اور بغیر عمل کے اس کی باریکیوں پر"۔

اس کے بعد بڑے سوزِ دروں کی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ:

وأنت تجد الفقيه يتكلم في الظِّهار، واللِّعان، والسبع، والرمي، ويفرع التفريعات التي تمضي الدهور فيها ولا يحتاج إلى مسألة منها،

---

[1] مختصر منهاج القاصدين,كتاب العلم وفضله-**الفصل في علم المعامله**،ج١ص١٨۔

ولا يتكلم في الإخلاص، ولا يحذر من الرياء، وهذا عليه فرض عين، لأن في إهماله هلاكه، والأول فرض كفاية.[۱]

"اور تم فقیہ کو مسئلہ ظہار، لعان، سبق اور تیر اندازی میں کلام کرتے ہوئے پاؤں گے، اور ان تفریعات کا ذکر کرتے ہوئے جن پر زمانہ گزر تا ہو اور ان مسائل میں وہ کسی مسئلے کا محتاج نہیں، لیکن وہ اخلاص کے متعلق کچھ نہیں کہے گا اور نہ اپنے آپ کو ریاء سے بچائے گا حالانکہ یہ اس پر فرض عین ہے اور پہلا علم فرض کفایہ ہے کیونکہ اس کے نہ جاننے میں اس کی ہلاکت ہے"۔

امام سبکی رحمہ اللہ کا اظہارِ عقیدت

امام سبکی رحمہ اللہ جیسے وسیع النظر علامہ صوفیہ کرام کو محبت وجوش سے بھرپور انداز میں دعائیں دیتے ہیں، ان کے خلاف ماحول بننے کا پس منظر بتاتے ہیں اور ساتھ ان کی خصوصیات وامتیازات ذکر کرتے ہیں، اس سلسلہ میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

الصوفيّة: حيّاهم اللهّ وبيّاهم، وجَمَعنا في الجنَّة نحن وإياهم.وقد تشعَّبت الأقوال فيهم تشعُّبًا ناشئًا عن الجهل بحقيقتهم؛ لكثرة المتلبسين بها... والحاصل أنّهم أهل اللهّ وخاصّتُهُ، الذين ترتجى الرحمة بذكرهم، ويُستَنزَل الغيث بدعائهم؛ فرضي اللهّ عنهم وعنّا بهم! وللقوم أوصاف وأخبار اشتملت عليها كتُبهم. قال الأستاذ أبو القاسم القشيري رحمه اللهّ: جعل اللهّ هذه الطائفة صفوة أوليائه،

---

[۱] مختصر منهاج القاصدين، كتاب العلم وفضله وما يتعلق به، فصل في علم المعاملة، ص۱۸.

وفضَّــلهم علىٰ الكافَّة من عباده بعد رســله وأنبيائه صــلوات اللهَّ عليهم وسلامه.[۱]

ترجمہ:" اللہ تعالی صوفیاء کرام کو زندہ اور خوش رکھے ہمیں اور ان کو جنت میں اکٹھا کرے۔ ان صوفیاء کے متعلق مختلف قسم کے اقوال پھیلے ہوئے ہیں جو ان کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں کیونکہ اکثر لوگ اس طریق (یعنی صوفیت) سے مشابہت کرتے ہیں۔۔۔ خلاصہ یہ کہ وہ اللہ تعالی کے قریب اور خاص بندے ہیں، جن کے ذکر کرنے سے رحمت کی امید کی جاتی ہے اور ان کی دعا کی وجہ سے بارش برستی ہے پس اللہ تعالی ان سے اوران کے سبب ہم سے راضی ہو جائے! ہر قوم کے اوصاف اور مختلف اخبار ہوتے ہیں جن کی کتابیں ان پر مشتمل ہوتی ہیں ۔ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالی نے اس گروہ کو اپنے اولیاء میں سے خالص بنایا، انبیاء اور رسل علیہم السلام کے بعد اپنے تمام بندوں میں ان کو فضیلت دی"۔

علامہ برکوی رحمہ اللہ کا فیصلہ

دسویں صدی ہجری کے فقہائے احناف میں سے علامہ برکوی رحمہ اللہ کا خصوصی مقام رہاہے، وہ اپنے زمانے میں گو کچھ زیادہ مشہور نہیں ہوئے لیکن ان کی کتابوں سے ان کے علمی رسوخ، تفقہ اور بدعات ورسومات کے حوالہ سے حد درجہ حساس وخبردار ہونے کا اچھی طرح یقین حاصل ہو جاتاہے، ان امتیازات کے باوجود وہ تحریر فرماتے ہیں:

---

[۱] معيد النعم ومبيد النقم،المثال السابع والستون،ص: ٩٣.

وكل من اشتغل بشيء من المعاملات والحرف يفترض عليه التحرز عن الحرام فيه وكذلك يفترض عليه علم أحوال القلب من التوكل والإنابة والخشيةوالرضا فإنه واقع في جميع الأحوال.[1]

ترجمہ:"جو شخص معاملات اور پیشوں میں کسی شئ کے ساتھ مشغول ہو، تو اس پر حرام سے بچنا فرض ہے اسی طرح قلب کے احوال کا علم سیکھنا بھی اس پر واجب ہے جیسے توکل، اللہ تعالی کی طرف رجوع اور خوف ورضا، کیونکہ ہر حال میں یہ واقع ہے"۔

امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تحقیق انیق

امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا علمی مقام، دینی خدمات اور غیر معمولی کارنامے محتاج بیان نہیں ہیں، اپنے عہد میں ہندوستان کی سرزمین پر وہ اور ان کے متعلقین ہی تھے جنہوں نے ہندوستان کے چپے چپے میں سنت وشریعت کا چراغ چمکایا اور بدعات ورسومات کے طوفان خیز موجوں کا کامیاب مقابلہ کیا۔اس خانوادہ اور درس گاہ میں سلوک وتصوف کا بول بالا رہا، تمام مرکزی شخصیات کی زندگی بھر اس کے ساتھ واسطہ رہا۔ان کی نظر میں تصوف وسلوک کی اہمیت کیا اور کس قدر تھی؟اس کا کچھ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے جو حضرت شاہ صاحب نے اپنی کتاب "تفہیمات" میں ذکر فرمائی ہے،وہ لکھتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور ان کے جانشین ونائبین کی بعثت ودعوت کے تین بڑے مقاصد ہیں:

---

[1] علامہ برکوی رحمہ اللہ نے یہ عبارت علامہ زرنوجی کی کتاب "تعلیم المتعلم" سے تائید کے طور پر نقل فرمائی ہے۔ الطريقة المحمدية، الباب الثاني، ص١١١.

الف: عقائد ونظریات کی درستگی۔ب:ظاہری اعمالوکردار کی درستگی۔ج:احسان واخلاص کی درستگی۔اس کے بعد لکھتے ہیں:

والّذي نفسي بيده إنّ هذا الأمرَ الثّالثَ أدقُّ المقاصد الشّرعية مأخذا وأعمقها أصلا ونسبتُه إلىٰ جميع الشّرائع بمنزلة الرّوح للجسم أو المعنىٰ لِللفظ، وقدْ تحمّل الصّوفيةُ الأخيار هذا العبءَ علىٰ أكتافهم فاهتدوا وهدوا وانتفعوا ونفعوا النّاس وفازوا بحصول السّعادة العظمىٰ.[١]

ترجمہ:"اس ذات کا قسم جس کی قدرت میں میری روح ہے، مقاصدِ شرعیہ میں ماخذ کے اعتبار سے انتہائی باریک ترین اور اصل کے اعتبار سے بہت مشکل ترین یہ تیسرا امر ہے،اس کی نسبت پوری شریعت کی طرف ایسی ہے جیسا کہ روح کی نسبت جسم یا معنیٰ کا لفظ کی طرف ہے اور یقیناً صوفیاء نے یہ بار اپنے کندھوں پر اٹھایا، تو خود بھی ہدایت یافتہ ہوئیں دوسروں کو بھی ہدایت دی خود بھی نفع پایا دوسرے لوگوں کو بھی نفع پہنچایا، اور بڑی سعادت حاصل کرنے کے سبب وہ کامیاب ہوئے"۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتّی کی تصریح

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے متعلقین میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتّی رحمہ اللہ کا نام گرامی بھی محتاج بیان نہیں ہے، علم حدیث، تفسیر اور فقہ میں اپنے زمانے کے علماء کا مرجع شمار ہوتے ہیں، وہ بھی تصوف کے مقاصد کو فرض عین قرار

---

[١] التّفهيمات الإلهية،ص١ ضمن مجموعة رسائله الّتي قدْ طُبعتْ بعناية فضيلة الشيخ المفتي عطاء الرحمن القاسمي، أنظر ص٣٧ مِن المجلّد السّابع منه.

دیتے ہیں، اس میں کوتاہی کو حرام قرار دیتے ہیں اور ظاہری اعمال کے فرائض ومحرمات سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں، وہ اپنی مشہور تفسیر "تفسیر مظہری" میں تحریر فرماتے ہیں:

واما العلم اللدني في الذي يسمون أهلها بالصوفية الكرام فهو فرض عين لان ثمراتها تصفيه القلب عن الاشتغال بغير الله تعالىٰ واتصافه بدوام الحضور وتزكية النفس عن رذائل الأخلاق من العجب والكبر والحسد وحب الدنيا والكسل في الطاعات وإيثار الشهوات والرياء والسمعة وغير ذلك وتجليتها بكرام الأخلاق من التوبة والرضا بالقضاء والشكر على النعماء والصبر على البلاء وغير ذلك ولا شك ان هذه الأمور محرمات وفرايض على كل بشر أشد تحريما من معاصي الجوارح وأهم افتراضا من فرائضها.[1]

ترجمہ: "وہ علم لدنی جس کے اہل کو صوفیاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، تو وہ فرضِ عین ہے کیونکہ اس کے فائدے دل کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے ساتھ اشتغال سے پاک کرنا، حضورِ دائمی کے ساتھ اس کو متّصف کرنا، اور نفس کو اخلاقِ رذیلہ سے صاف کرنا ہے جیسے تکبّر، عجب، حسد، دنیا کی محبت، طاعات میں سستی، نفسی خواہشات کو ترجیح دینا، ریاء، سمعت اور اس کے علاوہ دیگر برائیاں اوران بری اخلاق کو اچھے اخلاق کے ساتھ زائل کرنا جیسے توبہ، قضاءِ الٰہی پر رضا، نعمتوں پر شکر اور مصیبتوں پر صبر کرنا اس کے علاوہ اور اچھے اخلاق۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ امور ظاہری

[1] التفسير المظهري، سورة التوبة، رقم الاية: ١٢٢ ج٤ ص٣٢٤.

اعضاء کے گناہوں سے زیادہ سخت حرام ہے اور ہر شخص پر ظاہری اعضاء کے فرائض میں سے یہ زیادہ اہم فرائض ہے"۔

قاضی محمد تھانوی کی رائے

علامہ قاضی محمد تھانوی صاحب رحمہ اللہ بعض مشائخ کی بات نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

يقول كبار مشايخ أهل الباطن: إنه يجب بعد تحصيل علم المعرفة والتوحيد والفقه والشرائع أن يتعلّم (السّالك) علم آفات النّفس ومعرفتها وعلم الرياضة، ومكايد الشيطان للنفس وسبل الاحتراز منها.[1]

ترجمہ: "بڑے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ: علم توحید، فقہ، معرفت اور علم شرائع کے حاصل کرنے کے بعد نفس کے آفات اور اس کی ریاضت کا علم سیکھنا واجب ہے اور شیطان کا نفس کو دھوکہ دینے اور اس سے بچنے کے راستے"۔

اہمیتِ تصوف کے پانچ مختلف پہلوؤں

اہلِ علم اور ارباب فضل وکمال ہمیشہ اس فن کی اہمیت واضح کرتے چلے آئے ہیں، یہاں تک کہ جن حضرات اہل علم تصوف کے ناقدین میں شمار کیا جاتا ہے، ان سے بھی اس فن کی اہمیت اور اس سے وابستہ اصحاب فضل وسعادت افراد کی تعریفیں منقول ہیں جو اس باب کی کھلی شہادت ہے کہ ان حضرات کو خود تصوف سے صوفی ہونے سے انکار مقصود نہ تھا بلکہ اس باب میں در آنے والے

[1] كشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، علم السلوك، ج۱ص ۴۲.

بعض منکرات وبدعات وغیرہ کی تردید اور سد باب کرنا مطلوب تھا جو اہل علم کا فرض منصبی ہے۔

ائمہ اہل علم اور علماء سلف کے نزدیک تصوف وسلوک اوراس راہ سے گزرنے کی کیا کچھ قدر واہمیت تھی؟ درج ذیل نکات سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

ا: حضرات سلف قدم بقدم باطنی امور واحوال میں، جن کی اصلاح ودرستگی کے تدابیر جاننے اور اختیار کرنے کے لئے فن تصوف وجود میں آیا ہے، کالحاظ رکھتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ باطنی احکام واعمال میں غفلت وکوتاہی سے شکار نہ ہو جائیں، وہ جس طرح ظاہری گناہوں اور معاصی سے اپنے دین وایمان کا دامن بچانے کی فکر کرتے تھے یوں ہی باطنی منکرات وآفات سے محفوظ رہنا بھی ان کا ملحوظ خاطر اور مد نظر ہوتا تھا۔ یہ ایک دو افراد کی بات ہے نہ ہی دو تین مواقع واحوال کا قضیہ تھا۔ بلکہ مجموعی لحاظ سے ان حضرات کا یہی تعامل رہا۔

علامہ ابن خلدون جیسا ماہر مؤرخ نقل کرتے ہیں:

هذا العلم من العلوم الشّرعيّة الحادثة في الملّة وأصله أنّ طريقة هؤلاء القوم لم تزل عند سلف الأمّة وكبارها من الصّحابة والتّابعين ومن بعدهم طريقة الحقّ والهداية وأصلها العكوف على العبادة والانقطاع إلى الله تعالى والإعراض عن زخرف الدّنيا وزينتها، والزّهد فيما يقبل عليه الجمهور من لذّة ومال وجاه والانفراد عن الخلق في الخلوة للعبادة وكان ذلك عامّا في الصّحابة والسّلف. فلمّا

فشا الإقبال على الدّنيا في القرن الثّاني وما بعده وجنح النّاس إلى مخالطة الدّنيا اختصّ المقبلون على العبادة باسم الصّوفيّة والمتصوّفة.[1]

ترجمہ:"علمِ تصوف علومِ شرعیہ میں ایک جدید فن ہےاس کا اصل یہ ہے کہ صوفیاء کرام کا یہ طریقہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ اوران کے بعد سے حق وہدایت کا راستہ چلا آرہاہے،اس کی بنیاد اللہ تعالی کی طرف یکسو ہوکرعبادت میں مگن رہنااور دنیاکی زیب و زینت سے منہ موڑنا،لذت ،مال اورشہرت سے بے رغبتی کرنااور مخلوق سے عبادت کے لئے یک طرف ہوناہے یہ باتٍ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین میں عام تھی،دوسری صدی میں اور اس کے بعد جب دنیاکی طرف لوگوں کامیلان عام ہوگیااور لوگ مادیت کی طرف جھک گئےتوعبادت میں مگن لوگٍ صوفیاء کہلانے لگے"۔

۲:انہی ائمہ اہل علم میں سے ایک خاصی تعداد ان حضرات کی بھی ہے کہ تحصیلِ علم سے رسمی فرغت کے بعد تصوف وسلوک کو بھی ایک حد تک مشغلہ روز گار بنایار کھا اور جب تک بقدرِ ضرورت اصلاح وتہذیب کی منزل تک رسائی نہیں ہوئی،اس ووقت تک وہ کسی اللہ والے کے در پر پڑے رہیں۔ بہت مرتبہ یہ عجوبہ روز گار بھی دیکھنے کو ملا کہ شہرت وناموری کا آفتاب اور علم وکمال کا ماہتاب ایک عام شخص کی خدمت میں پڑا اس کی جوتیاں اٹھارہاہے جس کو شہرت وناموری سے کوئی واسطہ تھا اور نہ ظاہری علوم وفنون سے کوئی خاص واقفیت تھی۔ ظاہر

[1] مقدمة تاريخ ابن خلدون، الفصل السابع عشر في علم التصوّف،ج١ص٦١١.

ہے کہ اتنی دشوار گزار گھاٹی کو عبور کرنااور اس قدر تلخ قدم اٹھانااس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ جس چیز کے حاصل کرنے کے لئے یہ ساری کاروائی کی جارہی ہو ،اس کی غیر معمولی اہمیت اور بیش بہاقدروقیمت دل میں موجزن ہو۔

۳: بہت سے اہلِ علم اور ارباب فضل نے اس کو ضروری، واجب اور بعض نے فرض قرار دیا۔ دینی لحاظ سے سب سے اہم چیز فرض اور پھر اس کے ساتھ ساتھ واجب وضروری ہے، دینی نقطہ نظر سے اگر کسی چیز کی اہمیت وافادیت بتلانی ہو تو اس کا بڑا درجہ یہی ہے کہ یہ فرض ہے کیونکہ فرض واجب احکام کا انسان خواہی نخواہی پابند ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ احکام لگانا نہایت اہمیت کی دلیل ہے۔

۴: بہت سے اکابر اہلِ علم ان لوگوں پر اظہار افسوس کرتے ہیں جن کو اس راستہ سے گزرنے کا اتفاق نہ ہوا، ان کی مذمت کرتے ہیں اور متنوع طریقوں سے ان کو اس راستہ پر چلنے کی طرف جھکاتے اور متوجہ کرتے ہیں۔ حصولِ علم اور پھر علمی مصروفیات ومشاغل کے باوجود جس کام کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت محسوس کی جائے اور محسوس کرنے والے بھی مسند علم کے رونق اور اقلیمِ علم کے بادشاہ ہوں تو اس سے یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے کہ واقعی یہ کام انتہائی توجہ واہتمام کا لائق ہے جس سے غفلت برتنا کسی طرح مستحسن نہیں ہے۔

۵: اکابر اہل علم کے نزدیک مقاصدِ تصوف وسلوک کوئی ثانوی درجہ کی چیزیں نہیں تھیں بلکہ ان کے ہاں یہ پہلو بہت قابل توجہ اور لائق اہتمام سمجھا جاتا تھا۔ اسی کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ بعض اصولی کتابوں میں بھی اس کو ذکر کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ "جمع الجوامع" اصول فقہ کا مشہور وجامع متن ہے جس کے مصنف

علامہ تاج الدین عبد الوہاب سبکی رحمہ اللہ ہے۔اس کے خاتمہ میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

(و) نرىٰ (أن طريق الشيخ) أبي القاسم (الجنيد) سيد الصوفية علما وعملا (وصحبه طريق مقوم) فإنه خال عن البدع دائر علىٰ التسليم والتفويض والتبري من النفس.[١]

ترجمہ:"اور ہم علم وعمل میں صوفیاء کے سردار حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ اوران کے ساتھیوں کاراستہ درست اورسیدھا سمجھتے ہیں،کیوں کہ وہ بدعتوں سے خالی ہے،فرماں برداری پر دائرہے اور نفس کی تابعداری سے بری ہے"۔

☆☆☆☆☆☆☆

---

[١] جمع الجوامع مع شرح الجلال المحلي،ج٢ص٤٩١.

- ✓ باب دوم: قلب سے متعلق دینی احکام اور اخلاق
- ✓ دل سے متعلق شرعی احکام
- ✓ مذموم صفات کی تعداد
- ✓ اخلاق میں تبدیلی
- ✓ اخلاق کے باب میں خیر وشر کے پیمانے
- ✓ حصول اخلاق کے طریقے ماہرین کی نظر میں
- ✓ علمی اور نظریاتی علاج
- ✓ تہذیب اخلاق کے پانچ نکاتی تدبیر
- ✓ مخالفت نفس، اہمیت وافادیت
- ✓ فلاسفہ کے ہاں حصول اخلاق کے پانچ طریقے
- ✓ تصوف اور اخلاق حسنہ کی تکمیل
- ✓ ظاہری اور باطنی اعمال کا باہم ربط وتعلق

باب دوم:

قلب سے متعلق دینی احکام اور اخلاق

قلب اور اس کے صلاح و فساد کی اہمیت

انسانی بدن ایک چھوٹی سی کائنات (عالمِ اصغر) کے مانند ہے، اس کائنات میں دل کا جو مقام و اہمیت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ اس کی حیثیت حاکم کی سی ہے جبکہ دیگر اعضاء و جوارح خدام کے مانند چاہے نہ چاہے اس کے فرمانبردار ہیں۔ یہ بے تاج بادشاہ اگر کسی عمل کا اثر نہ لے اور اس کو قبول و منظور نہ کرے تو گو دیگر اعضاء سے وہ کام صادر بھی ہو جائے لیکن ایسا کام کچھ زیادہ مفید اور مؤثر نہیں ہو سکتا، عمل میں رسوخ، پختگی اور تاثیر پیدا کرنے کے لئے اس بااختیار بادشاہ کی منظوری ضروری ہے۔ یہ تو ظاہری اعمال سے متعلق اس کی عملداری کا حال ہے۔

جہاں تک ایمان و کفر، اللہ تعالیٰ سے محبت و لگاؤ اور کفر و طاغوت سے نفرت و بھگاؤ اور اس کے علاوہ عقائد و نظریات کا سوال ہے تو اس کا تو اصل مرکز و محل ہی یہی قلب ہے، یہی اچھے برے اعتقادات و نظریات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ یہیں متنوع قسم کے اخلاق و جذبات موجزن رہتے ہیں، اسی جگہ بھلے و برے اعمال و کردار کے فیصلے ہوتے ہیں۔

شریعت مطہرہ سے بھی یہ راز پوشیدہ نہ تھا، اس لئے نصوص میں "دل" کی بڑی اہمیت بیان فرمائی گئی ہے اور بہت سی جگہوں میں مختلف نیک اور بد اعمال کو اس کی طرف منسوب فرمایا گیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دینِ متین نے جس

طرح کائنات کی اس مختصر سی تصویر کے دیگر پرزوں کے متعلق کچھ احکام دئے ہیں اور انسانی اعضاء وجوارح کو مختلف باتوں کا پابند بنایا گیا ہے یوں ہی دل بھی انہی اعضاء کی مانند ایک اہم اور بنیادی عضو ہے اور شریعت مبارکہ نے اس کو بھی بالکل بے لگام نہیں چھوڑا بلکہ بگاڑ وفساد سے بچانے اور کمال وصلاح تک پہنچانے کے لئے جس قدر باتوں کی ضرورت تھی، پوری تفصیل وتوضیح کے ساتھ دل کو ان تمام ضروری باتوں کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔

قلب سے متعلق چند قرآنی آیات

سورۃ "البقرۃ" میں ہے:

{فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا}.[۱]

ترجمہ: "ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھادی اللہ نے ان کی بیماری"۔

سورۃ "آل عمران" میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

{فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ}.[۲]

ترجمہ: "سو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے"۔

سورۃ "البقرہ" میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

---

[۱] سورۃالبقرۃ،الایۃ: ۱۰.

[۲] سورۃآل عمران،الایۃ:۷.

{وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ }.[1]

ترجمہ: "اور مت چھپاؤ گواہی کو اور جو شخص اس کو چھپاوے تو بیشک گنہگار ہے دل اس کا"۔

سورۃ "النساء" کی آیت ہے:

{ أُولَئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا }.[2]

ترجمہ: "یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو ان کے دل میں ہے، سو تو ان سے تغافل کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے حق میں بات کام کی"۔

سورۃ "المائدۃ" میں ہے:

{يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّاعُونَ لِقَوْمٍ آخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا أُولَئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ}.[3]

ترجمہ: "اے رسول غم نہ کر ان کا جو دوڑ کر گرتے ہیں کفر میں وہ لوگ جو کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں اپنے منہ سے اور ان کے دل مسلمان نہیں اور وہ جو یہودی ہیں جاسوسی

---

[1] سورۃالبقرۃ،الایۃ: ٢٨٣.

[2] سورۃالنساء،الایۃ: ٦٣.

[3] سورۃالمائدۃ،الایۃ: ٤١.

کرتے ہیں جھوٹ بولنے کے لئے وہ جاسوس ہیں دوسری جماعت کے جو تجھ تک نہیں آئی بدل ڈالتے ہیں بات کو اس کا ٹھکانا چھوڑ کر کہتے ہیں اگر تم کو یہ حکم ملے تو قبول کر لینا، اور اگر یہ حکم نہ ملے تو بچتے رہنا اور جسکو اللہ نے گمراہ کرنا چاہا سو تو اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا اللہ کے ہاں یہ وہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے نہ چاہا کہ دل پاک کرے ان کے، ان کو دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے"۔

سورۃ "الانعام" میں ہے:

{فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ}.[١]

ترجمہ: "پھر کیوں نہ گڑگڑائے جب آیا ان پر عذاب ہمارا، لیکن سخت ہو گئے دل ان کے اور بھلے کر دکھلائے ان کو شیطان نے جو کام وہ کر رہے تھے"۔

سورۃ "الانفال" میں ہے:

{إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ }.[٢]

ترجمہ: "ایمان والے وہی ہیں کہ جب نام آئے اللہ کا ڈر جائیں ان کے دل"۔

سورۃ "التوبہ" کی آیت ہے:

{فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ}.[٣]

---

[١] سورة الأنعام، الاية: ٤٣.

[٢] سورة الأنفال، الاية: ٢.

[٣] سورة التوبة، الاية: ٧٧.

ترجمہ: "پھر اس کا اثر رکھ دیا نفاق ان کے دلوں میں جس دن تک کہ وہ اس سے ملیں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف کیا اللہ سے جو وعدہ اس سے کیا تھا اور اس وجہ سے کہ بولتے تھے جھوٹ"۔

سورۃ "یونس" میں ہے:

{رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ }.[١]

ترجمہ: "اے رب اس واسطے کہ بہکائیں تیری راہ سے، اے رب مٹا دے ان کے مال اور سخت کر دے ان کے دل کہ نہ ایمان لائیں جب تک دیکھ لیں عذاب دردناک"۔

سورۃ "الرعد" کی آیت ہے:

{الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ}.[٢]

ترجمہ: "مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے"۔

سورۃ "الکہف" میں ہے:

{ وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهِ إِلَٰهًا لَقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا}.[٣]

---

[١] سورةيونس،الاية: ٨٨.

[٢] سورةالرعد،الاية: ٢٨.

[٣] سورةالكهف،الاية: ١٤.

ترجمہ: "اور گرہ دی ان کے دل پر جب کھڑے ہوئے پھر بولے ہمارا رب ہے رب آسمان کا اور زمین کا، نہ پکاریں گے ہم اس کے سوائے کسی کو معبود، نہیں تو کہی ہم نے بات عقل سے دور"۔

اسی سورۃ میں ایک اور جگہ پر ہے:

{وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا}.[١]

ترجمہ: "اور نہ کہا مان اس کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے، اور پیچھے پڑا ہوا ہے اپنی خواہش کے اور اس کا کام ہے حد پر نہ رہنا"۔

سورۃ "الانبیاء" میں ہے:

{اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُعْرِضُونَ (١) مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ (٢) لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ}.[٢]

ترجمہ: "نزدیک آگیا لوگوں کے ان کے حساب کا وقت اور وہ بیخبر ٹلا رہے ہیں۔ ان کے رب کی طرف سے سمجھانے کے لیے کوئی ایسی نئی بات ان کے پاس نہیں آتی کہ جسے سن کر ہنسی میں نہ ٹال دیتے ہوں۔ ان کے دل کھیل میں لگے ہوئے ہیں"۔

سورۃ "الشعراء" میں ہے:

{ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ (٨٧) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ (٨٨) إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ }.[٣]

---

[١] سورةالكهف،الاية: ٢٨.

[٢] سورةالأنبياء،الاية: ١ — ٣.

[٣] سورةالشعراء،الاية: ٨٧ — ٨٩.

ترجمہ: "اور رسوانہ کر مجھ کو جس دن سب جی کر اٹھیں، جس دن نہ کام آئے کوئی مال اور نہ بیٹے، مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لے کر دل چنگا"۔

سورۃ "المؤمنون" میں ہے:

{وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ}.[1]

ترجمہ: "اور جو لوگ کہ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل ڈر رہے ہیں اس لئے کہ ان کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔

سورۃ "الزمر" کی آیت ہے:

{أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِنْ رَبِّهِ فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ}.[2]

ترجمہ: "بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ نے دین اسلام کے واسطے سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے، سو خرابی ہے ان کو جن کے دل سخت ہیں اللہ کی یاد سے وہ پڑے پھرتے ہیں بھٹکتے صریح"۔

سورۃ "الحجرات" میں ہے:

{إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ}.[3]

---

[1] سورةالمؤمنون،الاية: ٦٠.

[2] سورةالزمر،الاية: ٢٢.

[3] سورةالحجرات،الاية: ٣.

ترجمہ:"جو لوگ دبی آواز سے بولتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس وہی ہیں جن کے دلوں کو جانچ لیا ہے اللہ نے ادب کے واسطے ان کے لیے معافی ہے اور ثواب بڑا"۔

سورۃ "الحدید" میں ارشاد ہے:

{أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ }.[١]

ترجمہ:"کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کو کہ گڑ گڑائیں ان کے دل اللہ کی یاد سے اور جو اترا ہے سچا دین اور نہ ہوں ان جیسے جن کو کتاب ملی تھی اس سے پہلے پھر دراز گزری ان پر مدت پھر سخت ہو گئے ان کے دل اور بہت ان میں نافرمان ہیں"۔

سورۃ "الصف" کی آیت ہے:

{ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ}.[٢]

ترجمہ:"پھر جب وہ پھر گئے تو پھیر دیئے اللہ نے ان کے دل اور اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو"۔

سورۃ "التغابن" میں ہے:

{مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ }.[٣]

---

[١] سورۃالحدید،الایۃ: ١٦.

[٢] سورۃالصف،الایۃ: ٥.

[٣] سورۃالتغابن،الایۃ: ١١.

ترجمہ: "نہیں پہنچتی کوئی تکلیف بدون حکم اللہ کے اور جو کوئی یقین لائے اللہ پر وہ راہ بتلائے اس کے دل کو اور اللہ کو ہر چیز معلوم ہے"۔

سورۃ "المطففین" میں ہے:

{ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ }.[1]

ترجمہ: "کوئی نہیں پر زنگ پکڑ گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے"۔

یہ تقریباً بیس آیات ہیں، ان جیسی دیگر آیتیں بھی ہیں لیکن استیعاب مقصود نہیں ہے اس لئے انہی پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

دل سے متعلق چند روایات مبارکہ

احادیثِ مبارکہ میں تو یہ مضامین بہت ہی کثرت کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں، ان سب کا ذکر کرنا تو نہایت طوالت کا موجب ہو گا، اس لئے یہاں محض دو چار روایات مبارکہ کے ذکر کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

"صحیح بخاری" میں ہے:

عن عامر، قال: سمعت النعمان بن بشير، يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: " الحلال بين، والحرام بين، وبينهما مشبهات لا يعلمها كثير من الناس، فمن اتقى المشبهات استبرأ لدينه وعرضه، ومن وقع في الشبهات: كراع يرعى حول الحمى، يوشك أن يواقعه، ألا وإن لكل ملك حمى، ألا إن حمى الله في أرضه

---

[1] سورة المطففين، الاية: ١٤.

محارمه، ألا وإن في الجسد مضغة: إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله، ألا وهي القلب ".[1]

ترجمہ: "حضرت عامرؒ سے روایت ہے، آپ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے سنا، انہوں نے بیان فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے تھے کہ: حلال ظاہر ہے، اور حرام ظاہر ہے، اور ان دونوں کے درمیان میں شبہ کی چیزیں ہیں کہ جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے، پس جو شخص شبہ کی چیزوں سے بچے اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچالیا، اور جو شخص مشتبہ اشیاء میں مبتلا ہو جائے (اس کی ایسی مثال ہے)، جیسے: کہ جانور چراہ گاہ کے قریب چر رہا ہو، جس کے متعلق اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر بھی داخل ہو جائے، آگاہ ہو جاؤ کہ ہر بادشاہ کی ایک چراہ گاہ ہے، آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی چراہ گاہ اس کی زمین میں اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں، آگاہ ہو جاؤ کہ بدن میں ایک ٹکڑا گوشت کا ہے: جب وہ سنور جاتا ہے تو تمام بدن سنور جاتا ہے، اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو تمام بدن خراب ہو جاتا ہے، خبر دار ہو جاؤ وہ ٹکڑا دل ہے"۔

" صحیح مسلم " میں ہے:

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «لا تحاسدوا، ولا تناجشوا، ولا تباغضوا، ولا تدابروا، ولا يبع بعضكم على بيع بعض، وكونوا عباد الله إخوانا المسلم أخو المسلم،

---

[1] صحيح البخاري، باب فضل من استبرأ لدينه. ج١ص٢٠.

لا يظلمه ولا يخذله، ولا يحقره التقوىٰ هاهنا» ويشير إلىٰ صدره ثلاث مرات.[1]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: تم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ حسد نہ کرو، اور نہ ہی تناجش کرو (تناجش اس کو کہتے ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کی قیمت بڑائے اور اس کا لینے کا ارادہ نہ ہو، بلکہ کسی دوسرے شخص کو سنانے کے لئے ایسا کرے، تاکہ وہ زیادہ قیمت پر خریدے)، اور نہ ہی ایک دوسرے سے بغض رکھو، اور نہ ہی ایک دوسرے سے روگردانی کرو، اور تم میں سے کوئی کسی کی بیع پر بیع نہ کرے، اور اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے ذلیل کرتا ہے، اور نہ ہی اسے حقیر سمجھتا ہے، آپ ﷺ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا تقوی یہاں ہے"۔

"صحیح مسلم" میں ہے:

عن علقمة، عن عبد الله بن مسعود، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر» قال رجل: إن الرجل يحب أن يكون ثوبه حسنا ونعله حسنة، قال: «إن الله جميل يحب الجمال، الكبر بطر الحق، وغمط الناس».[2]

---

[1] صحيح مسلم ،كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم، وخذله، واحتقاره ودمه، وعرضه، وماله. ج٤ص١٩٨٦.

[2] صحيح مسلم،كتاب الإيمان،باب تحريم الكبر وبيانه،ج١ص٩٣.

ترجمہ:"عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا، اس پر ایک آدمی نے عرض کیا کہ: ایک آدمی چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کی جوتی بھی اچھی ہو، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ جمیل ہے اور جمال ہی کو پسند کرتا ہے، تکبر تو حق کی طرف سے منہ موڑنے، اور دوسرے لوگوں کو کمتر سمجھنے کو کہتے ہیں"۔

یہاں ان تمام نصوص کا احاطہ کرنا مقصود نہیں جن میں گناہ وثواب، سعادت وشقاوت وغیرہ صفات واخلاق کو دل کے ساتھ جوڑا گیا ہے یا ان جیسے اعمال واخلاق میں قلب کی اہمیت وتاثیر ذکر کی گئی ہے۔ان نصوص سے بہت کچھ مسائل واحکام مستفاد ہوتے ہیں اور تصوف وسلوک کی مشکل گھاٹیوں کے دسیوں عقدے بھی یہی سے ہموار ہو جاتے ہیں، ان تمام چیزوں کا ذکر کرنا بھی یہاں موضوع بحث نہیں ،اگر کوئی صاحب علم اس موضوع پر اختصاصی کام کا بیڑا اٹھائے تو اس کا بڑا فائدہ ہو گا۔

نصوص سے حاصل ہونے والے چند مسائل

بہر حال درج بالا نصوص سے بطورِ نمونہ درج ذیل باتیں معلوم ہو جاتی ہیں:

ا:شریعت کی نظر میں دل کوئی عضوِ بے کار اور جزءِ معطل نہیں ہے بلکہ متعدد احکام اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۲:ایمان وکفر، اخلاص وریاء، محبت ونفرت، تقویٰ وطہارت وغیرہ بہت سی چیزوں کا تعلق اسی قلب کے ساتھ ہے۔

۳:انسانی بدن کے صلاح وفساد اور بناؤ وبگاڑ کی بنیاد یہی دل ہے، اس کے صلاح ودرستگی سے سارا بدن اور بدن کے تمام اعضاء کا قبلہ درست ہو جاتا ہے اور اس کے فساد وبگاڑ سے تمام اعضاء بے راہ روی اور معاصی ومنکرات کے مرتکب بن جاتے ہیں۔

۴:دل بھی گناہ کرتا ہے اور وہ بھی گناہ گار بن سکتا ہے۔

۵:دل کی سختی وقساوت خشوع اور تضرع پیدا ہونے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ دل کی بے راہ روی کی وجہ سے بہت سے نیک کاموں سے محرومی پیدا ہو جاتی ہے۔

۶: گمراہی کا محل دل ہے

۷:اہلِ ایمان کی ایک اچھی اور لائق تعریف صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد کے وقت ان کے دل ڈرتے ہیں۔ ڈرنے کا تعلق دل کے ساتھ ہے اور یہ کیفیت شریعت کی نظر میں محمود وممدوح ہے۔

۸:بعض اعمالِ بد کی نحوست ہوتی ہے کہ انسان کے دل میں ان کی وجہ سے نفاق پیدا ہو جاتا ہے، نفاق کا مرکز بھی دل ہے۔

۹:دل کی سختی کا ایک درجہ ایسا بھی ہے کہ اس کے بعد ایمان کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ دلی قساوت ایمان سے محرومی کا باعث ہے۔

۱۰:بعض خوش نصیب لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ مضبوط فرمادیتے ہیں جس سے ان کے اقوال واعمال میں پختگی اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے بعد وہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتے۔

۱۱: بعض لوگوں کے دل کو اللہ تعالیٰ اپنے ذکر سے غافل کر دیتے ہیں جس سے ان کے اعمال میں بھی بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۲: کفار وفجار کے دل اللہ تعالیٰ سے غافل ہوتے ہیں جو کہ مذموم، فساد اور بد عملی کی بنیاد ہے۔ دل کی غفلت شریعت کی نظر میں مذموم اور ناپسندیدہ لوگوں کی خصلت ہے۔

۱۳: قیامت کے دن وہی شخص نجات پا سکتا ہے جو سلیم دل لے کر حاضر ہو۔ نجات اخروی کے لئے سلامتی قلب کا بھی اعتبار کیا جائے گا، اب اگر دل کی سلامتی اس معنیٰ میں نہ ہو کہ اس میں شرک وکفر کا مادہ موجود ہو تو بالکل نجات نصیب نہیں ہوگی اور اگر کفر کی گندگی سے تو محفوظ ہو لیکن گناہ ومعصیت کی گندگیوں سے آلودہ ہو تو ایسا شخص کامل نجات پانے کا مستحق نہیں ہوگا۔

۱۴: اسلام اور اسلامی احکام پر شرح صدر کا نصیب ہو جانا اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، جن لوگوں کے دل سخت ہیں، وہ کھلی گمراہی کے شکار ہیں۔

۱۵: اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس شخص کو ہدایت نصیب ہونے کا ارادہ کیا جاتا ہے، اس کو دینی احکام پر شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے اور جس شخص کی تقدیر میں گمراہ ہونا لکھا جاتا ہے، اس کا دل خوب تنگ ہو جاتا ہے۔ دینی احکام پر شرح صدر کا ہونا ہدایت کی نشانی اور اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے جبکہ اس حوالہ سے دلی تنگی اور وحشت کا ہونا گمراہی کی علامت اور اپنے اعمال بد کی سزا ہے۔

۱۶: تقویٰ کا محل دل ہے اور اسی کا امتحان لیا جاتا ہے۔

۱۷: عملی طور پر شریعت کی خلاف ورزی اور معاصی کے ارتکاب کرنے کی وجہ سے دل میں کجروی پیدا ہو جاتی ہے جو فسق کا ایک بڑا درجہ ہے اور ایسے فاسق کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔

۱۸: ہدایت کا تعلق بھی دل کے ساتھ ہے، جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت نصیب فرماتے ہیں جس سے کا دل ہدایت یافتہ بن جاتا ہے۔

۱۹: کسب واعمال کی بے راہ روی کی وجہ سے دل پر زنگ لگ جاتا ہے اوراس کی وجہ سے حق قبول کرنے کی توفیق نہیں ملتی، ایسے افراد قبول حق سے اعراض کی مختلف توجیہات بیان کرتے ہیں لیکن در حقیقت اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ دل میں قبول حق کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رہ پاتی۔

دل سے متعلق شرعی احکام

دل سے متعلق شرعی احکام کی دو قسمیں ہیں:

الف: وہ صفات واخلاق جن سے دل کو پاک وصاف رکھنا ضروری ہے۔

ب: وہ صفات واخلاق جن سے دل کی دنیا کو آراستہ کرنا ضروری ہے۔

پہلی قسم کی باتوں کو "اخلاق ذمیمہ" اور "صفات مذمومہ" کہا جاتا ہے جبکہ دوسری قسم کے احکام کو" اخلاق حسنہ" اور "صفات مطلوبہ" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تصوف کی کتابوں میں عام طور پر پہلے مذموم صفات کو ذکر کیا جاتا ہے اوراس کے بعد اخلاق حسنہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے کیونکہ طاعات کرنے کی بنسبت گناہوں سے بچنا زیادہ اہم اور مفید ہے، نیز یہ مذموم ومطلوب صفات واخلاق باہم متضاد ہیں، لہٰذا

مذموم اخلاق کو درست کرنے کے ساتھ اچھے اخلاق کسی نہ کسی درجے میں حاصل ہو ہی جاتے ہیں۔

مذموم صفات کی تعداد

مذموم اخلاق کتنے ہیں؟ان کی تعداد کتنی ہے؟اور کون کونسی چیزیں اس کے تحت داخل ہیں؟تصوف واخلاق کی کتابوں میں اس کی مختلف تعداد مذکور ہے، حضرت امام غزالی رحمہ اللہ نے تصوف کے موضوع پر جو گران قدر ذخیرہ چھوڑا ہے،اس میں عموماً دس مذموم صفات اور دس مطلوب و مستحسن صفات واخلاق ذکر کئے جاتے ہیں، علامہ بِرکوی رحمہ اللہ اپنی مفید کتاب" طریقہ محمدیہ" میں فرماتے ہیں کہ میں نے تلاش وتتبع کیا تو (صرف) اخلاق مذمومہ کی تعداد ساٹھ (٦٠) پہنچ گئی[1]۔علامہ عبدالرؤوف مناوی رحمہ اللہ نے بعض علماء کرام سے اخلاق حسنہ کی ایک طویل فہرست نقل کی ہے جس میں انہوں نے تمام اخلاق حسنہ کو یکجا جمع کرنے کی کوشش فرمائی ہیں،اس فہرست میں درج شدہ صفات وافعال کی تعداد سو(١٠٠)سے زیادہ ہے۔[2]

پھر بعض محقق اہل علم نے حصر وضبط جیسے فوائد حاصل کرنے کے لئے اس تعداد کو مزید مختصر کرنے کی کوشش فرمائی ہے،چنانچہ حضرت امام غزالی رحمہ اللہ

---

[1] الطريقة المحمدية، القسم الثاني: الأخلاق المذمومة،ص١٦١. ونقله العلامة الخادمي في " البريقة المحمودية" أيضا، راجع ج٢ص١٨٢.

[2] فيض القدير،حرف الحاء،ج٣ص٣٨٦.

اپنی تحقیق ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اچھے اخلاق وفضائل اگرچہ بہت ہیں تاہم چار صفات میں اس کو سمیٹا جاسکتا ہے:

۱: حکمت۔ ۲: شجاعت۔ ۳: عفّت۔ ۴: عدالت۔[1]

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اچھے اخلاق یو تو بہت ہیں لیکن چار صفات میں ان کو جمع کیا جاسکتا ہے: ۱: صبر۔ ۲: عفت۔ ۳: شجاعت۔ ۴: عدل۔ اسی طرح تمام برے اخلاق اور مذموم صفات کو ان چار میں اخلاق میں سمیٹا جاسکتا ہے: ۱: جہل۔ ۲: ظلم۔ ۳: شہوت۔ ۴: غضب۔[2]

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی صاحب رحمہ اللہ تصوف واحسان کا خلاصہ چار صفات کو قرار دیتے ہیں: ۱۔ طہارت۔ ۲: اخبات اور انابت الی اللہ۔ ۳: سماحت۔ ۴: عدالت۔ اور پھر دیگر تمام صفات حمیدہ کو انہی چار اقسام میں سے کسی قسم کے تحت داخل فرمایا۔[3] مشہور فلسفی شیخ احمد مسکویہ نے بھی اس پر اپنے انداز میں کچھ روشنی ڈالی ہے۔[4]

لیکن یہ کوئی حقیقی اور اساسی نوعیت کا اختلاف نہیں ہے کہ مثلاً جو لوگ دس صفات کے قائل ہیں وہ ان پچاس صفات کی مذمت کے قائل نہ ہوں جو طریقہ محمدیہ وغیرہ کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں۔ بلکہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بعض

---

[1] میزان العمل، بیان أمهات الفضائل، ص: ٢٦٤.

[2] مدارج السالكين بين منازل إياك نعبد وإياك نستعين، فصل منزلة الخلق، ج٢ص ٢٨٩.

[3] حجة الله البالغة: أبواب الإحسان، ج٢ص١٨٢.

[4] ملاحظہ ہوا ان کی کتاب: تهذيب الأخلاق وتطهير الأعراق.

حضرات کے پیش نظر استیعاب واحاطہ ہوتا ہے جبکہ بعض حضرات کا یہ مقصود نہیں ہوتا، اسی طرح بعض حضرات ہر مذموم صفت کو الگ صفت وعنوان سے ذکر کرتے ہیں تاکہ اس کا اہتمام ہوجائے جبکہ دوسرے حضرات مجموعی صفات واخلاق پر غور وخوض کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان میں سے متعدد صفات واخلاق ایسی ہیں جن کا باعث ایک ہوتا ہے یا ان کا مفہوم قریب قریب ہوتا ہے تو کسی جامع عنوان کے تحت ان سب کو جمع کرکے ایک صفت کے طور پر اس کو ذکر کیا جاتا ہے، ان جیسے عناصر کی وجہ سے تعداد میں ظاہری اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔

کیا اخلاق میں تبدیلی اختیاری ہے؟

شریعت انسان کو انہی احکام کا مکلف بناتی ہے جو اس کے دائرہ قدرت میں داخل ہو، جو چیزیں انسان کے اختیار میں نہ ہو، ان کا اس کو مکلف بھی نہیں بناتی۔ یہ شریعت اسلامیہ کا مسلم ضابطہ ہے۔ یہ نظریاتی اختلاف تو بعض اصولی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ شریعت کسی ایسے کام کا حکم دیدے جو انسان کے دائرہ قدرت سے باہر ہو یا نہیں؟ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ عملی طور پر شریعت میں ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔

اس معقول ومسلم ضابطہ کی روشنی میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ اخلاق تو ایک طبعی وفطری چیز ہے جو انسان کے دائرہ استطاعت میں نہیں ہے، ایک شخص کی طبیعت میں غصہ، بخل وکنجوسی ہوتی ہیں اور دوسرا فطری طور پر بردبار اور سخی وکریم واقع ہوتا ہے، یوں ہی کسی کی طبیعت میں محبت ومودت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اور کسی کے ہاں نفرت ووحشت کی بہتات ہوتی ہے لیکن یہ صفات وجذبات اپنے کسب سے

حاصل نہیں ہوتے بلکہ طبعی طور پر ہی یہ موجود ہوتے ہیں، بخل وغصہ اور نفرت وحسد میں مبتلا شخص بسا اوقات اپنی ان عادات سے ہزار درجہ نالاں ہوتا ہے اور بڑی کوشش کرتا ہے کہ کس طرح ان چیزوں سے جان چھوٹ کر متضاد اچھے اخلاق حاصل کرے لیکن ناکام رہتا ہے اور وہی صفات جوں کے توں برقرار رہتے ہیں ۔ اسی مناسبت سے علم الاخلاق کے ماہرین اس کو"غرائز"سے تعبیر فرماتے ہیں کہ گویا کہ یہ چیزیں انسانی طبیعت کے اندر گاڑھ کر پیوست کی گئی ہیں جس کو مکمل طور پر نکالنا یا تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اب جب اخلاق کا یہ حال ہے کہ وہ انسان کی فطرت میں ودیعت رکھے جاتے ہیں اوراس کے کسب واختیار کے تحت داخل ہی نہیں ہوتے، تو بے چارے انسان کو کیونکر اس کا مکلف بنایا جاسکتا ہے !اور کس طرح اس کو یہ ضروری حکم دیا جاتا ہے کہ اخلاق حسنہ کو حاصل کرے اور اخلاق مذمومہ سے اپنی روح ودل کو پاک وصاف رکھے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ " اخلاق " کا لفظ دو چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، کبھی تو ان خیالات وجذبات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو خوشی وغمی وغیرہ ماحول میں انسان کے دل میں جنم لیتے ہیں اور بسا اوقات اس تعامل وبرتاؤ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو دلی جذبات وخیالات کے بعد وجود میں آتا ہے، مثال کے طور پر زید باعزت اور دبدبے کا مالک انسان ہے، اس نے اپنی طبیعت ومزاج کے خلاف خالد کی کوئی حرکت دیکھی تو دل میں اس شخص کے خلاف جذبہ پیدا ہوا کہ اس سے انتقام لے لے اور اپنی چاہت کے خلاف ماحول کا بالکل صفایا کرے اور دل ہی دل میں اس کی مختلف ترکیبیں سوجھنے لگے، اس جذبے کے پیدا ہو جانے کے بعد

یا تو وہ اسی کے مطابق عملی کاروائی کرتا ہے اور خالد کو زدوکوب کرکے اور ذلیل کرکے اپنے جذبے کی تسکین کرتا ہے اور یا کسی وجہ سے خالد سے درگزر کرتا ہے اور چاہت وقدرت کے باوجود برداشت سے کام لیتا ہے۔ یوں ہی ماجد ایک جوان آدمی ہے، کسی نامحرم عورت پر اس کی نظر پڑی اور دل ہی دل میں قضائے شہوت کی مختلف صورتیں اور تقاضے پیدا ہونے لگے، ان جذبات اور تقاضوں کے پیدا ہو جانے کے بعد یا تو اس نے اپنے ان جذبات کو لبیک کہا اور ناجائز طریقوں سے شہوت کی تسکین کی اور یا دل میں ہی ان جذبات کو دباتا رہا اور کسی ایسے کام کا ارتکاب نہیں جس سے شریعت نے اس کو روکا ہو۔

اب ایک تو انتقام لینے اور شہوت پوری کرنے کے یہ اندرونی جذبات ہیں جو زید کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں اور ایک ان جذبات کا استعمال اور ان سے متعلق زید کا عملی برتاؤ ہے، ان دونوں چیزوں کو "اخلاق" سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان میں سے پہلی چیز انسان کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے اور نہ ہی انسان اس کو سدھارنے کا مکلف ہے جبکہ دوسری چیز انسانی قدرت کے تحت یقیناً داخل ہے اور اسی کا اس کو مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ لہٰذا درج بالا صورتوں میں اگر زید کے اندر انتقام لینے یا شہوت پوری کرنے کے دسیوں جذبات وخیالات پیدا ہو جائیں تو بھی یہ مذموم نہیں اور زید اس کی وجہ سے گناہ گار نہیں ہو گا جب تک ان خیالات کو دل میں قصداً نہ جمائے رکھے اور عملی برتاؤ کی حد تک ان جذبات کی تکمیل میں کسی معصیت کا ارتکاب کرنے کی جسارت نہ کرے۔

اسی بات کو متعدد محقق اہل علم نے ایک دوسری طرح تعبیر فرمایا ہے کہ مذموم صفات اور رذیل اخلاق کا ازالہ شریعت کا مقصود نہیں ہے کہ انسان اس حد تک ان جذبات وصفات کا صفایا کرے کہ دل میں اس کا کوئی نشان نہ رہے بلکہ ان کا امالہ کافی ہے یعنیٰ ان جیسی تمام جذبات وصفات کو شریعت کے زیر نگین کر دینا ضروری ہے کہ ان جذبات کے نتیجے میں کسی گناہ ومعصیت کا ارتکاب نہ کرے۔ دسیوں نصوص سے اس جواب کی تائید ہوتی ہے۔"بصائر حکیم الامت" میں ہے:

"اخلاق سب فطری وجبلی ہیں اور درجہ فطرت میں کوئی نہ مذموم ہے نہ محمود، بلکہ مواقع استعمال سے ان میں مدح وذم آجاتی ہے۔"من اعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان" اس میں اعطاء اور منع دونوں کے ساتھ "للہ" کی قید ہے جس سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقا محمود نہیں، نہ بخل مطلقا مذموم، بلکہ اگر خدا کے لئے تو دونوں محمود، ورنہ دونوں مذموم (انفاس عیسیٰ)[1]"۔

بعض اہل علم کی طرف سے دوسرا جواب

بعض اہلِ علم نے اس کا یہ جواب بھی دیا ہے کہ اخلاق وصفات گو فطری وطبعی ہوتے ہیں لیکن اسباب کی اس کائنات میں جس طرح دیگر چیزیں اسباب کے تحت چلتی ہیں یوں ہی اخلاق بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں اور اس کے حاصل کرنے کے لئے مختلف اسباب واسالیب ہوتے ہیں جن کو اختیار کرنے اور ان پر مداومت کرنے سے رفتہ رفتہ اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں، شریعت کے مکلف کرنے کا مطلب انہی جیسے اسباب کو اختیار کرنا ہے۔

---

[1] بصائر حکیم الامت، حقیقت اخلاق وحکم تبدیلی اخلاق وتکلیف، ص ۳۳۴.

مثال کے طور پر زید فطرتاً غصہ ناک پیدا ہوا ہے یا بخل و کنجوسی کا مرض اصل فطرت سے اپنے ساتھ لایا ہے، اب ضروری نہیں کہ یہ مرتے دم تک ہمیشہ غصہ ناک اور بخیل و کنجوس ہی رہے بلکہ اگر چاہے تو اپنی ان صفات واخلاق میں تبدیلی لا سکتا ہے اور چاہے تو بار بار تمرین وریاضت وغیرہ کے سہارے بردباری و تحمل اور جود وسخاوت کی صفت اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کے اندر طبعی طور پر وہ اچھے صفات واخلاق موجود ہوں جن کا انسان کو مکلف بنایا گیا ہے تو یہ اس کی خوش نصیبی ہے اور اگر کسی کے اندر وہ صفات موجود نہ ہوں بلکہ ان کی متضاد اخلاق پر اس کی تخلیق ہوئی ہو، تووہ اس بات کا مکلف ہے کہ چاہے تمرین وریاضت، یا باخلاق وکردار افراد کی صحبت ومعیت وغیرہ کوئی بھی سبب اختیار کرے لیکن بہر حال شریعت کے منشا کے مطابق اپنے اخلاق وصفات سنوارے۔

یہ الگ بات ہے کہ صلاحیت واستعداد کے لحاظ سے انسانوں کی طبیعتوں میں ایسا ہی تفاوت ہے جیسا کہ شکل وصورت کے لحاظ سے ہے، جس طرح ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے انسانیت کی لاکھوں قسمیں ہیں یوں ہی استعداد وصلاحیت کے اعتبار سے بھی انسان لاکھوں قسموں میں تقسیم ہوتا ہے، کسی کی استعداد بہت تیز ہوتی ہے اور وہ جلدی اثر قبول کر کے اخلاق حسنہ حاصل کر لیتا ہے اور کوئی بہت کچھ ریاضات ومجاہدات کرنے کے بعد ہی اس سعادت کو پالیتا ہے جبکہ کوئی متوسط قسم کی صلاحیت رکھنے والا ہوتا ہے۔

یہ جواب بھی متعدد اہل علم نے دیا ہے۔امام ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

واعلم أَن الَّذِي يتصف بِهِ العبد أفعال وأخلاق وأحوال، فالأفعال: تصرفاته باختياره والأخلاق جبلة فِيهِ،ولكن تتغير بمعالجته عَلَىٰ مستمر العادة، والأحوال: ترد عَلَىٰ العبد عَلَىٰ وجه الابتداء لكن صفاؤها بَعْد زكاء الأعمال فِيهِ كالأخلاق من هَذَا الوجه.[١]

ترجمہ: جان لو! کہ بندہ تین چیزوں سے متّصف ہوتا ہے افعال، اخلاق، احوال۔ افعال وہ تصرفات ہیں جو اس کے اختیار سے ہوں اور اخلاق اس میں پیدائشی طور پر ہوتے ہیں، لیکن عبد کے علاج کی وجہ سے عادۃً وہ تبدیل ہو جاتے ہیں، اور احوال وہ ہیں جو عبد پر طاری ہوتے ہیں، لیکن یہ تب اچھے ہوں گے جب اعمال اچھے ہوں جیسے اچھے اخلاق کی وجہ سے اعمال اچھے ہوتے ہیں"۔

انسانی اشغال کی ان تینوں قسموں پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ "افعال" کی درستگی اور اہتمام سے اخلاق درست ہو جانا شروع ہو جاتے ہیں اور پھر اخلاق کی درستگی اور اہتمام وانتظام سے اچھے احوال کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ اپنی کتاب "میزان العمل" میں تحریر فرماتے ہیں:

الطريقة إِلىٰ تزكية النفس اعتياد الأفعال الصادرة من النفوس الزاكية الكاملة،حتىٰ إذا صار ذلك معتاداً بالتكرر، مع تقارب الزمان، حدث منها هيئة للنفس راسخة تقتضي تلك الأفعال،

---

[١] الرسالة القشيرية، بَاب فِي ذكر مشايخ هذه الطريقة وَمَا يدل من سيرهم وأقوالهم عَلَى تعظيم الشريعة، ج ١ص ١٧٠.

وتتقاضـــاها بحيث يصـــير ذلك له بالعادة كالطبع، فيخف عليه ما كان يستثقله من الخير.[١]

ترجمہ:"متقی اور پرہیز گار لوگوں کے افعال کو عادت بنالینا باطن کی اصلاح کا ذریعہ ہے، یہاں تک کہ جب تھوڑے وقت میں وہ اس کی عادت بن جائے، تو اس کی وجہ سے ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جائے گا کہ وہ خود بخود ان افعال کا تقاضا کرے گی، اس لئے کہ وہ اس کی فطرتِ ثانیہ بن جائے گی، لہذا جو نیکیاں اس پر بوجھل ہو جاتیں، آسان ہو جائیں گی"۔

اس کے بعد ایک مثال کے ساتھ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فمن أراد مثلاً أن يحصّـــل لنفســه خلق الجود، فطريقة أن يتكلف تعـاطي فعـل الجواد، وهو بذل المال، ولا يزال يواظب عليه حتىٰ يتيسر عليه، فيصير بنفسه جواداً.[٢]

ترجمہ:"جو یہ چاہے کہ میں سخی بن جاؤں، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بار بار تکلف کے ساتھ سخاوت کرتا رہے، تو اس طرح کرنے سے وہ خود بخود سخی بن جائے گا"۔

علامہ کاتب چلپی "علم الاخلاق" کے تعارف کے ضمن میں اسی درج بالا اشکال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

والجواب: أن الخلق ملكة يصـدر بها عن النفس أفعال بسـهولة، من غير فكر وروية.والملكة: كيفية راســخة في النفس، لا تزول

---

[١] ميزان العمل، بيان الطريق الجملي في تغير الأخلاق ومعالجة الهوى، ج١ ص٢٥١.

[٢] أيضا ج١ ص٢٥٢.

بسرعة. وهي قسمان: أحدهما: طبيعية، والآخر: عادية. أما الأولى: فهي أن يكون مزاج الشخص في أصل الفطرة، مستعدا لكيفية خاصة كامنة فيه، بحيث يتكيف بها بأدنى سبب، كالمزاج الحار اليابس، بالقياس إلى الغضب.. وأما العادية: فهي أن يزاول في الابتداء فعلا باختياره؛ وبتكرره والتمرن عليه تصير ملكة، حتى يصدر عنه الفعل بسهولة، من غير روية. ففائدة هذا العلم: بالقياس إلى الأولى: إبراز ما كان كامنا في النفس. وبالقياس إلى الثانية: تحصيلها. وإلى هذا يشير ما روي عن النبي – صلى الله تعالى عليه وسلم –: (بعثت لأتمم مكارم الأخلاق) .[1]

ترجمہ:"طبعی خصلت وہ ملکہ ہے جس کے ذریعے بغیر غور و فکر کے آسانی کے ساتھ نفس سے افعال صادر ہوتے ہیں۔ اور ملکہ اس حالت کو کہتے ہے جو نفس میں مضبوط ہو،وہ نفس سے جلدی زائل نہیں ہوتی،اوراس کی دو قسمیں ہیں:ایک طبعی ہے،دوسری عادی ہے، طبعی،مثلاً:کسی انسان کے مزاج کا اصل فطرت میں کسی خاص صفت کی صلاحیت رکھنا،اس طور سے کہ وہ مزاج ادنی سبب کے ذریعے اس صفت سے متصف ہو سکے۔عادی،مثلاً:کوئی کام ابتداء میں اختیار کے ساتھ کیاجائے،اورجب اس کو بار بار کیاجائے اوراس کی مشق کی جائے،تووہ ملکہ بن جاتی ہے، پھراس سے بغیر غور و فکر کے افعال صادر ہوتے ہیں۔

---

[1] كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون ج1 ص1. اس بات کی مزید تحقیق وتفصیل کے لئے امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی مفید کتاب "حجۃ اللہ" کی طرف مراجعت فرمائیں:حجۃ اللہ البالغۃ،باب ارتباط الأعمال بالهيئات النفسانية،ج1 ص69.

تو اس علم کا فائدہ اول قسم کی نسبت یہ ہے کہ جو صفت نفس میں چھپی ہے اس کا ظاہر کرنا، اور دوسری قسم کی نسبت اس صفت کا حاصل کرنا ہے، اور اسی کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ روایت جو نبی کریم ﷺ سے روایت ہے، جس کے الفاظ ہیں: "مجھے اس لئے بھیجا گیا ہے تا کہ اخلاقِ کریمہ کی تکمیل کروں"۔

اخلاق کے باب میں خیر و شر کے پیمانے

یہاں اچھے اور برے اخلاق کا عنوان بار بار ذکر کیا جاتا ہے کہ بعض اخلاق اچھے اور مطلوب ہیں جبکہ بعض بُرے اور مذموم ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخلاق کے باب میں اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہے؟ وہ کونسا پیمانہ ہے جس سے ہم اخلاق کی پیمائش کر کے اچھے اور برے کا فیصلہ کر سکیں؟ فلاسفہ نے "علم الاخلاق" کے نام سے جو فن مدون کیا تھا اور اس باب میں متعدد کتابیں لکھی تھیں، ان کتابوں کے بنیادی اور اہم مباحث میں سے ایک اہم بحث یہ بھی تھا کہ ہمارے پاس وہ کونسا ترازو ہے جس کے سہارے ہم اخلاق کے باب میں خیر و شر اور اچھے برے کی تمیز کر سکتے ہیں؟

پھر اس سلسلہ میں ان کے درمیان اختلاف تھا۔

بعض فلاسفہ کا موقف

الف: بعض فلاسفہ کا خیال تھا کہ اس کا پیمانہ عرف اور رائے عامہ ہی ہے، اس پیمانے میں جس چیز کو اچھا اور مطلوب سمجھا جاتا ہو وہ اچھا شمار ہو گا اور یہاں سے جس خُلق و صفت کو برا قرار دیا جائے وہ بُرا تصور کیا جائے گا۔

ب: بعض لوگ "منفعت" کو اس باب میں ترازو کے طور پر پیش کر رہے تھے کہ جس چیز سے دنیوی لذت ومنفعت حاصل ہو جائے وہ خیر ہے اور جہاں سے تکلیف ومضرت کا سامنا کرنا پڑے، وہ شر ہے۔

ج: بعض فلاسفہ "فراست" اور "وجدان" جیسی چیزوں کو اس باب میں معیار سمجھتے تھے۔

د: بہت سے فلاسفہ انسانی عقل وادراک کے سر اس کا سہرا باندھتے ہیں اور اسی کو اخلاق سمیت تمام چیزوں میں خیر وشر کا معیار ومدار باور کراتے ہیں کہ جس چیز کو انسانی عقل اچھا سمجھتی ہے وہ اچھی شمار ہو گی اور جو چیز اس کی نظر میں بری ہو، وہ برائیوں ہی کی فہرست میں شمار کی جائے گی۔

اس کے علاوہ بھی مختلف آراء تھیں۔ یہ آراء کن کن فلاسفہ کی تھیں؟ اپنی ان دعاوی کو ثابت کرنے کے لئے ان کے پاس کیا دلائل تھے؟ اور ان دلائل میں واقعی کچھ وزن ہے یا نہیں؟ "علم الاخلاق" کی کتابوں میں تفصیل سے ان باتوں سے بحث کی جاتی ہے، ان باتوں کے جاننے کے لئے اصلاً تو انہی کتابوں کی طرف مراجعت کرنا ضروری ہے، تاہم حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ نے ان مباحث کو بڑے اختصار اور سلیقہ مندی کے ساتھ اپنی مفید کتاب "اخلاق اور فلسفہ اخلاق" میں جمع فرمایا ہے جس کی طرف مراجعت کرنا بھی فائدے سے خالی نہیں۔

دین اسلام کا موقف

تاہم یہ سب فلسفیانہ مباحث ہیں، جہاں تک اس حوالے سے دین اسلام کے موقف کا سوال ہے تو اس کا جواب بڑا واضح ہے کہ دین اسلام کی نظر میں اخلاق ہو یا انسانی زندگی کے دیگر نشیب و فراز، انسان کے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کوئی ایسا موڑ نہیں جہاں دین اسلام نے اس کی پوری پوری رہنمائی نہ کی ہو جس کی وجہ سے اس کو اس بات کی ضرورت محسوس ہو جائے کہ اس کامل دین متین کے علاوہ کسی اور مصدر و مأخذ سے اپنے لئے احکام نکالے اور وہاں سے اپنی جائز ضرورت کی تکمیل کرے۔ اس کامل دین نے کہیں بھی انسانیت کی بروقت پوری رہنمائی سے ہاتھ نہیں کھینچا، لہٰذا ایک مسلمان کے لئے شرعی مصادر کے علاوہ کسی اور مصدر سے اپنی ضرورت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پیش آتی اور اسی لئے شرعی لحاظ سے بھی اس طرح ترمیم واضافے کی پوری پوری ممانعت فرمائی گئی اور اس کو "ابتداع" قرار دیا گیا جو کہ دین وشریعت کے خلاف ایک حملہ کے مترادف ہے۔

لہٰذا کونسے اخلاق اچھے کہلانے کے لائق ہیں اور کونسے برے قرار دینے کے مستحق ہیں؟ اس میں نہ رائے عامہ کی طرف مراجعت کرنے کی ضرورت ہے اور نہ منفعت یا سعادت وغیرہ کو اس کا معیار قرار دیا جانا جائز ہے بلکہ اس کا مدار ومیزان بھی شرعی دلائل ہی ہیں، شرعی دلائل جن اخلاق وصفات کو جس حد تک اچھا قرار دیتی ہے، وہ اخلاق اسی حد تک اچھے شمار ہوں گے اور جن اخلاق وعادات کو جس حد تک برا اور مذموم قرار دیتی ہے، وہ اخلاق وعادات اسی حد تک مذموم وممنوع تصور ہوں گے۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"الحاصل: خیر وشر یا بالفاظ دیگر حسن وقبح کا مسئلہ ایسا معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، جس پر فلاسفہ اخلاق نے دل کھول کر علمی بحثیں کی ہیں، مگر کلّی طور پر ان مباحث سے کوئی فیصلہ کن بات حاصل نہیں ہوسکی اور ہر ایک فلسفی کا نقطہء نظر مختلف وجوہ کی وجہ سے تشنہ نظر آتا ہے تاہم اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس وسیع علمی بحث نے ہمارے سامنے ایک طرف "علم الاخلاق" کی قدر وقیمت کی برتری کو نمایاں کر دیا اور دوسری جانب اس نے نہایت قیمتی ذخیرہء معلومات فراہم کر دیا، اور سچ تو یہ ہے کہ اس راہ میں بھی انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی تعلیمات نے جو راہنمائی کی ہے، خصوصاً قرآنِ حکیم نے اور نبی اکرم ﷺ کے قول وعمل وآسوہء حسنہ نے اخلاق کے سلسلہ میں جو فرض انجام دیا ہے قلبِ مستقیم اور عقلِ سلیم کے لئے وہی باعثِ تسکین ہے، اور بلاشبہ اسلام نے علم الاخلاق کی جن اساسی اور بنیادی اقدار کو لائحہ عمل کی حیثیت سے پیش کیا ہے، کنج دکھاؤ کے بعد اس سے بہتر فیصلہ تاریخِ علم الاخلاق نے آج تک پیش نہیں کیا اور یقیناً مستقبل میں بھی پیش نہیں کر سکتی، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمِ اخلاق نے جو کچھ دیا ہے وہ حقائق ہیں اور "حقائق"، علمِ مباحث سے جِلا تو پاسکتے ہیں لیکن بدل نہیں سکتے۔"[1]

حصولِ اخلاق کے طریقے ماہرین کی نظر میں

اخلاق حسنہ کیونکر حاصل ہوسکتے ہیں؟ ان کو حاصل کرنے کا مفید طریقہ کار کیا ہے؟ یوں ہی اخلاق مذمومہ سے کس طرح چھٹکارا حاصل کرنا ممکن ہے؟ اس پر متعدد ماہر اہلِ علم نے تفصیلی بحثیں سپردِ قلم فرمائی ہیں جو تصوف، اخلاق اور

---

[1] اخلاق اور فلسفہ اخلاق، ص٩٤تا٩٦.

نفسیات کی کتابوں کی زینت ہے۔ ہمارے برصغیر کے اہل علم میں سے نمایاں اور مستقل طور پر حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" اور حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی صاحب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اخلاق اور فلسفہ اخلاق" میں اس طرف تعرض فرمایا ہے، ان کے علاوہ بھی متعدد اہل علم اور ماہرین فن اخلاق نے اس سوال کو اپنے بحث و تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور ایک عرصہ سے یہی صحبت اس ناکارہ کے غور و فکر کی جولان گاہ بھی رہی ہے۔

انہی تجربات وتحقیقات کی روشنی میں یہاں اجمالی طور پر ان اسباب واسالیب کو ذکر کیا جاتا ہے جن کو اختیار کرنے سے اجمالی طور پر تمام نیک اخلاق حاصل کئے جاسکتے ہیں اور برے اخلاق سے اپنی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ ان اسباب کو بنیادی طور پر دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ،پہلی قسم کو علمی علاج اور دوسرے کو عملی علاج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علمی اور نظریاتی علاج

انسان اپنے قصد واختیار سے جو کچھ کام کرتا ہے وہ اگرچہ ظاہری اعضاء وجوارح ہی سے صادر ہوتے دکھائی دیتے ہیں اور لوگ بھی اس کو متعلقہ اعضاء ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، بولنا زبان کا، چلنا پھرنا پاؤں کا اور پکڑنا ہاتھ کے افعال واعمال شمار کئے جاتے ہیں اوربظاہر یہ امور انہی اعضاء سے صادر ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام امور میں ایک بڑا دخل انسان کی اندورنی علمی قوت کا بھی ہے، علمی اور نظری قوت کے سہارے اول یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی کام اقدام

کرنے کا قابل ہے یا عراض کرنے کا؟ مفید ہے یا مضر؟ ان جیسی باتوں کے فیصلہ کرنے کے بعد ظاہری اعضاء وجوارح آگے بڑھ کر کسی کام پر اقدام کرتے ہیں۔

اس علمی اور نظریاتی قوت کی خرابی کا علاج یہ ہے کہ اپنے مقصودِ حیات کو متعین کیا جائے، اللہ تعالیٰ کے احسانات، حقوق کو سامنے رکھا جائے، اور اپنی کوتاہیوں، کمزوریوں کو مناسب وقفہ کے ساتھ ساتھ بار بار یاد کیا جائے، اس کے ساتھ ساتھ اخلاق حسنہ کی ضرورت، اہمیت اور اس کے مفید اور برے اخلاق کے برے اثرات ونتائج پر یقین رکھے، اسی طرح اس بات کو بھی ہمیشہ مد نظر رکھا جائے کہ وقتی لذت ومصلحت حاصل کرنے کے لئے دائمی مصیبت ومضرت اختیار کرنے کا کیا نقصان ہے؟ اور دائمی نفع وفائدے کے خاطر اگر وقتی طور پر کچھ تھوڑی بہت نقصان برداشت کرنی پڑے تو اس میں کیا نقصان ہے؟

دوام وتسلسل کی اہمیت وافادیت

یاد رہے کہ یہ ایک آدھ مرتبہ کرنے کی چیز ہے اور نہ ہی اس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ متوقع ہے بلکہ جس طرح بدنی قوت پیدا کرنے کے لئے صرف ایک بار غذا کافی نہیں ہے اور درخت کے نشو ونما کے لئے ایک بار یا چند بار زمین کی آب یاری کافی نہیں بلکہ تواتر اور تسلسل کے ساتھ موقع بموقع خبر گیری کرتے رہنے کی ضرورت ہے اور اس طرح پوری پابندی کرنے کے بعد ہی بدن توانا ہونے اور پھل حاصل ہونے کی توقع باندھی جاسکتی ہے، یوں ہی اخلاق وعادات کی اصلاح وصلاح بھی ایک آدھ بار محنت کرنے یا درج بالا تدابیر کو عمل میں لانے سے نہیں ہوسکتی بلکہ حسبِ ضرورت گاہے بگاہے ان باتوں کی تجدید، اپنے عقل وضمیر کے ساتھ ان

باتوں کی دہرائی کرنا اور مذاکرہ کرتے رہنا ضروری ہے۔اس کو "استقامت" اور "مداومت" کہا جاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو صوفیاء کرام کے نزدیک ہزار کرامات سے زیادہ بھاری اور نفیس مقام ہے لیکن ساتھ مشکل اور نفس پر بھاری اس قدر ہے کہ ہزاروں،لاکھوں افراد اس کو پائے بغیر ہی ہمت ہار کر پیچھے لوٹ جاتے ہیں اور اپنے تئیں اس کے حاصل کرنے کو ناممکن تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کا وقیع تجربہ

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے بڑے زور و قوت اور اصرار واہتمام کے ساتھ یہ بات بیان فرمائی ہے کہ اخلاق حسنہ کی تعداد گو زیادہ ہے لیکن چار صفات وعادات ایسی ہیں کہ وہ باقی تمام اخلاق کے لئے مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان چار چیزوں کو اگر حاصل کرلیا جائے تو اس کے ساتھ دیگر اخلاق بھی حاصل ہو ہی جاتے ہیں:

۱:طہارت: یعنیٰ نظافت اور صفائی کا اہتمام کرنا، ناپاکی اور حدث کی حالت میں وقت نہ گزارنا۔

۲:اخبات: یعنیٰ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز وانکساری کا اظہار، اسی کی طرف رجوع وانابت کرنا۔ یہ صفت نماز ،روزہ، تلاوت اور ذکر وعاء وغیرہ عبادات پر پابندی کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔

۳:سماحت: یعنیٰ انسانی نفس کا اس کیفیت پر ہونا کہ بہیمی قوتیں اس میں اثر انداز نہ ہو سکیں، مال کے باب میں سخی ہونا اور خواہشات وشہوات کے باب میں عفیف ہونا اسی "سماحت" کی شاخیں ہیں۔ یہ صفت ریاضت ومحنت سے حاصل ہو سکتی ہے

کہ تکلف کے ساتھ بار بار سخاوت اور عفت وعصمت وغیرہ کی تمرین ومشق کرتا رہے، جہاں سخاوت کا موقع ہو وہاں نفس کے نہ چاہتے ہوئے بھی سخاوت سے کام لیا جائے اور جہاں عہدے، مال یا نفسانی خواہشات کے دوڑ دھوپ کا میدان ہو تو وہاں تکلف کے ساتھ اپنے آپ کو عفیف رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ غرض مشق وتکلف سے یہ صفت حاصل ہو سکتی ہے۔

۴: عدالت: یہ انسان کی طبعی کیفیت کا نام ہے کہ جو انسان کو ہر اس کام سے رکنے پر ابھارتی ہے جو کسی شخص یا معاشرے کے حق میں تکلیف ونقصان کا باعث بن سکتا ہو۔ اتباعِ سنت کی پابندی کرنے سے یہ صفت حاصل ہو سکتی ہے۔[1]

علامہ محمد عثمان بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تہذیب اخلاق کا مفید طریقہ

ایک غیر معروف بزرگ علامہ محمد بن عثمان بلخی نے "عین العلم وزین الحلم" کے نام سے علم تصوف واخلاق پر نہایت مفید متن تیار فرمایا ہے، حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس کی شرح بھی لکھی ہے جو دو جلدوں میں چھپی ہے۔ یہ علم تصوف پر بڑی مفید لیکن غیر مشہور کتاب ہے، اس میں مصنف رحمہ اللہ علیہ نے تہذیب اخلاق کے متعلق مختصر ومفید گفتگو فرمائی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اخلاق سنوارنے کی دو صورتیں ہیں:

الف: بعض اوقات تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی اس کا انتظام ہو جاتا ہے چنانچہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے ساتھ یہی پیش آتا ہے، اسی طرح

---

[1] حجة الله البالغة، ص۱٦۰ تا۱٦۷.

حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کے مقابلے میں آنے والے جادوگروں کے ساتھ یہی ہوا تھا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی یوں ہی اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق وعنایت سے اسلام واخلاق سے مشرف ہوئے۔

ب: عام طور پر اخلاق کا معاملہ بھی اسباب کے ساتھ جڑا رہتا ہے، اور جن کو بغیر اسباب کے یہ نعمت نصیب نہ ہو تو وہ اسی کے مکلف ہیں کہ اسباب کا اختیار کرکے ضروری حد تک اپنے اخلاق کی تکمیل کرے۔ "تہذیب اخلاق" کا بڑا سبب یہی ہے کہ اضداد کے ساتھ نفس کا علاج کیا جائے، چنانچہ اگر اس میں کبر وتعلی کا پہلو دیکھے تو اس کو اچھی طرح دبادیا جائے اور ایسے کام کئے جائیں جس سے ظاہری طور پر حقارت وذلت محسوس ہوتی ہو، اگر بے جا غیظ وغضب کا شکار ہو جائے تو تکلف کے ساتھ حلم ورحم کا اچھی طرح مظاہرہ کرتا رہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ وغیرہ کئی صحابہ کرام سے منقول ہے کہ وہ مختلف مواقع پر اس طرح اضداد کے ساتھ اپنے نفس کا علاج فرماتے تھے۔

تہذیب اخلاق کے پانچ نکاتی تدبیر

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ان مجاہدات وریاضات کا اصل مقصد یہ ہے کہ دل سے دنیا کی محبت کا بالکل خاتمہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے اندر اچھی طرح جا گزین ہو جائے اور اس کے پانچ طریقے ہیں:

۱: ایک ایسا کامل شیخ جو مرید کے ظاہری وباطنی عیوب سے باخبر ہو، اس کا ہاتھ اچھی طرح پکڑا جائے۔

۲: ایک ایسا خیر خواہ دوست جو انسان کو اپنی کمزوریوں اور عیوب پر مطلع کرتا رہے۔ سلف صالحین میں سے کئی حضرات کا آپس میں اسی نوعیت کا تعلق تھا کہ ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف رہتے تھے اور ہر ایک دوسرے کے عیوب وکمزوریوں سے خیر خواہی کے جذبے اور انداز میں اس کو مطلع کرتا تھا جس سے اس کو تنبیہ حاصل ہو جاتی تھی اور اس طرح اس کی اصلاح کی فکر کرتا۔

۳: دشمن سے استفادہ کیاجائے۔ انسان کی آنکھ ہمیشہ اپنے دشمن کی کمزوریوں اور اس کے عیوب ونقائص پر مرکوز ہوتی ہے، لہٰذا دشمن کے زبان وبیان سے استفادہ کرنے میں امید ہے کہ انسان کو اپنی واقعی کمزوریوں کا علم ہوتا رہے۔

۴: لوگوں کے ساتھ میل جول رکھاجائے اور لوگوں کی جن اخلاق وعادات کو ناپسند سمجھتا رہے، اس سے خود بھی بچے رہنے کی کوشش کرتا رہے۔

۵: قرآن وسنت کو سامنے رکھ کر انہی کو مشعل راہ بنائے اوراسی سرچشمے سے اپنے اخلاق وعادات کی اصلاح کرتا رہے۔

"عین العلم وزین الحلم" میں ہے:

وهو بالاستفادة مِن شيخ بصير بالعيوب مطّلع علىٰ الخفايا وهو عزيز الوجود أو صديق يُنبّه عليها كما رُوي عن السّلف أو عدوّ فعين السّخط تُبديها أو مخالطة النّاس وترك ما رأىٰ مذموما أو الكتاب والسنّة وهو الأنفع.[1]

[1] شرح عين العلم وزين الحلم:الباب الخامس عشر، ج٢ص١٦٧.

ترجمہ: "اور (اصلاح) ایسے شیخِ کامل سے استفادہ کے ذریعے (ہو سکتا ہے) جو عیوب پر بصیرت رکھتا ہو اور چھپی کوتاہیوں سے واقف ہو ایسے شیخ کا وجود بڑی عزیز ہے یا ایسے دوست سے استفادہ کے ذریعے جو ان عیوب پر متنبّہ کرتا رہے جیسا کی سلف سے منقول ہے یا کسی دشمن کے ذریعے، کہ اس سے ان عیوب کو متعیّن کرتا رہے جن کو تم ظاہر کرنا چاہو (دشمنی کی وجہ سے) یا لوگوں کے ساتھ میل جول کے ذریعے، کہ ان میں جن باتوں کو بُرا سمجھے ان کو چھوڑتا رہے یا کتاب وسنّت سے استفادہ کے ذریعے اور یہ زیادہ مفید ہے"۔

کچھ دیگر معاون امور

اس کے علاوہ بھی کچھ اسباب وعناصر ایسے ہیں جو اس باب میں مفید ومعاون ثابت ہو سکتی ہیں اور ان سے اہتمام ومداومت کے ساتھ اگر کام لیا جائے تو تہذیب اخلاق کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے، ان میں سے چند نمایاں اسباب درج ذیل ہیں:

بااخلاق افراد کی صحبت

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مذموم صفات وعادات کی کدورتوں سے پاک صاف رکھا ہو اور اچھے اخلاق سے مزین فرمایا ہو، ان کی صحبت میں بیٹھنا، معیت میں رہنا اور ان سے تعلقِ خاطر رکھنا بڑا مفید اور بہت کارگر ہے۔ انسان فطری طور پر تو تقلید پسند واقع ہوا ہے جس طرح ایک خربوزہ دوسرے کو دیکھ کر اس جیسا رنگ

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے بھی پہلے چار چیزوں کو اپنے عیوب پہچاننے کے ذرائع قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی کتاب: "مختصر منہاج القاصدین" ص ١٨٥۔

پکڑ تا ہے یوں ہی ایک انسان اپنے ہم جنس کو دیکھ کر اس کی اچھی عادات وخصائل کو اپنے اندر سمونے کی کوشش یا کم از کم خواہش کرتا ہے۔ قرآن وحدیث میں بھی اس کی بڑی ترغیب وتاکید فرمائی گئی ہے اور عام تجربہ بھی یہ ہے کہ یہ راستہ بڑا آسان ہے جس میں دیگر راستوں کی بنسبت کچھ دیر لگ جاتی ہے لیکن اس پر چل کر باہمت افراد ضرور اپنی منزل کو پہنچ جاتے ہیں، عموماً محرومی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

"صحبت" صرف یہی نہیں ہے کہ کسی کے پاس جاکر بیٹھا جائے اور اس کی مجلس میں شریک ہوجائے بلکہ ربط وتعلق اور خط وکتابت وغیرہ ذرائع کے ذریعے سے جڑے رہنا بھی بہت مفید ہے، گزرے ہوئے باکمال لوگوں کے اخلاقی کارنامے اور ان کی سیر وسوانح پڑھنے سے بھی بڑی حد تک یہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

ریاضت اور مجاہدہ

حصول اخلاق بلکہ کسی بھی مشکل کو منزل حاصل کرنے کا ایک عام دستوری طریقہ ریاضت اور مجاہدہ بھی ہے، یہ ایک ایسا راستہ ہے جس میں مسلمان اور غیر مسلم کا بھی کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اسلام کی سعادت سے محروم لوگ بھی مجاہدہ اور کوشش سے بہت کچھ منزلیں طے کرلیتے ہیں کیونکہ یہ اسباب کا جہاں ہے، اگر کسی منزل تک پہنچنے کے لئے اس کے واقعی اسباب کو بروئے کار لایا جائے تو اس پر متعلقہ نتائج ومسببات عموماً مرتب ہو ہی جاتے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ ساتھ مقصود بھی اللہ تعالیٰ کی قرب ورضا اور اس کے احکام واوامر کی تعمیل وتکمیل ہو تو اس کے ساتھ خصوصی طور پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور عنایتیں شامل حال ہو جاتی

ہیں جن کی برکت سے وہ اپنا مقصود پا ہی لیتا ہے جبکہ استقامت کا دامن مضبوطی سے تھامار کھا جائے۔ قرآن کریم نے تاکید کے ساتھ اس بات کا اعلان عام فرمایا ہے، ارشادِ خداوندی ہے:

{وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ }.[١]

ترجمہ:" اور جنہوں نے ہمارے لیے کوشش کی ہم انھیں ضرور اپنی راہیں سمجھا دیں گے اور بیشک اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے"۔

مجاہدے کا دو نکاتی مفید طریقہ کار

اخلاق کے باب میں مجاہدہ کرنے کا طریقہ کار یہ ہے کہ:

۱: جس موقع وماحول میں خطرہ ہو کہ اخلاق حسنہ کے تقاضوں کی خلاف ورزی ہو گی، اخلاق مذمومہ صادر ہونے کا موقع ملے گا وہاں بلا ضرورت داخل ہی نہ ہو جائے بلکہ جہاں تک ہو سکے، ایسے ماحول سے اپنے آپ کو دور ہی رکھے۔

۲: جہاں کسی مطلوب صفت وعادت کے خلاف جذبات دل میں پیدا ہو جائیں، وہاں ان جذبات پر بالکل عمل نہ کرے بلکہ تکلف وہمت کرکے بار بار اس کی مخالفت کرتا رہے اور اس کی متضاد اچھی خصلت کا جذبہ اگر دل میں نہ بھی ہو تب بھی طبیعت کے بر خلاف اس پر عمل کرے۔ بار بار ان غلط جذبات کی مخالفت کرکے اس عادت کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کرتا رہے۔ مذموم اخلاق وعادات کے ساتھ بھی یہی برتاؤ نبھاتا رہے کہ جب دل میں اس کے مطابق کچھ اقدام

---

[١] سورۃالعنکبوت،الایۃ: ٦٩.

کرنے کا خیال جگہ پکڑنے لگے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور اس کے متضاد اچھی صفت کا تکلف کے ساتھ ساتھ بار بار ارتکاب کرتا رہے۔

نفس کی مخالفت: اہمیت وافادیت

"نفس کی مخالفت" بہت بڑا گر ہے، فضائل وکمالات کے حاصل کرنے اور مذموم خصلتوں وصفات سے محفوظ رہنے میں اس کا بڑا اور کلیدی کردار ہے، اس لئے حضرات صوفیہ کرام کے ہاں اس کی بہت اہمیت ہے۔امام قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اعْلَمْ أَن مخالفة النفس رأس العبادة وَقَدْ سئل المشايخ عَنِ الإِسْلام؟ فَقَالُوا: ذبح النفس بسيوف المخالفة...وَقَالَ ذو النون المصري: مفاتح العبادة الفكرة وعلامة الإصابة مخالفة النفس والهوىٰ ومخالفتها ترك شهواتها.[1]

ترجمہ: "جان لو! کہ نفس کی مخالفت اصل عبادت ہے، مشائخ سے اسلام کے بارے میں پوچھا گیا کہ اسلام کسے کہتے ہیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ نفس کو مخالفت کی تلواروں سے ذبح کرنا۔۔ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں: عبادت کی کنجی سوچ وفکر ہے اور نفس وخواہش کی مخالفت درستگی کی علامت ہے اور اس کی مخالفت شہوات کو ترک کرنا ہے"۔

درج بالا دو باتوں کی پابندی کے ساتھ ان شاء اللہ اچھے اخلاق وعادات طبیعت کا حصہ بننے لگ جائیں گے اور برے عادات وجذبات سے حفاظت وسلامتی نصیب

[1] الرسالة القشيرية، بَاب الصمت، ج١ص ٢٨٣.

ہو جائے گی، لیکن اگر بالفرض کہیں ایسا تغیر اور انقلاب رونما نہ بھی ہو جائے تو بھی مجاہدے اور ریاضت پر استقامت کے ساتھ عمل پیرا ہونا چاہئے۔ امید ہے کہ طبیعت کے بر خلاف اس طرح مجاہدہ کرنے والے کو اس شخص کی بنسبت زیادہ اجر وثواب ملے جس شخص کے اخلاق وعادات طبعی طور پر درست ہوں اور کچھ خاص ریاضت وکوشش کئے بغیر ہی اس کو اخلاقِ حسنہ کی نعمت نصیب ہو۔ حدیث شریف میں ہے:

عن عائشة، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: « الماهر بالقرآن مع السفرة الكرام البررة ، والذي يتعتع فيه وهو عليه شاق فله أجران اثنان».[1]

ترجمہ: "حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جو شخص قرآن کریم مہارت کے ساتھ پڑھتا ہے، وہ نیک اور معزز فرشتوں کے ساتھ ہو گا اور جو شخص مشقت برداشت کر کے تلاوت کرے اسے دہرا اجر ملے گا"۔

فلاسفہ کے ہاں حصول اخلاق کے پانچ طریقے

اخلاق کی اہمیت اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ کار جس طرح تصوف وسلوک سے وابستہ اہل علم کے غور وفکر کا محور رہا ہے، یوں ہی قدیم وجدید فلاسفہ بھی اس پر برسہا برس سے نظر و تدبر کرتے رہے ہیں، انہوں نے بھی اپنے طویل تجربات کی روشنی میں اس کے مختلف اسباب وطرق ذکر کئے ہیں جو "علم اخلاق" کی

---

[1] السنن الكبرى للنسائي ،رقم الحديث :١١٥٨٢ ،ج١٠ص٣٢٤.

کتابوں میں مذکور ہیں۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ نے ان مباحث کا نچوڑ لکھتے ہوئے درج ذیل پانچ اسباب ذکر فرمائے ہیں:

۱: وسعتِ نظر کی تخلیق: کوتاہ نظری، کور دماغی اور محدود وناقص سوچ وفکر بہت سے مذموم اخلاق وعادات کا منبع اوران کا سر چشمہ ہے اور اس طبیعت کے حامل افراد سے اچھے اور بلند اخلاق پیدا ہونے کی توقع کبھی نہیں کی جاسکتی۔ بہت سے گروہ بندیوں اور دسیوں قسم کے تعصبات کا اساس بھی یہی تنگ نظری ہی ہے۔اس لئے اچھے اخلاق حاصل کرنے کے لئے وسعت نظری کی ضرورت ہے اور سوچ وفکر کی دنیا میں جب وسعت پیدا ہو جائے تو انسان بہت سے برے اخلاق وعادات کو خود بخود قابل نفرت ومذمت اور ناقابل توجہ والتفات محسوس کرے گا۔

۲: اچھے لوگوں کی صحبت: تربیت اخلاق کا یہ بھی ایک مفید اور مؤثر طریقہ ہے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

۳: مشاہیر اور جلیل القدر رہنماؤں کی سیرت کا مطالعہ: جب کبھی مشاہیر اور قومی ہیرو کی زندگی کے حالات پڑھے جاتے ہیں تو ناممکن ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں یہ محسوس نہ ہو کہ ایک نئی روح ہے جو اس کے قالب میں پھونکی جارہی ہے اوراس طرح اس کے عزائم میں ایسی حرکت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے کام پر آمادہ ہو جاتا ہے اور ایسا بارہا ہوا ہے کہ جب کسی نے کوئی بڑا کام کیا ہے تو اس کا باعث وہ واقعہ بنا ہے جو کسی عظیم الشان رہنما یا جلیل القدر ہیرو سے منسوب اس کے سامنے بیان ہوا ہے۔

۴ : اعمال خیر میں سے کسی مفید عام نوع عمل پر اقدام: تربیت خلق کے سلسلے میں جس علاج کے مفید اور کار گر ہونے کو بہت زیادہ اہمیت دی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اپنے لئے اعمال خیر میں سے ایسی نوعِ عمل کو مخصوص کرلے جو مفید عام ہو اور اس طرح اس کو اپنا نصب العین اور منتہائے نظر بنائے کہ جو کچھ بھی کرے، اس کے اثبات و تحقیق کے لئے ہی کرے۔

۵ : نفس کو ایسے اعمال کا خوگر بنانا جس سے اس کے طبعی رجحانات و عواطف کا زور ٹوٹ سکے اور اس کو مغلوب کیا جاسکے: اچھے اخلاق کے حاصل کرنے کے لئے یہ بہت مفید راہ عمل ہے۔ ارسطو کہا کرتا تھا:

"جب انسانی اخلاق میں سے کوئی خلق حد اعتدال سے متجاوز ہو جائے تو اس کو اعتدال پر لانے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کی ضد کی جانب میلان اختیار کیا جائے، پس اگر نفس میں کوئی شہوانی جذبہ قدرے اعتدال سے بڑھتا ہوا محسوس ہو تو ضروری ہے کہ نفس کو قدرے زہد کی جانب مائل کر کے اس کو کمزور کر دیا جائے۔"[١]

تصوف اور اخلاق حسنہ کی تکمیل

یہاں ایک اہم اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اچھے اخلاق حاصل کرنے اور برے و مذموم اخلاق سے چھٹکارا حاصل کرنے کے اتنے راستے جب موجود ہیں اور ہر شخص کے دست قدرت کے تحت بھی ہیں تو کیوں نہ انہی راستوں کی تبلیغ و تلقین پر اکتفاء کی جائے اور ان صاف سیدھے راستوں کے ہوتے ہوئے راہ سلوک کی مشکل

---

١ اخلاق اور فلسفہ اخلاق، ص٩٨تا١٠٥۔

گھاٹیوں کی صحرا نوردی کی ضرورت کیا ہے جہاں گو مقصود حاصل کرنے کا امکان بھی موجود ہے لیکن ساتھ خطرات وفتن کا بھی ایک جنگل ہے جس میں ہزاروں لوگ گمراہی کے بھیڑیوں کے شکار ہو چکے ہیں؟

نیز اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور اشکال بھی سامنے آتا ہے جو اپنی جگہ نہایت اہمیت کا حامل ہے اور اکثر لوگوں کی نظروں سے چونکہ اس اشکال کا حل او جھل رہتا ہے اس لئے وہ اس علم تصوف کی اہمیت وافادیت کے بارے میں تردد کے شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے فکر و نظر کے ناقص دائرہ میں رہتے ہوئے جب اس کیفیت سے نکلنے کا کوئی معقول راستہ ان کے ہاتھ نہ آئے اور کسی باعث اطمینان جواب کی طرف ان کی رسائی نہ ہو سکے تو پھر خود اس مبارک علم ہی کی مخالفت کرنے لگ جاتے ہیں۔ تصوّف کی تنقید و مذمت میں لکھی گئی متعدد کتابوں اور تحریرات کے مطالعہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اکثر باحثین کے نقد و نظر کا بڑا اساس وبنیاد یہی چیز ہے، وہ اسی غلط فہمی کے شکار ہوئے اور جب کوئی قابل اطمینان حل نظر نہ آیا تو اصل فن پر ہی نقد کرنا شروع کیا۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ:

ا: اخلاق کے اصلاح وتربیت کے ذرائع تو بہت ہیں جن میں سے بعض کا پہلے ذکر بھی کیا گیا ہے لیکن ان میں سے آسان تر راستہ یہی شاہراہ تصوف ہے، دوسرے ذرائع سے اصلاح اگرچہ متوقع ہے لیکن متعدد ایسے عناصر ہیں جن کی وجہ سے وہ ذرائع یا تو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتے یا اگر وقتی طور پر ان سے گوہر مقصود حاصل بھی ہو جائے تو بھی اس میں استقامت و مداومت حاصل نہیں ہوتی جبکہ یہ بھی

مقصود ہے اور محض وقتی اصلاح کافی نہیں ہے۔ ان عناصر میں سے ایک اہم عنصر یہ ہے کہ بحالت موجودہ طبیعتوں میں خود فریبی، خود پسندی اور عجب کی بیماری عام ہے جن کے ہوتے ہوئے خود اپنے آپ کا علاج کرنا نہایت مشکل ہے، یہ ایسی بیماریاں ہیں جن کے ہوتے ہوئے اصل مرض کا علاج بھی دوسرے افراد ہی کے مرہون منت ہے۔

۲: اخلاق اور قلبی کیفیات کے بارے میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جہاں اچھے برے اور نیک وبد کی تمیز کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے، بعض اخلاق وعادات کے حدود قریب قریب ہوتے ہیں اور بہت سے جزئیات میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ جزئیہ کس خُلق وعادت کے تحت داخل ہے اور اس کی کیا حیثیت ہے؟ مثال کے طور پر تواضع مطلوب ہے اور تذلیل نفس غیر مطلوب، جبکہ ان دونوں میں عملی طور پر فرق کرنا بسا اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ خود اعتمادی اور کبر، اخلاص وریاء، ریاء اور تحدیث نعمت، خوف خدا اور رحمت حق سے مایوسی وغیرہ صفات وعادات بھی آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں جن میں سے ایک مطلوب ہے اور دوسرا غیر مطلوب / ممنوع، لیکن مختلف جزئیات میں عملی طور پر ان کے درمیان فرق کرنا آسان نہیں ہوتا۔

عقلی ونظریاتی طور پر فرق کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہوتا لیکن حقائق اور واقعات کی دنیا میں باہم متماثل جزئیات کے درمیان خط امتیاز کھینچنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، خصوصاً اس دل ودماغ سے جو خود ان امراض میں مبتلی ہو۔ عربی کی مشہور ومعقول کہاوت ہے کہ "رأی العلیل علیل" بیمار کی رائے میں بھی اس کی

بیماری کا اثر نمایاں ہوتا ہے، اب کوئی شخص خود ان امراض کے ساتھ مریض اور ان میں مبتلی ہے تو اس سے یہ توقع کہاں باندھی جاسکتی ہے کہ وہ ان جیسی مشکل و متشابہ چیزوں میں ٹھیک ٹھیک فرق کرسکے گا! اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شوق واخلاص کے باوجود ایسا شخص بہت سی ایسی باتوں کا عادی ہوجاتا ہے جو شریعت کی روشنی میں مذموم وممنوع ہوتے ہیں۔

۳: انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے تاثر اور انفعال کا مادہ پیدا فرمایا ہے اور تجربہ سے ثابت ہے کہ وہ اس فطری عادت کے ذریعے بہت سی مشکلات پر قابو پالیتا ہے جس کو اگر اس طبعی ذریعے سے ہٹ کر حاصل کرنا چاہے تو اس کے حاصل کرنے میں بہت کچھ وقت واستعداد کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس لئے آسان راستہ یہی ہے کہ تصوف کی شاہراہ پر احتیاط کے ساتھ چلا جائے۔

۴: تجربہ ہے کہ وصول الی اللہ اور اصلاح اخلاق مفید تر اور نتیجہ خیز ذریعہ یہی ہے۔ یہ محض دعویٰ یا خوش فہمی نہیں ہے بلکہ لاکھوں افراد کا تجربہ ومشاہدہ ہے جس کو آسانی کے ساتھ رد کرنا ممکن نہیں۔ ان لاکھوں افراد میں سے ان لوگوں کی بھی ایک خاصی لمبی فہرست ہے جو خود تصوف کے پرجوش ناقدین میں سے تھے اور اسی "فرض تنقید" کے انجام دہی کے دوران ہی وہ اس کے اسیر بن گئے، اس کو آزمانے اور پرکھنے کے بعد اس کے پرجوش حامی ومبلغ بن گئے۔

۵: قرآن کریم نے متعدد جگہ بعثت رسول ﷺ کے مقاصد ذکر فرمائے ہیں، ان میں سے ایک مقصد لوگوں کا تزکیہ کرنا بھی ہے کہ لوگوں کے دل ودماغ کی صفائی کی جائے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی معیت وصحبت کے قابل

بنایا جائے۔ "تزکیہ" کا معنیٰ کسی بھی چیز کی صفائی ستھرائی کرنا ہے لیکن یہاں اس سے انسان کے باطن کی صفائی و تطہیر مراد ہے اور پھر باطن کو دو قسم کی چیزوں سے صاف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، ایک تو زیغ وضلال پر مبنی عقائد و نظریات سے اس کو صاف کیا جاتا ہے جو قرآن وسنت کی روشنی میں میں بحسن وخوبی انجام پاسکتا ہے اور دوسری چیز برے اخلاق وصفات ہیں جن کا محل انسان کا دل ہوتا ہے اوران سے باطن کے صفائی کی ضرورت پڑتی ہے، تزکیہ سے عموماً یہ مراد لیا جاتا ہے۔

اب ان آیات میں " تزکیہ " کی نسبت رسول اکرم ﷺ کی طرف فرمائی گئی ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کریں گے، گویا براہ راست قرآن وسنت کے چشمہ صافی سے ہر شخص اپنا تزکیہ خود نہیں کر پاسکتا بلکہ اس کے لئے رسول اکرم ﷺ (یا اس کے قابل نائب) کی ضرورت ہے، اسی طرح بعض دیگر نصوص سے بھی رجال اللہ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

ان جیسے تمام نصوص مجموعی لحاظ سے اس بات پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ تزکیہ کے باب میں رجال اللہ کی خاصی اہمیت ہے اور ان کا دامن تھامے بغیر عام افراد کے حق میں یہ توقع رکھنا مشکل ہے کہ وہ اپنی مدد آپ کے تحت اپنی اصلاح خود کریں گے۔

یہ بات بالکل معقول و مجرب بھی ہے کہ نفس و شیطان بڑے مکار، دھوکہ باز اور ہوشیار ہیں، ان کے دھوکے کے بھی دسیوں جال ہوتے ہیں، ان سب ہتھکنڈوں سے صحیح سلامت نکلنا خاصا مشکل کام ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے، عموماً

یہی ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ اخلاص وہمت کے باوجود بھی ان ہی جالوں کے شکار رہتے ہیں جبکہ اپنے زعم میں وہ شیطان کے چال سے محفوظ رہتے ہیں اور تزکیہ کر چکے ہوتے ہیں۔ ساتھ انسان نفسیاتی لحاظ سے خود بین وخود پسند واقع ہوا ہے جبکہ یہی وہ دبیز چادر ہے جس کے اوڑھنے کے بعد اصلاحِ اخلاق کی توقع سراب کے مانند ہو جاتی ہے۔

اذکار واشغال کا اصلاح اخلاق سے تعلق کیا؟

جہاں تک یہ سوال ہے کہ تصوف میں جو کچھ اذکار واشغال بتائے جاتے ہیں، ان کا اخلاق کے اصلاح وتہذیب سے تعلق کیا ہے؟ اور کیونکر ان سے اصلاح اخلاق کی منزل حاصل کی جاسکتی ہے؟ جبکہ ان معمولات میں عموماً اخلاق کی طرف کوئی خاطر خواہ تعرض بھی نہیں کیا جاتا بلکہ بسا اوقات دیکھا جاتا ہے کہ اس راہ پر چلنے والوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہوتی ہے جو اخلاق کے نام اور اس کے ضروری حدود وقیود تک سے غافل ہوتے ہیں اور شیخ ومرشد کی طرف سے بھی دوران سلوک اخلاق کے بیان وتعلیم کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا!

اس کا جواب یہ ہے کہ کہ اصل مقصود یہ ہے کہ اخلاق حسنہ کو دل میں جگہ دی جائے اور دل کی دنیا میں ان کو اچھی طرح بسایا جائے، اگر کوئی شخص اپنے دلی جذبات وکیفیات پر غلبہ نہ بھی پاسکے تو بھی کم از کم اپنے غلط اور ناجائز جذبات میں نہ بہہ جائے بلکہ درست اور شرعی ضابطے کے مطابق جذبات کا استعمال کرے گو تکلف کے ساتھ ہی ہو۔ ہر شخص کے حق میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ان اخلاق کے

اسماء وعناوین اچھی طرح یاد رکھے اور ان کے حدود و قیود کو خوب ازبر کرے، اس لئے یہاں تک کی بات تو قابل اشکال نہیں۔

البتہ جہاں تک یہ سوال ہے کہ ذکر واذکار اور شغل واشغال کا اصلاح اخلاق کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور یقیناً ذکر واشغال پر مداومت سے اصلاح اخلاق کی منزل طے کرلی جاسکتی ہے، یہ تعلق نصوص سے بھی ثابت ہوتا ہے، تجربہ اور مشاہدہ سے بھی اور عقل وفکر سے بھی، اس کی تفصیل ترتیب وار درج ذیل ہے۔

نقلی دلائل

الف: بعض روایات میں ذکر کو " صقالۃ القلوب" قرار دیا گیا ہے، چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ ذکر کرتے ہیں:

عن عبد الله بن عمر، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان يقول: «إن لكل شيء صقالة، وإن صقالة القلوب ذكر الله عز وجل، وما من شيء أنجى من عذاب الله من ذكر الله ".[١]

ترجمہ: "حضرت عبداللہ بن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ ہر چیز کے لئے کوئی صافی ہے اور دلوں کو چمکانے والی صافی اللہ کا ذکر ہے اور ایسی کوئی چیز نہیں ہے اور نجات دلانے کے لئے اللہ کے ذکر سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے"۔

---

[١] الدعوات الكبير: باب ما جاء في فضل الدعاء والذكر، ج١ص٨٠.

متعدد نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ گناہ ومنکرات کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے مطابق دل پر سیاہ نقطے پڑتے ہیں، اگر استغفار وغیرہ اعمال سے اس کی صفائی وتطہیر نہ کی جائے تو دل بالکل کالا بن جاتا ہے اور یہی دل کی سختی اور زنگ پکڑنا ہے اور ایسا دل مذموم اخلاق اور رذیل صفات کا گھوارہ ہوتا ہے۔ اس زنگ کو دور کرنے کا ایک اہم ذریعہ "ذکر اللہ" بھی ہے جیسا کہ درج بالا روایت میں بیان کیا گیا ہے۔ ذکر کے ساتھ ایسے دل کی صفائی وستھرائی ہوجاتی ہے اور زنگ اتر جاتا ہے جس کے بعد وہ رفتہ رفتہ نرم پڑ جاتا ہے، قرآن وحدیث کے احکام ونصوص کے سامنے جھک جاتا ہے اور بداخلاقی وغیرہ دھبے بھی دھل جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ذاکرین کے ساتھ ہونے کے فوائد

متعدد صحیح روایات میں یہ مضمون ذکر کیا گیا ہے کہ ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ ذاکرین کے ساتھ ہوتے ہیں اور جس طرح ذاکرین اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی شان کے مطابق ان کو یاد فرماتے ہیں، بخاری کی روایت ہے:

قال النبي صلى الله عليه وسلم: " يقول الله تعالىٰ: أنا عند ظن عبدي بي، وأنا معه إذا ذكرني، فإن ذكرني في نفسه ذكرته في نفسي، وإن ذكرني في ملإ ذكرته في ملإ خير منهم، وإن تقرب إلي بشبر تقربت إليه ذراعا، وإن تقرب إلي ذراعا تقربت إليه باعا، وإن أتاني يمشي أتيته هرولة ".[1]

---

[1] صحيح البخاري: كتاب التوحيد، باب قول الله تعالى: {ويحذركم الله نفسه} ج۹ص۱۲۱رقم الحديث:۷۴۰۵.

ترجمہ: "حضورِ اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا ارشاد ہے کہ: حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ: مَیں بندے کے ساتھ ویسا ہی مُعاملہ کرتا ہوں جیسا کہ وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے، اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں؛ پس اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اُس کو اپنے دِل میں یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ میرا مجمع میں ذکر کرتا ہے تو مَیں اُس مجمع سے بہتر یعنی فرشتوں کے مجمع میں (جو معصوم اور بے گناہ ہیں) تذکرہ کرتا ہوں، اور اگر بندہ میری طرف ایک بالشت مُتوجّہ ہوتا ہے تو مَیں ایک ہاتھ اُس کی طرف متوجّہ ہوتا ہوں، اور اگر وہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو مَیں دو ہاتھ اُدھر متوجّہ ہوتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو مَیں اُس کی طرف دوڑ کر چلتا ہوں"۔

اس روایت میں چند باتیں بڑی اہم ہیں:

۱: "وأنا معه إذا ذكرني" اللہ تعالیٰ کے ذاکرین کے ساتھ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ علم وقدرت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ ہر جگہ اور ہر کسی کے ساتھ ہے تو اس میں ذاکرین کی کیا خصوصیت ہے؟ اور یہ معیت اسی وقت تک ہے جب وہ ذکر کرتا رہے، ایسا کیوں ہے؟ ان نکات سے متعلق نہایت مختصر بات یہ ہے کہ یہاں ایک خاص قسم کی امتیازی اور اختصاصی معیت مراد ہے جو ذاکرین کو دورانِ ذکر نصیب ہوتی ہے [۱] اور اس معیت کی برکت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص قسم کا ربط و تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس بات میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے

---

[۱] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغۃ میں فرمایا ہے کہ اس سے "معیۃ القبول" مراد ہے۔ حجۃ اللہ البالغۃ، باب الأذکار وما یتعلق بہا، ج ۲ ص ۱۹۰.

ساتھ تعلق وربط ہی اصلاح اعمال واخلاق کی چابی اور مذموم اخلاق ومنکرات سے بچنے کی حصن حصین ہے۔

۲:" ذكرته في نفسي "اللہ تعالیٰ کے یاد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یاد کرنے کی مختلف صورتوں میں سے اہم صورت یہ ہے کہ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعمال خیر کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی قربت ومعیت کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے جس کے ساتھ اصلاح اخلاق واعمال کا کام خود بخود ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے اس کی تشریح یہ فرمائی ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر سے حجابات ختم کر دیتے ہیں اور وہ مقام تجلی تک پہنچ جاتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی محفل میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور نیت میں خلوص ہو تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے دل میں اس کی محبت ڈال دیتے ہیں جس کے بعد وہ ایسے شخص کے لئے برکت کی دعاء کرتے ہیں اور زمین میں اس کے لئے قبولیت لکھ دی جاتی ہے۔[1]

۳:" تقربت إليه ذراعا" اللہ تعالیٰ کا تقرّب اس کی خوشنودی اور رضامندی سے عبارت ہے جو عمل کی قبولیت کے بعد ہی ہوتی ہے اور عمل کی قبولیت کے لئے دیگر شرائط میں سے ایک اہم شرط قرآن کریم کے اندر یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ عمل کرنے والا تقویٰ کی صفت کا حامل ہو، قرآن کریم میں ہے:

---

١ حجة اله البالغة: باب الأذكار وما يتعلق به، ج٢ص١٩٠.

{إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ }.[1]

ترجمہ:"اللہ تعالی پرہیز گاروں ہی سے قبول کرتا ہے"۔

اب جب ذکر وعبادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہے تو اس کے ضمن میں اصلاح اخلاق واعمال کی نعمت بھی میسر ہو ہی جاتی ہے کیونکہ اس کے بغیر کامل تقویٰ حاصل نہیں ہوتا اور انسان متقی نہیں کہلاتا۔

تجرباتی اور مشاہداتی دلیل

ب: تجربہ اور مشاہدہ بھی علم کے اسباب میں سے ایک اہم اور بنیادی سبب ہے، مناطقہ اس کو علم یقینی کے اسباب میں سے شمار فرماتے ہیں۔ راہ سلوک وتصوف پر چلنے سے اصلاح اخلاق کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے، یہ سو، ہزار نہیں بلکہ لاکھوں افراد کا تجربہ ہے، کسی خاص دور، طبقے یا قوم کی بات نہیں بلکہ قدیم زمانے سے لے کر آج یوم تحریر تک ہر زمانے میں سینکڑوں طبقات اور اقوام کا مشاہدہ ہے۔ آج بھی صرف برصغیر پاک وہند ہی نہیں بلکہ دنیا کے مختلف اطراف واکناف میں اس کا تسلسل جاری ہے، ہزاروں خانقاہیں کھلی ہیں جہاں سے لاکھوں افراد کی اندرونی اصلاح وتہذیب کا کام چل رہا ہے۔ غرض یہ صرف گزرے لوگوں ہی کا تجربہ نہیں ہے جس کو چاہے نہ چاہے، قبول کرنا ضروری ہو بلکہ آج بھی اس دعویٰ کی سچائی دیکھی اور معلوم کی جاسکتی ہے۔ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ اپنا تجربہ اور پھر حضرات سلف کا تعامل ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] سورة المائدة، رقم الاية: ٢٧.

رأيت الاشتغال بالفقه وسماع الحديث لا يكاد يكفي في صلاح القلب؛ إلا أن يمزج بالرقائق، والنظر في سير السلف الصالحين. فأما مجرد العلم بالحلال والحرام، فليس له كبير عمل في رقة القلب؛ وإنما ترق القلوب بذكر رقائق الأحديث، وأخبار السلف الصالحين؛ لأنهم تناولا مقصود النقل، وخرجوا عن صور الأفعال المأمور بها إلى ذوق معانيها والمراد بها. وما أخبرتك بهذا إلا بعد معالجة وذوق، لأني وجدت جمهور المحدثين وطلاب الحديث همة أحدهم في الحديث العالي، وتكثير الأجزاء، وجمهور الفقهاء في علوم الجدل، وما يغالب به الخصم. وكيف يرق القلب مع هذه الأشياء؟![١]

ترجمہ:"میں سمجھتا ہوں کہ باطن کی اصلاح کے لئے فقہ اور علم حدیث کافی نہیں، جب تک اس کے ساتھ علم باطن اور سلف صالحین کی زندگی پر نظر ہو، دل کی نرمی (اصلاح) میں حلال و حرام کے جاننے کا کچھ زیادہ دخل نہیں ہے، دل تو زہد کے احادیث اور سلف صالحین کے قصوں سے ہی نرم ہوتے ہیں، اس لئے کہ وہ حضرات نصوص کے عملی مصداق تھے اور مامورات کی ظاہری صورتوں سے نکل کر ان کے ذوقی معنی اور مراد کی طرف نکل گئے ہیں اور جو کچھ ان حضرات نے آپ کو بتایا تجربہ اور ذوق کے بعد ہی بتایا، اس لئے کہ میں نے بہت سے محدثین اور حدیث کے طالب علم کو حدیث کی سند عالی کرنے اور زیادہ حدیث جمع کرنے ہی میں پایا اور بہت سے فقہاء

---

[١] صيد الخاطر،فصل:الرقائق والنظر في سير الصالحين، ج١ص: ٢٢٨.

اختلافی مسائل اور مخالف کو ہرانے کی طریقوں کو سیکھنے میں پایاتو ان حالات میں دل کیسے نرم ہو"؟

یہاں تک تو اپنا ذاتی تجربہ بیان فرمایا، اس کے بعد سلف صالحین کا معمول لکھتے ہیں:

وقد كان جماعة من السلف يقصدون العبد الصالح للنظر إلى سمته وهديه لا لاقتباس علمه، وذلك أن ثمرة علمه هديه وسمته. فافهم هذا، وامزج طلب الفقه والحديث بمطالعة سير السلف والزهاد في الدنيا، ليكون سببًا لرقة قلبك.[1]

ترجمہ:"اسلاف کی ایک جماعت کسی بزرگ کی سیرت وزندگی اپنے لئے مشعل راہ بنالیتی، صرف اس کی علمی اقتباسات مقصد نہیں بناتی اور یہ اس لئے کہ اس بزرگ کے علم کا خلاصہ اور فائدہ اس کی زندگی ہوتی تھی، خوب سمجھ لو! فقہ اور علم حدیث کے ساتھ اسلاف اور تارک الدنیا بزرگوں کی زندگی کا مطالعہ شامل کروتاکہ وہ آپ کے دل کی نرمی کا سبب بنے"۔

عقلی دلیل

ج: عقلی لحاظ سے غور کیا جائے تو بھی واضح ہوتا ہے کہ اذکار واشغال کی پابندی سے اصلاح اخلاق کا کام بڑی عمدگی کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان فطری طور پر ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ اپنی مصلحت کے حاصل کرنے اور مضرت کو اپنے سے دور رکھنے کے لئے کوشاں رہتا ہے، جس چیز کو

---

[1] أيضا.

وہ اپنی لئے مصلحت خیال کرتا ہے، اس کو حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے اور جس چیز کو اپنے لئے مضرت ونقصان کا باعث تصور کرتا ہے، اس سے جان بچانے کی فکر کرتا ہے۔ پھر کونسی چیز مصلحت ہے اور کونسی مضرت؟ اس میں انسانوں کے پیمانے بہت مختلف ہیں جس میں مذہب، طبیعت، ماحول اور سوچ وفکر وغیرہ مختلف عناصر کا خاصا دخل ہوتا ہے اور انہی جیسے عناصر کی وجہ سے مصلحت ومضرت اور اچھائی برائی کے مصداق میں بے تحاشا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے لیکن بہر حال انسانی طبیعت میں جمود وٹھہراؤ نہیں ہے بلکہ وہ تطور پسند اور تغیر وتبدیلی قبول کرنے والا ہے، اس لئے ہیشگی اور مواظبت کے ساتھ کوئی کام کیا جائے تو اس کا طبیعت پر ضرور اثر ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ طبیعت ہی کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔

اب اگر پابندی کے ساتھ اس کو ذکر واذکار اور اشغال کا عادی بنایا جائے تو یہ چیزیں اس کی طبیعت کا حصہ بن جاتی ہیں، ان سے انسان کے دل ودماغ بھی ضرور متاثر ہو جاتے ہیں جس کے بعد اخلاق وصفات بھی سنورتے ہیں، اعمال واقوال میں بھی شریعت کی پابندی نصیب ہو جاتی ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں دوام کے ساتھ عمل کرنے کو جو اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے، اس میں ایک یہ حکمت بھی ہے کہ دوام کے ساتھ عمل کرنا آخر کار انسانی اخلاق وعادات میں بڑا مؤثر ثابت ہوتا ہے اور یوں ایک نفل عمل سے بالآخر پوری شریعت پر استقامت کی دولت ہاتھ آجاتی ہے۔

شرعی تکلیف کا دائرہ کار

انسان نہ صرف ظاہری اعمال وافعال کا مکلف ہے اور نہ ہی محض اندرونی اخلاق وصفات کا پابند ہے، خدا کی دی ہوئی یہ جامع ومبارک دین ظاہر وباطن کے حدود کی پابند نہیں ہے بلکہ دونوں ہی طرح احکام وتعلیمات اس نے دی ہے اور دونوں ہی سطحوں پر انسان کو کچھ احکام کا مکلف ٹھہرایا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ شرعی احکام کا تعلق صرف جوارح سے صادر ہونے والے اعمال کے ساتھ ہے، باطن کی دنیا شریعت کے دائرہ اختیار یا دائرہ کار سے آزاد ہے تو یہ ایسا ہی گمراہانہ سوچ وتصور ہے جس طرح یہ تصور زیغ وضلال کا موجب ہے کہ شریعت صرف باطنی احوال وکیفیات سے متعلق ہے اور بس، ظاہری اعضاء اور بدن سے جو کچھ چاہے، کرتا رہے۔

ظاہری جوارح سے صادر ہونے والے اعمال وافعال ہوں یا اندرونی اخلاق وصفات، قرآن وسنت کے نصوص میں دونوں قسم کے اعمال سے متعلق بعض وجوبی احکام دئے گئے ہیں اور بعض استحباب وندب کے درجے کے احکام ہیں، ان دونوں قسم کے احکام کو اپنے مقام ومرتبہ کے مطابق تسلیم کرنا اور پھر نصوص کے اصولی تقاضا کے مطابق اس کی عملی حیثیت کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔

ظاہری اور باطنی اعمال کا باہم ربط وتعلق

البتہ دونوں قسم کے نصوص کو اپنے درجہ کی حد تک تسلیم کرلینے کے بعد اگر قرآن وسنت کے نصوص واحکام پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قسم کے اعمال کا آپس میں گہرا ربط وتعلق ہے، اس حد تک باہمی

وابستگی ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر بار آور اور نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر بنی اسرائیل کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے:

{فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ}.[١]

ترجمہ (حضرت لاہوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ): "پس جب وہ پھر گئے تو اللہ نے ان کے دل پھیر دیئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا"۔

شرط وجزاء کی صورت میں ان دونوں باتوں کو ذکر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ عملی کوتاہی، غفلت اور سرکشی کا دل کے احوال وکیفیات میں خصوصی دخل ہوتا ہے، عملی کوتاہیوں میں تجاز وطغیان کی وجہ سے دل میں بھی گمراہی اور کجروی کی تخم ریزی ہو جاتی ہے۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اپنے مخصوص اسلوب میں انسان اور دیگر حیوانات کے افعال وحرکات میں فرق کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دیگر حیوانات کی طرح انسانی اعمال وحرکات کی حیثیت محض ایسی نہیں ہوتی کہ عمل کیا اور ختم ہو گیا، بلکہ اس کے بھلے برے نتائج واثرات برابر محفوظ رہتے ہیں، ان ظاہری اعمال کا اندرونی صلاحیتوں کے اتار چڑھاؤ میں بڑا کردار ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

والإنسان يفعل أفعالا، فتفنى الأفعال، وتنزع منها أرواحها، فتبلعها النفس، فيظهر في النفس إما نور وإما ظلم.[٢]

---

[١] سورة الصف، رقم الاية: ٥

[٢] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: حجۃ اللہ البالغۃ، باب انشقاق التکلیف من التقدیر، ج ا ص ۵۸۔

ترجمہ: "انسان بہت سے اعمال کرتا ہے وہ اعمال فناء وختم ہو جاتے ہیں اور ان اعمال کی روحیں ان سے کھینچ لی جاتی ہے اور نفس ان کو نگل لیتا ہے پھر ان اعمال کی وجہ سے نفس میں نور یا ظلمت ظاہر ہوتی ہے"۔

یہاں تک تو درج بالا مسئلہ کا ایک پہلو واضح ہوا۔ بہت سی نصوص سے دوسرا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔

نصوص سے جس طرح یہ دونوں پہلوؤں معلوم ہو جاتے ہیں، یوں ہی انسانی نفسیات کا مطالعہ اوراس کے عملی واخلاقی کردار کا تجربہ بھی یہ دونوں باتیں بتاتے ہیں کہ اندرونی محرکات کے بغیر انسان کا عمل صادر نہیں ہوتا، اس محرک کی بھلے برے ہونے کا عمل پر خاص اثر ہوتا ہے، انسانی کردار وگفتار کا بھی بڑی حد تک اس کے اندرونی ضمیر پر اثر پڑتا ہے، نہ باطن ظاہر سے بالکل بیزار ولاتعلق ہے اور نہ ہی ظاہری عمل باطنی صفات واخلاق سے پوری طرح آزاد ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

- ✓ **باب سوم: مذموم اخلاق وعادات**
- ✓ کھانے پینے کا ہوس و حرص
- ✓ زیادہ بولنے کی حرص و ہوس
- ✓ غیظ و غضب
- ✓ بغض و حسد
- ✓ حب مال
- ✓ بخل
- ✓ حب جاہ
- ✓ حب دنیا
- ✓ مادیت
- ✓ کبر و تکبر
- ✓ ریا

باب سوم:

مذموم اخلاق وعادات

کھانے پینے کا ہوس وحرص

دل میں کھانے، پینے کا اس قدر ہوس وحرص کا ہونا جو بسا اوقات انسان کے لئے اس بات کا باعث بن جائے کہ حلال وحرام کی تمیز کئے بغیر اپنی اس اشتہاء کو تسکین دے، یہ ایک مذموم صفت ہے۔

نقصانات

اس ہوس وحرص کے نتیجے میں جب کھانے پینے میں کثرت کی جاتی ہے تو نفسانی اور جنسی خواہشات کا بھی دروازہ کھلنے لگتا ہے، اور جس شخص کو کھانے پینے کا شوق شریعت کی نافرمانی پر مجبور کر سکتا ہے، وہ نفسانی اور جنسی خواہشات کے سامنے عموماً زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا بلکہ بہت جلد ہاتھ ڈال کر اس کا اسیر بن جاتا ہے۔ پھر پیٹ بھرنے کے ہوس اور جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے بلا شبہ مال کی ضرورت پڑتی ہے تو یہ خواہشات انسان کو اس طرف بھی مصروف کر دیتی ہیں اور خاطر خواہ مال کمانے کے بعد اکثر جاہ ودبدبہ کی خواہش اور امتیازی شان حاصل کرنے کا جذبہ دل میں پیدا ہو جاتا، یہی مال وجاہ کی محبت اور شہوت پوری کرنے کا ہوس ہی ہیں جو تقریباً تمام گناہوں اور منکرات کا سرچشمہ ہے ۔ گویا ایک کھانے پینے کی ہوس انسان کو معاصی ونافرمانیوں کی طویل گھاٹیوں میں لے پہنچاتی ہے۔

اس ہوس کی مذمت میں چند روایات

"سننِ ابنِ ماجہ" میں ہے:

"ما ملأ آدمي وعاء شرا من بطن، حسب الآدمي لقيمات يقمن صلبه، فإن غلبت الآدمي نفسه، فثلث للطعام، وثلث للشراب، وثلث للنفس".[١]

ترجمہ: "ابن آدم نے پیٹ سے زیادہ بدترین کسی برتن کو نہیں بھرا، حالانکہ ابن آدم کے لئے تو اتنے لقمے ہی کافی ہیں جو اس کی کمر کو سیدھا رکھ سکیں، اگر زیادہ کھانا ہی ضروری ہو تو ایک تہائی کھانا ہو، ایک تہائی پانی ہو اور ایک تہائی سانس لینے کے لئے ہو"۔

"مجمع الزوائد" میں ہے:

وعن أبي جحيفة، قال: «أكلت ثريدا وأتيت النبي - صلى الله عليه وسلم - فتجشأت عنده، فقال: " يا أبا جحيفة، إن أطول الناس جوعا يوم القيامة أكثرهم شبعا في الدنيا».[٢]

ترجمہ: "حضرت ابوجحیفہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہے کہ میں نے ثرید (ایسے گوشت کے شوربے کو کہتے ہیں جس میں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر کچھ دیر کے لیے رکھ دیے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ ٹکڑے شوربے میں بھیگ کر خوب نرم ہو جاتے ہیں) کھایا اور آپ ﷺ کے پاس آیا تو میں نے ڈھکار لی، آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوجحیفہ، جو

---

[١] سنن ابن ماجه ت الأرنؤوط باب ،الاقتصاد في الأكل وكراهية الشبع ،ج٤ص ٤٤٨.

[٢] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب في عيش رسول الله صلى الله عليه وسلم والسلف ،ج١٠ص ٣٢٣-رقم الحديث:١٨٢٨١.

شخص دنیا میں سب سے زیادہ کھانے والا ہو گا قیامت کے دن وہ سب سے زیادہ بھوکا ہو گا"۔

"مجمع الزوائد" میں ایک دوسری جگہ ہے:

عن أنس بن مالك: «قال إن فاطمة - رضي الله عنها - ناولت النبي - صلى الله عليه وسلم - كسرة من خبز شعير، فقال: " هذا أول طعام أكله أبوك منذ ثلاثة أيام» ".[1]

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا پیش کیا، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ پہلا کھانا ہے جو تمہارے والد تین دن بعد کھا رہا ہے"۔

باعث واسباب

کھانے پینے کی خواہش تو انسان کی فطری وطبعی خصلت وجذبہ ہے جو ایک حد تک ضروری بھی ہے اور اسی لئے شریعت مبارکہ نے بھی اس حد تک کھانے پینے کو ضروری قرار دیا جس کے چھوڑنے سے جان تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو، لیکن اس فطری جذبے کو بے لگام چھوڑا جائے تو کچھ ہی عرصے بعد حرص وہوس میں تبدیل ہو جاتا ہے اور مزید اگر ڈھیل دی جاتی رہے تو حد درجہ راسخ ہو جاتا ہے جس کے بعد اس کو قابو کرنا نہایت مشکل بن جاتا ہے۔

---

[1] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: باب في عيش رسول الله صلى الله عليه وسلم والسلف، ج١٠ ص ٣١٢. رقم الحديث: ١٨٢٣٣.

علاج

اس کا علاج "مجاہدہ" ہے یعنی تکلف کر کے ضرورت سے زیادہ کھانے پینے کو چھوڑ دیا جائے اور کبھی کبھار تھوڑی بہت بھوک وپیاس کا موقع پیدا کرتا رہے۔ طبعی خصلتوں کو یکدم چھوڑنا مضر بھی ہے اور اکثر ایسا اقدام ناکام بھی ثابت ہوتا ہے، اسی لئے تدریج سے کام لیتے رہنا ضروری ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص تین چپاتی کھاتا ہے اور جسم کی ضرورت ایک چپاتی سے پوری ہو جاتی ہے تو فوراً دو چپاتیوں کو چھوڑنا ضروری نہیں ہے بلکہ اپنی گنجائش اور استطاعت کے مطابق تھوڑا تھوڑا کم کرتا رہے یہاں تک کہ ایک چپاتی پر اکتفاء کرنے کا عادی بن جائے۔

یہی اس مذموم حرص وہوس کا مفید اور مؤثر علاج ہے، اس میں تکلف اور مجاہدہ سے کام لینا ضروری ہے، اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے، البتہ اگر بھوک کے فضائل وفوائد کو اچھی طرح سمجھا جائیں اور پھر حسب موقع ان کا استحضار ہو جایا کرے تو تکلف کا یہ سفر بڑی حد تک سہولت کی روپ دھار لیتی ہے اور پھر بھوکا رہنا طبعی طور پر اگرچہ شاق گزرے گا لیکن عقلی طور پر اس میں لذت وفائدہ محسوس ہوگا، یوں اس کی پابندی کرنا کوئی زیادہ مشکل نہیں رہے گا۔

بھوک کے فوائد

بھوک کے بعض فوائد یہ ہیں:

ا: بھوک کی وجہ سے دل میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے، ذکر وعبادت اور دعاء ومناجات میں حلاوت محسوس ہوتی ہے، اس لئے سلف صالحین کے ہاں اس کا خصوصی اہتمام ہوتا تھا، خود حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے حضرات صحابہ کرام

(رضوان اللہ علیہم) بھی ہمیشہ پیٹ بھر کھانا نہ کھاتے تھے بلکہ بسا اوقات بھوک کی کیفیت میں رہتے تھے۔

۲: انسان جو کچھ نافرمانی کرتا ہے، اس میں نفس کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے جبکہ بھوک وپیاس سے اسی نفس کا زور ماند پڑ جاتا ہے، اگر تسلسل کے ساتھ اس طرح مجاہدہ برقرار رہے تو بڑی حد تک نفس قابو میں آجاتا ہے۔ شریعت مطہرہ میں روزے کو جو فرض کیا گیا ہے، اس میں ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ اس سے نفس کی طاقت ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے بعد انسان تھوڑی بھی ہمت سے کام لے لے تو تقویٰ کی زندگی اختیار کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے روزہ کی فرضیت کے ساتھ ایک یہ غرض بھی بیان فرمایا ہے کہ " تاکہ تم تقویٰ اختیار کریں" اور اسی لئے جنسی شہوت کے علاج کے لئے بھی روایات میں روزے کا حکم دیا گیا ہے۔

۳: بھوک وپیاس کی شدت جب انسان کو نڈھال کر دے تو اس سے عقل مند انسان کے لئے:

الف: ایک تو آخرت کے عذاب کا کچھ نمونہ دیکھنے کو مل جاتا ہے اور اس سے بچنے کی اہمیت وضرورت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ب: غریب اور مسکین لوگوں کی حالت کا کچھ تھوڑا سا مشاہدہ ہو جاتا ہے اور ان پر رحم وکرم کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔

ج: کھانے، پینے اور دیگر نعمتوں کی قدر دانی پیدا ہو جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے تعلق خاطر پیدا ہونے کا کامیاب ذریعہ بن سکتا ہے۔

۴: بدن ہلکا اور چست رہتا ہے، ذکر وعبادت کرنے میں کوئی زیادہ گرانی پیش نہیں آتی۔ زیادہ نیند بھی زیادہ کھانے پینے کا نتیجہ ہے، لہٰذا بھوک ہو تو نیند کم آتی ہے اور عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ کام آجاتا ہے۔

۵: قناعت اور ایثار جیسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں، حوادث ومشکلات کے وقت سہولت رہتی ہے۔

زیادہ بولنے کی حرص وہوس

بولنے کا ایسا شوق وجذبہ جس کے نتیجے میں جائز وناجائز کی تمیز باقی نہ رہے، مذموم صفت ہے۔

نقصانات

زبان کی جسم وساخت تو بہت چھوٹی ہے اور بظاہر ایک معمولی سا عضو ہے لیکن ظاہری تمام اعضاء میں شاید سب سے زیادہ گناہ ومعاصی اسی سے صادر ہوتے ہیں اور عذاب پانے والے لوگوں میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوگی جو اسی معمولی عضو کے غلط استعمال کی وجہ سے عذاب پانے کے مستحق ہوں گے۔ زبان سے کیا کچھ معاصی صادر ہوتے ہیں؟ اس کی تفصیل بڑی طویل ہے،امام غزالی رحمہ اللہ نے "اربعین" میں بیس ذکر کئے ہیں۔ علامہ برکوی رحمہ اللہ نے "طریقہ محمدیہ" میں اس سے وابستہ ساٹھ منکرات کا ذکر فرمایا ہے۔ تاہم غور کیا جائے تو بنیادی طور پر ان منکرات کی دو قسمیں ہیں:

الف: ایسی باتیں کرنا جو بذات خود ناجائز ہوں، مثلاً جھوٹ بولنا، تہمت لگانا، غیبت کرنا، کفریہ کلمات استعمال کرنا، وغیرہ۔

ب: بذات خود تو بات جائز ہو لیکن اس کا مقصود یا نتیجہ درست نہ ہو، اس کی وجہ سے شریعت کی نظر میں ایسی بات کرنا ممنوع ٹھہر جائے، مثال کے طور پر اپنے بے جا بڑائی بتلانے، غیر مشروع طور پر حب جاہ حاصل کرنے یا بے جا کسی مسلمان کو تکلیف واذیت پہنچانے کی غرض سے کوئی ایسی بات کی جائے جس میں ظاہری طور پر خلاف شرع کوئی پہلو موجود نہ ہو۔

مذمت میں چند احادیث:

"مستدرکِ حاکم" میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: سئل النبي صلى الله عليه وسلم عن أكثر ما يدخل الناس الجنة، قال: «التقوىٰ وحسن الخلق» وسئل عن أكثر ما يدخل الناس النار، فقال: " الأجوفان: الفم والفرج.[1]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ جنت میں لے جانے والی چیز کے بارے میں پوچھا گیا؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ تقوی یعنی اللہ سے ڈرنا اور اچھے اخلاق ہیں اور زیادہ جہنم میں لے جانے والی چیز کے بارے میں پوچھا گیا؟ تو فرمایا: وہ کھوکھلی چیزیں یعنی منہ اور شرمگاہ ہے"۔

"مسندِ احمد" میں ہے:

---

[1] المستدرك على الصحيحين للحاكم رقم الحديث: ٧٩١٩، ج٤ص ٣٦٠.

عن معاذ، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: " ثكلتك أمك، وهل يكب الناس على مناخرهم في جهنم إلا حصائد ألسنتهم؟ [١]

ترجمہ: "حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ، نبی کریم ﷺ نے (پیار سے ڈانٹتے ہوئے) ارشاد فرمایا معاذ! تمہاری ماں تمہیں روئے لوگوں کو ان کے چہروں کے بل جہنم میں ان کی دوسروں کے متعلق کہی ہوئی باتوں کے علاوہ بھی کوئی چیز اوندھا گرائے گی؟"۔

"معجم الکبیر" میں ہے:

عن عبد الله، أنه ارتقى الصفا فأخذ بلسانه فقال: يا لسان، قل خيرا تغنم، واسكت عن شر تسلم، من قبل أن تندم، ثم قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: «أكثر خطايا ابن آدم في لسانه». [٢]

ترجمہ: "حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ وہ صفا چوٹی پر چڑھے اور زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا: اے زبان خیر کی بات کیا کرتو فائدہ میں رہے گی اور شر کی باتوں سے خاموش رہ تو سلامت رہے گی اس سے پہلے کے تو شرمندہ ہو، پھر فرمایا: کے میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ابن آدم کی اکثر خطائیں اُس کی زبان سے ہوتی ہیں"۔

بواعث واسباب

قوت گویائی تو انسان کا وہ بنیادی وصف ہے جو اس کو دیگر جانوروں سے ممتاز کر کے عزت وشرافت کے صف میں کھڑا کر دیتا ہے، فی نفسہ بولنا مذموم نہیں، البتہ

---

[١] مسند أحمد ط الرسالة، ج٣٦ص ٣٨٣- رقم الحديث : ٢٢٠٦٣.

[٢] المعجم الكبير للطبراني، ج١٠ص ١٩٧،رقم الحديث:١٠٤٤٦.

"غفلت" اور "اندرونی صفاتِ بد" دو ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے زبان سے معصیت کا صدور ہو جاتا ہے، چنانچہ یا تو اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ زبان سے جو کچھ نکل رہا ہے وہ جائز ہے یا نہیں؟ شریعت کی تعلیمات کے خلاف کوئی بات تو اس سے نہیں نکل رہی؟ اور بسا اوقات اس پہلو سے مکمل بے فکری تو نہیں ہوتی لیکن دل میں بعض مذموم صفات وعادات اس حد تک راسخ ہو جاتی ہیں جو جان بوجھ کر انسان کو ناجائز بات کہنے پر آمادہ کر دیتی ہیں، مثلاً معلوم ہے کہ مسلمان کو گالی دینا، گالم گلوچ کرنا اور زبان سے اس کی بے عزتی کرنا، سب ناجائز اور ممنوع باتیں ہیں لیکن غصہ میں آکر یہ سارے کام کر گزرتا ہے، اسی طرح یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہوتی کہ مسلمان کی غیبت کرنا، اس پر بہتان تراشی کرنا جرم وحرام ہے لیکن بسا اوقات حسد کی آگ اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ غیبت وبہتان تراشی کا بار بار ارتکاب کیا جاتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اپنی بڑائی جتانا اور مسلمان کی تحقیر ومذمت کرنا حرام ہے؟ لیکن بعض اوقات خود پسندی اور اپنی بڑائی وعظمت کا بت اس قدر سر پر سوار ہو جاتا ہے کہ انسان اپنی مناقب کے مینار بھی قائم کرتا ہے، دوسرے مسلمان کی تذلیل وتحقیر کر گزرتا ہے۔

بقول غالب:

جانتا ہوں ثواب زہد وطاعت پر طبیعت ادھر نہیں آتی

غرض غور کیا جائے تو جس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے زبان درازی کی جاتی ہے، وہ ضرور کسی مذموم صفت کا نتیجہ اور اسی کا ثمرہ ہوتی ہے۔

حل وعلاج

گفتار کی اس ہوس وحرص کو معاصی سے پاک رکھنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں:

الف: ایک تو مجاہدے اور ہمت سے کام لیا جائے کہ جو کچھ بولنا چاہے، اس پر پہلے دو پہلو سے غور کیا جائے کہ:

الف: یہ بات کہیں ناجائز یا ممنوع تو نہیں ہے؟

ب: بات کرنے کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کا اثر و نتیجہ کیا ہو گا؟ مقصد اور نتیجے میں کوئی ناجائز عنصر تو شامل نہیں؟

پہلے پہل تو ایسا کرنا کافی تکلیف ومشقت کا باعث ہوتا ہے اور قدم قدم پر آدمی کبھی بھول چوک کا شکار ہو جاتا ہے اور کبھی مغلوبیت کا منہ دیکھتا ہے یا اس کے علاوہ حوصلہ شکن مراحل سے سامنا کرنا پڑتا ہے، ان باتوں کی وجہ سے بار بار ہمت ہارنے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے لیکن خلوص و استقامت کے ساتھ کام کرتے رہنے سے مجاہدہ بھی طبیعت کا حصہ بن جاتا ہے اور مزید اس میں کچھ زیادہ کلفت ومشقت کا ارتکاب نہیں کرنا پڑتا۔

ب: جن باطنی مذموم صفات کی وجہ سے انسان مغلوب ہو کر ناجائز کہنے پر آمادہ ہوتا ہے، ان کی اصلاح ودرستگی پر خوب توجہ کی جائے، تاکہ رفتہ رفتہ ان کا رسوخ ختم ہو جائے اور زور اس حد تک ٹوٹ جائے کہ خلاف شریعت زبان کھولنے پر انسان کو نہ ابھار سکیں۔

غیظ وغضب کی صفت

یوں تو غضب کو اردو اور بعض دیگر زبانوں میں غصہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن یہاں اس سے وہ انتقامی جذبات مراد ہیں جو کسی ناپسندیدہ واقعہ کے سامنے آنے پر دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

غضب وغصہ بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ طریقہ اور موقع استعمال کے اعتبار سے واجب، مندوب اور مباح بھی ہو سکتی ہے اور مکروہ وحرام بھی۔ لیکن غضب کی صفت جب دل میں راسخ اور غالب آجاتی ہے تو اس کے بعد اس کے ناجائز استعمال سے حفاظت نہایت مشکل ہو جاتی ہے ، عموماً ایسا ہوتا ہے کہ فائدے کے بجائے اس کے نقصانات زیادہ سامنے آتے ہیں ، شعوری یا لاشعوری طور پر متعدد معاصی اسی کی بدولت انسان سے صادر ہوتے ہیں، اس لئے اس کی عمومی مذمت کی جاتی ہے۔

روایات

"مؤطاامام مالک" میں ہے:

عن أبي هريرة؛ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «ليس الشديد بالصرعة. إنما الشديد الذي يملك نفسه عند الغضب».[١]

---

[١] موطأ مالك ت الأعظمي،باب ما جاء في الغضب، ج٥ص ١٣٣٢.

ترجمہ:"حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طاقت ور وہ آدمی نہیں ہے جو کشتی میں کسی کو پچھاڑ دے، بلکہ وہ آدمی طاقت ور ہے، جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے"۔

"صحیح ابنِ حبان" میں ہے:

عن عبد الله بن عمر قال: قلت: يا رسول الله ما يمنعني من غضب الله؟ قال: "لا تغضب".[1]

ترجمہ:"عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہے کہ: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ کیا چیز مجھے اللہ کے غضب سے بچائے گی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غصہ نہ ہوا کر"۔

"مسندِ احمد" میں ہے:

عن الأحنف بن قيس، عن عم له يقال له: جارية بن قدامة، أن رجلا قال له: يا رسول الله، قل لي قولا وأقلل علي لعلي أعقله، قال: " لا تغضب " فأعاد عليه مرارا كل ذلك يقول: " لا تغضب " قال يحيى: قال هشام: " قلت: يا رسول الله، وهم يقولون: لم يدرك النبي صلى الله عليه وسلم".[2]

ترجمہ:"حضرت جاریہ بن قدامہؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی مختصر نصیحت فرما دیجیے شاید میری سمجھ

---

[1] صحيح ابن حبان: ذكر رجاء الأمن من غضب الله لمن لم يغضب لغير الله جل وعلا، ج۱ص ۵۳۱.

[2] مسند أحمد ط الرسالة، ج۲۵ص ۳۳۰-رقم الحديث: ۱۵۹٦٤.

میں آجائے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: غصہ نہ کیا کرو۔اس نے کئی مرتبہ اپنی درخواست دہرائی، اور نبی ﷺ نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کیا کرو"۔

نقصانات

غصہ ایسی صفت ہے جس کے ہوتے ہوئے انسان تمام گناہ کر گزر سکتا ہے، کیونکہ عقل ودماغ ہی کی وجہ سے آدمی گناہوں اور برائیوں سے محفوظ رہتا ہے، نفس کی چاہت اور دل کی خواہش کے باوجود بہت سے کام انسان اس لئے نہیں کرتا کہ وہ شرعاً ممنوع یا عرفاً معیوب سمجھتے جاتے ہیں جبکہ غصہ کی حالت میں یہی عقل مغلوب ومستور ہو کر اپنا کام کرنا چھوڑ جاتا ہے جس کے بعد انسان اور منکرات کے درمیان مزید کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ پاتا، اس حالت میں شیطان جو چاہے، اس سے کرواسکتا ہے۔ لہٰذا وہ گالم گلوچ، غیبت ومذمت اور بدزبانی بھی کر سکتا ہے، ہاتھ پاؤں سے ظلم وزیادتی کا بھی ارتکاب کر سکتا ہے، دیگر اعضاء وجوارح کو بھی گناہ ونافرمانیوں کی آلودگی سے محفوظ نہیں رکھ پاتا۔

بواعث واسباب

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے غصہ بذات خود ایک فطری جذبہ ہے، غصہ کا آنا بھی انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات بے اختیار اور اختیار وقصد کے برخلاف بھی غصہ آنے لگتا ہے، لیکن ناجائز حد تک غصہ کرنے میں عموماً کبر اور حب جاہ کی قوت کارفرما ہوتی ہے، غصہ کرنے والا اپنے آپ کو اس سلوک سے کہیں زیادہ بہتر رویہ کا مستحق سمجھتا ہے جو اس کے ساتھ برتا گیا ہو اور جس کی بناء پر وہ غصہ

کر رہا ہوتا ہے، یا بعض اوقات انسان اپنے بندگی کی حیثیت سے تجاوز کر کے اس بات پر غصہ کرنے لگتا ہے کہ میرے مرضی کے خلاف کام کیوں ہو رہا ہے؟۔

علاج و تجویز

ا ا: علمی و نظریاتی تدبیر:

غصہ کے مقتضی پر عمل کرنے کے جو کچھ نقصانات نصوص میں وارد ہوئے ہیں، ان کا استحضار کر کے نفس کو اس سے ڈرایا جائے اور صبر وبرداشت کرنے کے جو کچھ فضائل و فوائد بیان فرمائی گئی ہیں، ان کا استحضار کر کے دل کو اس کے حاصل کرنے کی طرف راغب کیا جائے۔ کچھ بھی نہ ہو تو غصہ کے مقتضی پر عمل کرنے کا بڑا نقصان یہی ہے کہ اس سے آدمی گناہ گار ہو جاتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذریعہ ہے اور انسان کے مقصد تخلیق کے منافی ہے اور حلم وبرداشت میں اور کوئی فائدہ نہ بھی ہو تو بھی دنیوی لحاظ سے یہی کافی ہے کہ اس صورت میں عقل وفکر کے مقتضی پر عمل کرنے کی نوبت آئے گی جس پر بعد میں ندامت اور پشیمانی کی ضرورت نہ ہوگی اور اخروی لحاظ سے یہی فائدہ بہت کچھ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا ذریعہ اور اس کی طرف سے مغفرت وانعام حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔

عملی تدبیر

۲: اگر کہیں غصہ کی لپیٹ میں آکر کوئی ایسی حرکت صادر ہو جائے جو شرعاً جائز نہ ہو، مثلاً زبان درازی، گالم گلوچ اور ظلم وزیادتی وغیرہ، تو ہوش آنے کے فوراً بعد متعلقہ فرد / افراد سے معافی مانگ لی جائے، اگر کسی کا مالی نقصان کیا ہو تو اس کی تلافی بھی کر دی جائے۔ زیادتی اور غلطی اگر لوگوں کے سامنے علانیہ طور پر ہوئی ہو

تو معافی بھی اسی طرح کھلے ماحول میں مانگ لی جائے، اگر پوشیدہ طور پر ایسا ہوا ہو تو پوشیدہ طور پر معافی و تلافی بھی کافی ہے۔

۳: روایات میں اس کا یہ علاج بھی ذکر فرمایا گیا ہے کہ غصہ کے وقت تعوذ کہی جائے یعنیٰ اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لی جائے اور حالت بدل لی جائے چنانچہ اگر کھڑے حالت میں غصہ کا شکار ہوا تو بیٹھ جائے، اگر بیٹھنے میں ایسا ہوا تو لیٹ جائے اور بہتر تدبیر یہ ہے کہ جگہ ہی تبدیل کرے، اس طرح کرنے سے بھی غصہ کی کیفیت فرو نہ ہو تو ٹھنڈے پانی سے وضوء کرے۔ اسی طرح ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مؤاخذہ کرنے کی طاقت کا مراقبہ بھی اس باب میں بڑا مفید ہے اور یہ بہت مجرب اور معقول بھی ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ غصہ کے مرض میں مبتلا شخص مناسب اوقات میں بار بار یہ مراقبہ کر لیا کرے کہ جس شخص پر میں غصہ نکال رہا ہوں، اس پر جس قدر قدرت میں رکھتا ہوں، اس سے کہیں زیادہ طاقت و قدرت اللہ تعالیٰ کو خود میرے اوپر حاصل ہے اور اس شخص نے میرا اتنی حق تلفی نہیں کی جتنی میں نے اپنے قادر مطلق رب کی ہے اور کر رہا ہوں، پھر بھی وہ مجھے بخش رہا ہے، میں بھی اسی بخشش کا امیدار و طالب ہوں تو کیوں نہ اس بے چارے کے ساتھ میں وہی سلوک کروں جو اپنے ساتھ پسند کرتا ہوں؟

بغض و حسد

"کسی شخص سے دینی یا دنیوی نعمت چھن جانے یا وصول ہی نہ ہونے کا تمنا کرنا" حسد کہلاتا ہے۔ یہ ان عاداتِ بد اور قبیح صفات میں سے ایک ہے جن کو ہر سلیم الفطرت شخص مذموم سمجھتا ہے چاہے اس کا دین اسلام سے کوئی رشتہ نہ بھی

ہو، تو بھی جو شخص اس میں مبتلا ہوتا ہے وہ خود اس کے نقصانات و نتائجِ بد سے تنگ آکر چاہتا ہے کہ کسی طرح اس مرض سے جان چھوٹ جائے۔

البتہ اس کے شرعی حکم میں درجِ ذیل تفصیل ہے:

الف: اختیاری طور پر ایسے جذبات کو دل میں جگہ دی جائے یا دل کی زمین پر اس کی تخم ریزی کی جائے، تو حرام ہے۔

ب: غیر اختیاری طور پر حسد کا یہ جذبہ دل میں پیدا ہو جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ دل سے اس کی مذمت وانکار بھی کرتا رہے، تو بالاتفاق ممنوع نہیں ہے کیونکہ اس سے زیادہ انسان کے اختیار میں نہیں۔

ج: غیر ارادی طور پر حسد کا جذبہ پیدا ہو جائے اور عملی طور پر اس غلط جذبے کے مقتضی پر عمل کیا جائے، مثال کے طور پر زید کا خالد کے ساتھ حسد ہوا اور زبان سے اس کی غیبت یا الزام تراشی شروع کر دی، اس کی حیثیت گھٹانے یا لوگوں کو اس سے متنفر رکھنے کے لئے اس کی عیب جوئی کرنے لگا، یا اس غرض سے اس کے ساتھ ضروری تعلقات تک چھوڑ دئے، وغیرہ۔ یہ بالاتفاق ناجائز اور ممنوع ہے، حسد کے متعلق جتنی وعیدیں وارد ہوئی ہیں، ان کا ایک بڑا مصداق یہی صورت ہے۔

د: غیر ارادی طور پر حسد کا جذبہ پیدا ہوا، دل میں اس پر کوئی نکیر وملامت نہیں کی لیکن ساتھ اس کے مقتضی پر بھی عمل نہیں کیا، بلکہ عملی طور پر اپنے زبان وغیرہ تمام اعضاء کو حسد کے مقتضی پر عمل کرنے سے روکا۔ اس بات پر تو اتفاق ہے کہ اس حد تک حاسدانہ جذبات رکھنا بھی ناپسندیدہ ہے اور ایک صالح مسلمان کا کمال

اسی میں ہے کہ اس پر اکتفاء نہ کرے بلکہ اس سے بڑھ کر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی اور محبت کے جذبات رکھے۔ لیکن فقہی نقطہ نظر سے اس صورت کا کیا حکم ہے ؟کیا یہ مذموم وحرام حسد کے تحت داخل ہے یا نہیں ؟اس کے متعلق محققین کا اختلاف ہے، امام غزالی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ صورت بھی ناجائز اور ممنوع ہے کیونکہ دل سے نکیر ومذمت کرنا تو اس کے اختیار میں ہے ،اس کو ترک کرنا جرم ہے۔جبکہ علامہ برکوی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق یہ ممنوع حسد کے تحت داخل نہیں۔[1]

نقصانات

حسد کی بیماری آگ کے مانند ہے،اس مرض کی وجہ سے انسان کو بہت کچھ نقصانات بھگتنے پڑتے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

ا: یہ نیکیوں کے برباد ہونے کا ذریعہ ہے،"سنن ابوداؤد"کی روایت ہے:

عن أبي هريرة، أن النبيَّ – صلى الله عليه وسلم – قال:" إياكُم والحَسَدَ، فإنَّ الحَسَدَ يأكُلُ الحَسَناتِ كما تأكُلُ النارُ الحَطَبَ – أو قال: العُشب".[2]

ترجمہ:"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :تم حسد کے مرض سے بچو، حسد آدمی کی نیکیوں کو اس طرح کھاجاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھاجاتی ہے یاخشک گھاس کو"۔

---

[1] دلائل کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں:طریقہ محمدیہ،ص۲۳۹اوراس کی شروحات۔

[2] سنن أبي داود ت الأرنؤوط: باب في الحَسَد، ج٧ص ٢٦٤.

۲: حسد کی چنگاری بہت سے گناہوں کے لئے تخم کی مانند ہے، جب تک دل میں یہ جذبہ موجود ہو توکسی بھی وقت خطرہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو محسود کے متعلق کسی معصیت پر مجبور کرے۔ عصرِ حاضر میں غیبت، تہمت، بدزبانی، گالم گلوچ، کسی کے دکھ درد پر خوش ہونا، بے موقع بد دعائیں دینا اور مسلمان کی حق تلفی کی بیسیوں صورتیں عام طور پر اسی جذبہ حسد کے برگ وبھار ہیں۔ اس لئے ایک حدیث شریف میں حسد وبغض کو دین (اور نیکیوں) کا مونڈھنے والا قرار دیا گیا ہے، "جامع ترمذی" کی روایت ہے:

عن أم الدرداء، عن أبي الدرداء، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا أخبركم بأفضل من درجة الصيام والصلاة والصدقة، قالوا: بلى، قال: صلاح ذات البين، فإن فساد ذات البين هي الحالقة.[1]

ترجمہ: "حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو روزہ نماز اور صدقہ سے افضل ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کیوں نہیں! آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا آپس میں محبت اور میل جول، اس لئے کہ آپس کا بغض تباہی کی طرف لے جاتا ہے"۔

۳: مسلسل پریشانیوں کا شکار رہنا۔ حسد کا دنیوی نقصان یہ ہے کہ انسان ہمیشہ پریشانی میں رہتا ہے، محسود شخص کی ترقی وخوش حالی اس کے لئے پریشانی کا سبب بنتا

---

[1] سنن الترمذي ت بشار: رقم الحديث: ٢٥٠٨، ج٤ص ٢٤٤.

ہے، یوں تو ہر شخص پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ہمیشہ تسلسل رہتا ہے اور احسان مندی کے نظر سے دیکھا جائے تو ہر شخص ہر آن ہزاروں نعمتوں تلے دبا رہتا ہے لیکن بد قسمتی سے حسد کی آنکھ اکثر اوقات غیر واقعی نعمتوں کو بھی نعمتیں سمجھنے لگ جاتی ہے اور حاسد کے پریشانیوں کے حشر سامانی میں ایسی غیر حاصل شدہ نعمتوں کو بھی جگہ دے یدیتی ہے۔

۴: حسد، اللہ تعالیٰ سے تعلق کی نعمت اور اس کی حلاوت سے محرومی کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق اس دنیا کی شاید سب سے بڑی نعمت اور عظیم سعادت ہے لیکن اس کے لئے بنیادی کڑی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر معمولی اور غیر مشروط طور پر محبت و عشق کا رشتہ استوار کیا جائے اور حسد اس راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے، چنانچہ حاسد، گو غیر شعوری و غیر ارادی طور پر ہو، محسود کی نعمتوں کو دیکھ کر کسی حد تک ضرور نالاں رہتا ہے، رضاء بالقضاء کی فضیلت اس کو عموماً نصیب نہیں ہوتی، جبکہ یہی بندگی اور سرّ زندگی ہے۔

بواعث واسباب

حسد کا یہ مادہ انسان کے باطن میں کیوں جنم لیتا ہے؟ اس کے مختلف اسباب ہیں، جن میں اہم اور بنیادی اسباب یہ ہیں:

۱: نفس کی خباثت: بعض طبیعتوں میں اس حد تک خبث ہوتا ہے کہ دوسرے شخص کو نعمت یا خوشی کا ملنا ان کے لئے بلا وجہ دردِ سر کا باعث ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو صرف اپنے ہی حد تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ

اپنی اس طبیعت کے مقتضی پر بالکل عمل نہ کرے اور ان طبعی صفات وجذبات کا دل ہی دل میں انکار ومذمت کرتا رہے۔

۲: کبر وبڑائی: متکبر طبیعت اس لئے حسد پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ اگر اس کے کسی ہمسر یا ماتحت کو نعمت نصیب ہوتی ہے یا عہدہ ومنصب وغیرہ کوئی کمال وہنر ہاتھ آجاتا ہے تو خود وہ شخص اس کی ماتحتی سے نکل جائے گا، اس پر اس کی بڑائی وبرتری ظاہر نہ ہوسکے گی یا اس نعمت کی وجہ سے دیگر لوگ محسود کی بڑائی کا بت اپنے اوپر سوار کریں گے۔

۳: فوات مقصود: دو افراد ایک چیز کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، ایک کو وہ چیز ہاتھ آجاتی ہے اور دوسرا اس کی وجہ سے خالی ہاتھ رہ جاتا ہے تو حسد کرنے لگتا ہے، مثلاً زید وعمر، دونوں کسی جگہ کو خریدنے یا کسی خاص عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور دونوں کوشش کرتے ہیں لیکن زید بازی لے جاتا ہے اور عمر محروم رہ جاتا ہے، اب زید کو نعمت ملنے کی وجہ سے چونکہ زید بے مراد رہا، اس لئے وہ اس بات کی وجہ سے حسد کرنے لگتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح زید سے بھی یہ نعمت چھن جائے اور میری طرح وہ بھی نامراد رہ جائے۔

علاج وتدبیر

دیگر تمام اخلاق مذمومہ کی طرح اس کے علاج مؤثر ہونے کی بھی دو تدبیریں ہیں، ایک علمی اور نظریاتی اور دوسرا عملی۔

علمی اور نظریاتی علاج

علمی اور نظریاتی طور پر تو ذہن میں یہ بات بٹھائے اور بار بار اس کا مراقبہ ومذاکرہ بھی کرتا رہے کہ حسد کا حاصل کیا ہے؟ اور اس کے نتیجے میں خود حاسد کو کیا فائدہ ملے گا؟ یا محسود کو اس سے کیا نقصان پہنچے گا؟ ظاہر ہے کہ حسد سے محسود کا نقصان تو کیا ہوتا کہ الٹا اس کے ساتھ ایک گونہ احسان ہے کہ زید کی حسد کی وجہ سے ماجد کو نقصان کچھ نہیں پہنچتا بلکہ اکثر اس بے چارے کو علم ہی نہیں ہوتا کہ زید دل میں میرے لئے کیا جذبات رکھتا ہے، لیکن زید کی طرف سے ماجد کو نیکی اور ثواب پہنچنے کا امکان برابر برقرار رہتا ہے۔ دوسری طرف زید ہمیشہ کوفت ومصیبت میں رہتا ہے جو کہ ماجد کے لئے بڑے فائدہ کی بات شمار ہوتی ہے کیونکہ دنیا میں انسان یہی چاہتا ہے کہ اس کے دشمن پریشان حال ہی رہے، تو حسد کرنے کی وجہ سے آخر زید کو دنیوی یا اخروی کونسا فائدہ حاصل ہوا؟ اور اس کی وجہ سے محسود کا کیا نقصان ہوا؟

عملی علاج:

الف: جب کبھی دل میں کسی سے متعلق حسد کا جذبہ جنم لینے لگے تو دل ہی دل میں اس کی مخالفت کی جائے اور اس کی خوب مذمت کی جائے۔

ب: حسد کے مقتضی پر کبھی عمل نہ کرے بلکہ اس کے خلاف ہی اقدام کرے گو دل نہ چاہے، مثلاً زید کو ماجد سے حسد ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی خوب عیب جوئی کرکے بدنام کرے تاکہ لوگ اس سے متنفر ہو جائیں، تو اس کو چاہئے کہ نفس کی اس غلط خواہش کی مخالفت کرکے ماجد کی کچھ نہ کچھ تعریف کرے کہ لوگ اس سے بلا

وجہ متنفر نہ ہوں، اسی طرح زید حسد کے مارے ماجد کو سلام کرنا ہی نہیں چاہتا تو تکلف کر کے سلام کرے۔

حبّ مال

اپنے ساتھ مال رکھنے کی محبت جب اس درجہ راسخ ہو جائے کہ انسان بہر صورت مال کمانے یا اپنے پاس رکھنے پر آمادہ ہو جائے، حبّ مال ہے اور یہ مذموم اخلاق وصفات میں سے ایک خطرناک صفت ہے۔

شرعی حکم

شریعت مطہرہ نے مال کمانے اور پھر خرچ کرنے یا اپنے پاس چھوڑنے کے لئے کچھ قواعد وضوابط مقرر فرمائے ہے،ان دونوں مرحلوں کے لئے کچھ حدود وقیود متعین کئے ہے،اب اگر مال کی محبت اس قدر دل میں جاگزیں ہو جائے کہ ان تمام قواعد وضوابط یاان میں سے کسی ضروری ضابطہ کی پابندی نہ رہے،یامال کے ساتھ دلی لگاؤ کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی پر آمادہ کرے تو ایسی محبت شرعاً مذموم اور ممنوع ہے،بہت سے شرعی منکرات ومعاصی کی اساس وبنیاد ہے۔

اگر محبت اس قدر نہ ہو تو گو وہ فی الحال مذموم نہیں، لیکن مال ودنیا اس امت کے خاص فتنوں میں سے ہے جس میں غیر معمولی سرسبزی اور مٹھاس رکھی گئی ہے جن کی وجہ سے وہ دیکھنے میں بھی خوش منظر محسوس ہوتی ہے اور چکھنے میں بھی بہت بھلی اور پیاری لگتی ہے،اس لئے حب مال کا یہ جذبہ ایک حال پر برقرار نہیں رہتا،بالخصوص عصر حاضر میں تو ہر سو اس کے بڑھنے کے عناصر اور محرکات موجود ہیں ، ماحول وغیرہ عناصر کی وجہ سے اس میں شدت وکمزوری بھی آسکتی ہے اور

اعتدال بھی۔ لہٰذا اتنی محبت اگر چہ فی الحال مذموم نہیں ہے لیکن اس سے بھی غفلت برتنا اور اس حوالے سے اپنے نفس سے اطمینان رکھنا قطعاً زیبا نہیں بلکہ موقع بموقع محاسبہ و مراقبے کا اہتمام کرتے رہنا ضروری ہے۔

وعیدات

سورۃ "المنافقون" میں ہے:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ}.[1]

ترجمہ: "اے ایمان والو تمہیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں اور جو کوئی ایسا کرے گا سو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں"۔

سورۃ "التغابن" میں ہے:

{إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ (١٥) فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ}.[2]

ترجمہ: "تمہارے مال اور اولاد تمہارے لیے محض آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس تو بڑا اجر ہے، پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرو اور سنو اور حکم مانو اور اپنے بھلے کے لیے خرچ کرو اور جو شخص اپنے دل کے لالچ سے محفوظ رکھا گیا سو وہی فلاح بھی پانے والے ہیں"۔

---

[1] سورۃالمنافقون،رقم الایۃ: ٩.

[2] سورۃالتغابن،رقم الایۃ: ١٥، ١٦.

"مجمع الزوائد" میں ہے:

عن عبد الرحمن بن عوف قال: قال رسول الله – صلى الله عليه وسلم –: «قال الشيطان – لعنه الله –: لن يسلم مني صاحب المال من إحدى ثلاث، أغدو عليه بهن وأروح بهن: أخذه من غير حله، وإنفاقه في غير حقه، وأحببه إليه فيمنعه من حقه».[1]

ترجمہ: "حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کہتے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شیطان پر اللہ کی لعنت ہو کہتا ہے کہ: میں مالدار کے ساتھ صبح شام تین چالیں چلتا ہوں وہ ان سے بچ نہیں پائیں گے: حلال کے بجائے حرام سے لینا، پھر اس کو حرام میں خرچ کرنا اور پھر میں مال کو اس کا محبوب بناتا ہو، پس یہ محبت مال کے حق ادا کرنے سے اس کو روکتا ہے"۔

نقصانات

حب مال کی یہ صفت خود بھی مذموم ہے، دسیوں روایات میں اس کی مذمت وارد ہوئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ متعدد ظاہری اور باطنی منکرات کی اساس و بنیاد بن جاتی ہے، چنانچہ بخل و کنجوسی کا مرض یہی سے پھوٹتا ہے، کسب و کمائی کے ناجائز ذرائع مثلاً چوری، خیانت، سود و قمار، ملازمت میں کام چوری کر کے تنخواہ لینا، وغیرہ تمام جرائم کا ارتکاب اسی حب مال کے جذبے کے تحت ہوتا ہے، اسی طرح کئی دینی واجبات کی ادائیگی کی راہ میں یہی مرض رکاوٹ بن جاتا ہے، یا تو انسان کو سرے

---

۱ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: باب ما يخاف على الغني من ماله وغيره، ج۱۰ص ۲۴۵-رقم الحديث: ۱۷۷۹۷.

سے عبادات کے قریب ہی نہیں جانے دیتا اور یا شوق و محبت اور خلوص و جذبے کے ساتھ ادائیگی کرنے سے محروم کر دیتا ہے، مثلاً زکوۃ دینا، عشر دینا، صدقہ فطر ادا کر دینا، ، قربانی، واجب کفارات اور اہل و عیال کے ضروری نان و نفقہ میں کوتاہی کرنا اسی حب مال کے برگ و بھار ہیں۔

اسباب و علاج

مال کے ساتھ محبت کرنے کی مختلف وجوہات ہیں:

الف: بعض دفعہ خود مال سے محبت ہوتی ہے کہ بس انسان زیادہ سے زیادہ مال جمع کرے۔ اس کا بنیادی باعث عموماً حب جاہ ہوتا ہے مثلاً ناموری اور شہرت حاصل کرنے کا جذبہ، مال دار اور معزز شمار ہونے والے افراد کی فہرست میں شامل ہونے کی خواہش، یہ سب حب جاہ کی مختلف شاخیں ہیں جو اسی کے ضمن میں ذکر کر دی جائیں گی ان شاء اللہ۔

ب: اہل و اولاد کی فکر و محبت۔ بہت سے لوگ مال کی محبت اور خونِ جگر کی قربانی دیکر اس کے جمع کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش اس لئے کرتے ہیں کہ ان کو اپنے اہل و عیال کی فکر ستاتی ہے، وہ اپنے جانے سے پہلے ان کے لئے کوئی انتظام کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ کسی بھی فرد / چیز سے محبت و نفرت کا جذبہ شرعی تعلیمات کی روشنی میں رہنا چاہیئے، اہل و عیال کی محبت گو مذموم نہیں بلکہ بڑی حد تک مطلوب ہے لیکن اگر یہی محبت شریعت کے حکم سے تجاوز کرنے پر اکسانے لگے تو ایسی محبت بلاشبہ مذموم و ممنوع ہے اور ایسی صورت میں "حب

مال" کی طرح "اہل وعیال کی محبت" بھی ایک بیماری سے کم نہیں ہے۔ اس لئے دل میں یہ بات اچھی طرح بسا لینی چاہئے کہ:

۱: اہل وعیال کے حوالہ سے انسان کو صرف جائز حد تک ہی انتظام کرنے کی اجازت ہے اور بس۔

۲: ناجائز طور پر انتظام کرنے میں اپنا اخروی خسارہ ہے، تو یہ کیا دانش مندی ہے کہ کسی کے عیش و تعیش کے لئے اپنی آخرت کو قربان کر دیا جائے!

۳: ناجائز انتظام عموماً اپنے تئیں ایسی نحوست رکھتا ہے کہ دنیا میں بھی اس کی وجہ سے دلی سکھ اور چین نصیب نہیں ہوتی۔ اب ناجائز اسباب وانتظام کا بوجھ بھی سر پر لادا اور مقصود بھی پورا نہیں ہوا۔

ج: دنیوی خواہشات کی بہتات۔ انسان کے دل ودماغ میں جو کچھ خواہشات پیدا ہوتے ہیں، ان کا بھی ایک پورا جہاں ہے جہاں سینکڑوں قسم کی خواہشات وجذبات پیدا ہوتے ہیں، بسا اوقات ان خواہشات کو پورا کرنے کے لئے "حب مال" کا مرض پیدا ہوتا ہے۔

حب مال کی ایک ذیلی شاخ: بخل

پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ حب مال کی وجہ سے کئی ظاہری وباطنی خامیاں جنم لیتی ہیں، ان میں سے ایک اہم اور نمایاں خرابی "بخل" ہے، نصوص میں اس مرض کی خوب مذمت فرمائی گئی ہے، چنانچہ "صحیح مسلم" کی ایک روایت ہے:

عن جابر بن عبد الله، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: «اتقوا الظلم، فإن الظلم ظلمات يوم القيامة، واتقوا الشح، فإن

الشح أهلك من كان قبلكم، حملهم على أن سفكوا دماءهم واستحلوا محارمهم».[١]

ترجمہ:"حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ظلم کرنے سے اپنے آپ کو بچاؤ کیونکہ ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی صورت میں ہو گا اور بخل سے بچو کیونکہ بخل نے تم سے پہلی قوموں کو ہلاک کر دیا تھا اور اسی بخل نے انہیں آپس میں خون ریزی اور محرمات کو حلال سمجھنے پر برانگیختہ کیا تھا"۔

دوسری روایت میں ہے:

عن عبد الله بن عمرو، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: «إياكم والشح، فإنه أهلك من كان قبلكم أمرهم بالقطيعة فقطعوا، وبالبخل فبخلوا، وبالفجور ففجروا».[٢]

"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کرتے ہے کہ، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ حرص و طمع سے بچو کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں، اسی نے ان کو بخل کرنے کو کہا تو انہوں نے بخل اختیار کیا اسی نے ان کو قطع رحمی یعنی حقوق قرابت کی پامالی کے لیے کہا تو انہوں نے قطع رحمی اختیار کی، اس نے ان کو بدکاری کے لیے کہا تو انہوں نے بدکاریاں کیں "۔

---

[١] صحيح مسلم: باب تحريم الظلم، ج٤ص ١٩٩٦.
٢ مصنف ابن أبي شيبة: مَا ذُكِرَ فِي الشُّحِّ ج٥ص ٣٣١.

عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " ثلاث مهلكات: شح مطاع، وهوى متبع، وإعجاب المرء بنفسه".[1]

ترجمہ:"حضرت انسؓ فرماتے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں ان میں سے ایک تو خواہش نفس ہے جس کی پیروی کی جائے ،دوسری چیز حرص وبخل ہے کہ انسان جس کا غلام بن جائے اور وہ تیسری چیز مرد کا اپنے نفس پر گھمنڈ کرنا ہے"۔

بخل کا مفہوم وحکم

شریعت یا مروت کی روشنی میں جہاں مال خرچ کرنا ضروری یا بہتر ہو، وہاں خرچ نہ کرنا یا اس کا استعداد نہ ہونا بخل کہلاتا ہے۔اب اگر کہیں مال خرچ کرنا ضروری ہو تو خرچ نہ کرنا شرعاً ناجائز اور گناہ ہے اور اگر خرچ مندوب ومستحب ہو تو بخل نامناسب اور خلافِ اولیٰ ہے، اگر کہیں شرعاً خرچ کرنا ضروری نہ ہو، مروت کے لحاظ سے ضروری ہو تو چھوڑنا شرعاً گناہ تو نہیں ہے البتہ نامناسب ہے۔"طریقہ محمدیہ" اور "بریقہ" میں ہے:

(وهما) أي البخل والإسراف (في مخالفة الشرع حرامان) كالبخل بما أوجبه الله تعالى، وإضاعة المال فيما يحرم كمنع الزكاة، وإعطاء المال بالخمر والغناء (وفي مخالفة المروءة مكروهان تنزيها).[2]

---

١ اعتلال القلوب للخرائطي:بَابُ ذَمِّ الْهَوَى وَأَتْبَاعِهِ ،ج١ص ٤٩.

٢ بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية في سيرة أحمدية: ج٣ص ٣.

ترجمہ: "جس بخل اور اسراف سے شریعت کی مخالفت ہوتی ہو یعنی جہاں اللہ تعالی نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہو وہاں بخل کرنا مثلاً زکوۃ ادا نہ کرنا، اور جہاں مال خرچ کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہو وہاں خرچ کرنا مثلاً شراب اور گانا بجانے پر مال خرچ کرنا، یہ حرام ہے اور جو چیزیں خلاف مروءت ہوتی ہے وہ مکروہ تنزیہی ہے"۔

حبّ جاہ

لوگوں کے دلوں میں اپنی قدر ومنزلت چاہنے کا نام ہے، اس کو" حب ریاست " بھی کہاجاتا ہے، یہ چاہت اگر دل میں اس قدر راسخ ہوجائے کہ بہر صورت اس کو ترجیح دی جانے لگے تو یہ ناجائز اخلاق میں سے ایک اہم اور اساسی نوعیت کی مذموم صفت ہے۔

وعیدات

قرآن وحدیث میں اس کی بڑی ہی مذمت وارد ہوئی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

{تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ}.[١]

ترجمہ: "یہ آخرت کا گھر ہم انھیں کو دیتے ہیں جو ملک میں ظلم اور فساد کا ارادہ نہیں رکھتے اور نیک انجام تو پرہیز گاروں ہی کا ہے"۔

" صحیح ابن حبان" میں ہے:

---

١ سورۃالقصص،رقم الایة: ٨٣.

عن ابن كعب بن مالك عن أبيه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "ما ذئبان جائعان أرسلا في غنم بأفسد لها من حرص الرجل على المال والشرف لدينه".[1]

"حضرت کعب بن مالکؓ اپنے والد سے وہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ، اگر دو بھوکے بھیڑیئے بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے جائیں تو وہ اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا مال اور مرتبے کی حرص انسان کے دین کو خراب کرتی ہے"۔

"المعجم الکبیر" میں ہے:

عن عمران بن حصين قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «كفى بالمرء من الإثم أن يشار إليه بالأصابع» قيل: يا رسول الله، وإن كان خيرا؟ قال: «وإن كان خيرا فهو شر له إلا من رحم الله، وإن كان شرا فهو شر».[2]

ترجمہ: "حضرت عمران بن حسینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کے گناہ گار ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جارہا ہو، عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ! اگرچہ وہ شخص (خیر) بھلا ہی کیوں نہ ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ خیر ہو تو بھی یہ شہرت اس کے لیے

---

١ صحيح ابن حبان، ذكر الإخبار عما يجب على المرء من مجانبة الحرص على للمال والشرف، إذ هما مفسدان لدينه، ج٨ص ٢٤.

٢ المعجم الكبير للطبراني،رقم الحديث :٥٦٧، ج١٨ص ٢٢٨.

بُری چیز ہے۔ہاں، مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم کرے اور اگر وہ شخص بُرا ہے تو یہ شہرت تو بُری ہے ہی"۔

نقصانات

"حب مال" کی طرح "حب جاہ" بھی محض ایک مذموم صفت یا صرف ایک گناہ ہی نہیں ہے بلکہ متعدد معاصی و منکرات کی بنیاد ہے، اس کے مفاسد اور نقصانات "حب مال" کی بنسبت زیادہ اور دور رس ہیں۔ چنانچہ ریاء کی مختلف صورتیں، نیک اعمال میں اخلاص کا فقدان، تعظیم واحترام نہ کرنے سے والوں سے بغض و نفرت، اپنی مذمت و تنقید نہ سن سکنے کا مزاج، بے جا غیظ و غضب، لوگوں سے اپنے کو برتر خیال کرنا اور ان جیسی متعدد خرابیاں عام طور پر اسی "حب جاہ" کا ثمرہ ہے اور حب جاہ ہی کی وجہ سے عموماً یہ چیزیں وجود میں آتی ہیں۔

حب جاہ ومال کا نفسیاتی نقصان

شرعی نقطہ نظر سے ہٹ کر نفسیاتی تناظر میں دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ جب کسی شخص کے دل میں مال، جاہ یا باہ کی محبت کا غلبہ ہو، اس کے افکار، آراء اور فیصلوں میں توازن واعتدال پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی وقتی مصلحت، خارجی دباؤ وغیرہ عناصر کی وجہ سے چند فیصلوں میں اعتدال وتوازن کا مظاہرہ کرے لیکن جس چیز کو صفات واخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ اس کی زندگی اور اس کے افکار وآراء سے کوسوں دور ہو گی۔ اس سے انسانیت کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر جن نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ کسی ہوش مند شخص کے لئے محتاج بیان نہیں ہے۔

حکم

"حب جاہ" ممنوع لغیرہ ہے یعنی بذات خود حرام نہیں ہے بلکہ دیگر خارجی عناصر کی وجہ سے اس میں حرمت وممانعت پیدا ہو جاتی ہے جس کی تفصیل اوپر درج کی گئی ہے۔ کوئی شخص کسی ناحق یا ناجائز مال / مراعات حاصل کرنے کے لئے حب جاہ کرتا ہے تو بھی ناجائز ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص درج بالا جیسی تمام شرعی خوبیوں سے محفوظ اور مطمئن ہو اور کسی جائز یا مندوب غرض کو حاصل کرنے کے لئے کوئی ایسا کام کرے جو حب جاہ کا موجب یا اس کا نتیجہ ہو لیکن نہ وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتا ہو اور نہ اپنے واقعی حیثیت سے زیادہ جاہ و مرتبے کا طالب ہو تو اس کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن ایسا کمیاب اور بہت کمیاب ہے۔ لہٰذا جب تک کسی باطنی طبیب کے پاس رہ کر نفس کی پوری اصلاح نہ ہو تب تک اس کی گنجائش دینا نفس وشیطان کے ہاتھوں گرفتار کروانے کے مترادف ہے۔

"حب مال" کی طرح بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر "حب جاہ" میں یہ خاصیت ہے کہ اس میں ٹھہراؤ نہیں ہوتا بلکہ اگر اس جذبے کو لگام نہ دی جائے اور اچھی طرح اس کی نگہبانی نہ کی جائے تو اس میں زیادتی پیدا ہوتی رہتی ہے اور ایک وقت وہ ناجائز حدود میں بھی داخل ہو جاتی ہے اس لئے موقع بموقع اس کی پوری نگرانی کرتے رہنا ضروری ہے، اس سے بے فکر و مطمئن رہنا وبال جان کا باعث ہے۔

علاج وتجاویز

علمی علاج: جاہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا کیا فائدہ ہے؟ لوگوں کے حسن اعتقاد کا تو کیا کہنا، اگر وہ مجھے سجدہ بھی کرنے لگ جائیں گے تو اس میں مجھے کیا حاصل

ہو سکتا ہے؟ اس کا انجام کیا ہو گا؟ دنیا سے زاد سفر باندھ لینے کے بعد جب احتیاج اور فقر کا اصل دور شروع ہو گا، وہاں مجھے اس کا کیا فائدہ ملے گا؟ ان باتوں کو دل میں اچھی طرح بسا کر یہ اعتقاد رکھا جائے کہ لوگوں کے دل میں جاہ و منزلت کا پیدا ہو جانا کوئی کمال کی بات نہیں ہے بلکہ امتحان کا ذریعہ ہے۔

قرآن و حدیث میں خمول و گمنامی کی جو کچھ فضیلت اور شہرت و ناموری کے جو کچھ خطرات و نقصانات وارد ہوئے ہیں، ان کو بار بار دل میں دہرایا جائے، خصوصاً جہاں حب جاہ کے جذبات بیدار ہوتے ہوں وہاں ان باتوں کے بار بار یاددہانی اور دہرائی بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبد الحئ عارفی صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ "ناطق" کے ایک شعر کا استحضار کیا جائے، اس میں حب جاہ کا بہت آسان علاج ہے، حقیقت بھی یہی ہے کہ اس پیارے شعر میں درج بالا تمام باتوں کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا ہے، اس کا یاد رکھنا بھی فائدے سے خالی نہیں ہے، فرماتے ہیں:

سرد ہو جاتی ہے حبّ جاہ و دنیا جس کے بعد ... اک ذرا سی بات ہے اے دل کہ "پھر کیا اس کے بعد"

عملی علاج: تکلف کے ساتھ حبّ جاہ کے مقتضیٰ کے خلاف کرتا رہے، اپنے قوت برداشت کے مطابق قصداً بعض ایسے کام کرتا رہے جس سے اس جذبہ کو ٹھیس پہنچ جایا کرے۔ مکمل طور پر چھٹکارا حاصل ہونے سے پہلے ہر ایسے موقع و محل میں جانے سے بچنے کا پورا اہتمام کرتا رہے جہاں اس جذبے کی نشو و نما ہو سکتی ہو یا اس کو کسی طرح تائید و تقویت پہنچ سکتی ہو۔

حب جاہ کی ایک شاخ: شہرت و تعریف چاہنا

یہ گو حب جاہ ہی کا نتیجہ یا اس کی دوسری تعبیر ہے اور ابھی تک حب جاہ کے متعلق جو کچھ باتیں ذکر کی گئیں ہیں، وہ سب اس کے متعلق بھی ہیں لیکن اپنے نقصانات و نتائج بد کے پیش نظر اس کو مستقل بیماری اور مذموم صفت کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان اپنی شہرت کا خواہاں ہو، اس بات کا طالب ہو کہ لوگ اس کی تعریف و توصیف کرتے رہیں، اپنی مذمت و تنقید کو برداشت کرنے کی طاقت بالکل نہ ہو۔

اس مرض میں دیگر خرابیوں کے علاوہ ایک یہ نقصان بھی ہے کہ ایسا انسان ہمیشہ ایک حصار میں رہتا ہے، اس پر ترقی و کمال کے بہت سے دروازے بند ہو جاتے ہیں، نیکی و سعادت کے بہت سے ذرائع سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنی اس خوں کو سدھارنے اور پورا کرنے کے لئے بہت سے ضروری کاموں کو چھوڑنے لگتا ہے، بہت سے ایسے امور ہوتے ہیں جو شرعاً ناجائز یا نامناسب ہوتے ہیں لیکن اس مرض کا بے چارہ قابلِ رحم مریض اس کو کرنے پر اپنے آپ کو مجبور سا سمجھتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے کیا ہی خوب فرمایا ہے کہ:

أكثر الخلق أهلكهم حبُّ المدح وكراهية الذمّ، ويحملهم ذلك على المراءاة وفنون المعصية.[1]

---

[1] الأربعين في أصول الدين، الأصل السّادس في الرّعونة وحبّ الجاه، ص۱۷۸.

ترجمہ: "اکثر لوگ اپنی تعریف کو پسند کرنے اور اپنی بے عزتی کو برا سمجھنے کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں اور یہی چیزیں ان لوگوں کو ریاء و دکھلاوے اور مختلف گناہوں پر آمادہ کرتی ہے"۔

ضروری تنبیہ:

یہاں تک حب جاہ اور حب شہرت کے متعلق تفصیل مذکور تھی کہ دل میں ان چیزوں کی خواہش رکھی جائے۔ اگر دل میں جاہ و شہرت کے حاصل کرنے کا جذبہ نہ ہو اور یوں ہی یہ چیزیں اللہ تعالٰی کی طرف سے کسی انسان کو حاصل ہو جائیں تو یہ فی نفسہ مذموم نہیں ہیں بلکہ بعض اوقات انسان کے لئے بھلائی و سعادت کا ذریعہ بھی بن جاتی ہیں، لیکن یہ ہے بہر حال ایک مشکل امتحان اور دشوار گزار گھاٹی، جس میں پھسلنے اور گرنے کے بیسیوں مرحلے اور امکانات ہوتے ہیں، ہر قدم بڑے حزم واحتیاط سے رکھنی پڑتی ہے۔ "طریقہ محمدیہ" میں ہے:

واما الجاه بلا حب له ولا حرص عليه للذات العاجلة فليس بمذموم، فأي جاه اعظم من جاه الانبياء والخلفاء الراشدين؟[1]

ترجمہ: "اگر بغیر کسی شوق اور حرص کے شہرت از خود ملے تو یہ نقد انعام ہے اور بری نہیں ہے، کیونکہ انبیاءؑ اور خلفاء راشدین سے بڑھ کر کس کی شہرت ہو گی"۔

حب دنیا

مذموم صفات و اخلاق میں سے اس کو اساسی حیثیت حاصل ہے جو کہ بہت سے مہلک نتائج و خطرات کی حامل خُلق ہے۔ حبّ جاہ و مال کی طرح اس کی بھی

[1] الطريقةالمحمديه، كيفيةازالةالجاه عن النفس،ص١٦٦.

مختلف شاخیں اور متنوع صورتیں ہیں بلکہ خود حب جاہ ومال بھی اسی حب دنیا کی مختلف صورتوں میں سے ہیں جن کو بے پناہ اہمیت کی خاطر مستقل خُلق بد کے طور پر شمار کیا گیا ہے۔ اس لئے دیگر صفات واخلاق کی بنسبت اس پر کچھ تھوڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا مناسب ہے۔

دنیااور اس کا مفہوم ومقام

مرنے سے پہلے کی حالت اور اس کی ضروریات وتقاضوں کو صوفیاء کرام کی نظر میں "دنیا" کہا جاتا ہے، اس میں تمام مادی چیزیں بھی داخل ہیں اور اس کے ساتھ انسانی تعلق ورابطہ بھی داخل ہے، یعنیٰ تمام مادی چیزیں یا معنوی اشیاء سب دنیا کے تحت داخل ہیں۔ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

دنياك عبارة عن حالتك قبل الموت وآخرتك عبارة عن حالتك بعد الموت وكلُّ مالك فيه حظّ قبل الموت فهو مِن دنياك إلّا العلم والمعرفة والحريّة.[۱]

ترجمہ: "موت سے پہلے کی حالت کو دنیا اور موت کے بعد کی حالت کو آخرت کہتے ہے اور موت سے پہلے ہر وہ چیز جس میں انسان کا حصہ ہو وہ دنیا ہے، مگر علم ومعرفتِ خداوندی اور فطری آزادی دنیا میں سے نہیں ہے"۔

لیکن اس معنیٰ میں دنیا مطلقاً مذموم نہیں بلکہ اس میں تفصیل کرنی ضروری ہے کہ جو چیزیں (چاہے مادی اشیاء ہوں یا اعمال واخلاق وغیرہ) انسان کو اپنی آخرت اور اس کی تیاری سے مصروف رکھے، وہ مذموم ہیں اور جو اشیاء خود آخرت کے حق میں

---

[۱] الأربعين في أصول الدين، الأصل السّابع في حبّ الدنيا، ص۱۷۹.

مفید ثابت ہوں، وہ مطلوب ہیں۔ بعض روایات مبارکہ میں جو دنیا کی مطلقاً مذمت وارد ہوئی ہے اوراس کو ملعون بتلایا گیا ہے، وہاں یہی معنیٰ مراد ہے یعنیٰ ہر وہ چیز جو اخروی لحاظ سے انسان کے لئے مضر یا غفلت کا سبب بن جائے۔ "سیر السلوک" میں ہے:

اعلمْ أنّ الدّنيا عبارة عنْ كلّ ما كان قبل الموت خيرا كان أو شرّا ولذلك استثنىٰ منها النبيّ صلّى الله عليه وسلّم حين ذمّها ما هو خير فقال الدّنيا ملعونة وملعون ما فيها إلّا ذكر الله.[1]

ترجمہ: "جان لو کہ موت سے پہلے جو کچھ خیر اور شر ہے وہ دنیا ہے۔اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی مذمت کرتے ہوئے خیر کو اس سے خارج و مستثنیٰ کر دیا اور ارشاد فرمایا: دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب ملعون ہے، سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے"۔

"دنیا" کا جو پہلا معنیٰ بتلایا گیا ہے، اس کے لحاظ سے دیکھا جائے تو شریعت اسلامیہ بلکہ کوئی بھی شریعت مطلقاً دنیا کی مذمت نہیں کرتی اور بہر صورت دنیا کو مذموم یا ممنوع نہیں قرار دیتی، چنانچہ ایک حد تک دنیا ضروری بھی ہے ورنہ انسان اور معاشرے کا بقاء مشکل ہے۔ شریعت کی نظر میں دنیا کی حیثیت ایک غیر مقصودی ضرورت کی ہے کہ نہ اس کے بغیر کام درست ہو سکے اور نہ اس میں اس حد تک اشتغال روا ہے کہ مقصودی کام میں خلل واقع ہو سکے، اسی لئے اس کو "آخرت کی کھیتی" قرار دیا گیا ہے کہ یہی سے کوئی چاہے تو اپنی آخرت کی تعمیر

---

[1] سير السّلوك إلى ملك الملوك، الباب لأوّل،ص٢٤.

کر سکتا ہے اور اسی لئے ایک حد تک دنیا حاصل کرنے اور استعمال کرنے کو شریعت جائز ہی نہیں بلکہ ضروری قرار دیتی ہے چنانچہ اپنے جسم اور اہل وعیال کے حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے اوراس میں جان بوجھ کر ایسی کوتاہی کرنا کہ جان تلف ہو جائے یا اس کا خدشہ پیدا ہو جائے، ناجائز ہے۔ لیکن دوسری طرف یہی دنیا ہے جس میں غیر معمولی لذت، مٹھاس اور جذب کا مادہ بھرا ہوا ہے جس کی بدولت یہ ہر اس شخص کو اپنے لپیٹ میں لیتی ہے جو اس کے دامن کے قریب ہو جائے اور لپیٹ میں لے کر اس کو آخرت سے بالکل غافل کر دیتی ہے، یہی وہ عالمگیر فتنہ اور دشوار گزار گھاٹی ہے جہاں لاکھوں لوگ شعوری طور پر اپنے متاع دین و ایمان کا سودا کر چکے ہیں، ان افراد کی تو کوئی حد و حساب ہی نہیں ہے جو لاشعوری طور پر اپنا سرمایہ عمل گم کر چکے ہیں۔

دینی رہنمائی کی اہمیت وافادیت

اس قدر نازک اور خطرناک موڑ پر کمزور انسان کو کھلی چھوٹ دینا اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے کہ کسی بے بس انسان کو ہلاکت خیز موجوں میں بے سہارا چھوڑ دیا جائے اور اس کی بردبادی وغرق یابی پر عملاً خوشی کی گیت گائے جائیں، اس لئے اگر کوئی دین ونظام انسان کی کامل رہبری کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ اس کا اولین فرض بنتا ہے کہ وہ بے چارے انسان کو اس خطرناک جنگل سے سلامتی وحفاظت کے ساتھ بچا کر گزارے اور مہارت کے ساتھ اس کو اس کے منزل مقصود تک پہنچانے کی ذمہ داری ادا کرے۔

دینِ اسلام جو واحد دین کامل ہونے کا مدعی ہے ،وہ آگے بڑھ کر بے سہارے انسان کا ہاتھ پکڑ کر اس جنگل سے اس قدر حسن وخوبی کے ساتھ نکال کر مقصود تک پہنچاتا ہے جس سے زیادہ بہتر رہنمائی کا تصور نہیں کیا جاسکتا، یہ دین کامل قدم قدم پر ساتھ چلتا ہے اور اپنے چلنے والے راہ گیر کو ایسے مناسب راستے سے گزارتا ہے جو بالکل راہ اعتدال اور ٹھیٹھ سیدھے راستے کی تصویر ہوتی ہے جس میں دائیں بائیں طرف کوئی جھکاؤ ومیلان نہیں ہوتا، جنگل کے نشیب وفراز طے کرتے ہوئے اس کے قدم میں کوئی ڈگمگاہٹ پیدا نہیں ہوتی،وہ ایسی جگہ قدم رکھتا ہی نہیں ہے جہاں زمین پختہ نہ ہو اور پھسلنے کا اندیشہ ہو۔

اسلام میں دین ودنیا کا تصور

دین ودنیا کے درمیان کیا رشتہ ہونا چاہئے ؟ اس میں اسلامی تعلیمات کی حاصل یہی ہے کہ نہ دنیا سے قطعی گریز کرنا ضروری ہے اور نہ اس میں اس حد انہماک درست ہے جو اصل مقصد سے انسان کو غافل کردے۔ اس کو یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ دنیا حاصل کرنا کوئی مذموم نہیں بلکہ عام حالات میں جائز اور بعض اوقات مندوب اور واجب بھی ہوسکتا ہے لیکن جو چیز مذموم ہے اور جس سے روایات میں بار بار بچنے کی تاکید وارد ہوئی ہے ،وہ یہ ہے کہ دنیا کی محبت دل میں جاگزیں ہوجائے، گویا کسبِ دنیا ممنوع ومذموم نہیں ہے لیکن حبّ دنیا یقیناً مذموم ہے۔ جس طرح کشتی چلنے کے لئے ضروری ہے کہ نیچے پانی ہو اور پانی کے بغیر کشتی چلنے کا تصور نہیں ہو سکتا، لیکن یہی پانی اگر نیچے ہونے کے بجائے کشتی کے اوپر آجائے تو بھی کشتی سیدھا چلنے کی بجائے دریا بود ہونا شروع ہوجاتی ہے ،یوں ہی دنیا

اور اس کے متاع واسباب اگر انسان کے دل سے باہر ہو تو نہ صرف بلکہ ایک حد تک ضروری ہے لیکن یہی دنیا جب غالب آکر دل میں اپنا جگہ بنالیتی ہے تو بھی انسان ڈوب جاتا ہے اور آگے کی اخروی سفر میں سبقت لے جانے سے رہ جاتا ہے۔

دنیا کی دلچسپ مثال

امام غزالی رحمہ اللہ نے دنیا کی محبت اور اس میں اشتغال وانہماک کو بڑی دلچسپ اور سبق آموز مثال سے سمجھایا ہے، وہ اپنی کتاب "اربعین" میں تحریر فرماتے ہیں:

دنیا میں مخلوق کی مثال ایسی ہے جیسے ایک کشتی پر کچھ آدمی سوار ہوں اور کشتی کسی جزیرے کے کنارے پر آٹھہرے اور کشتی کا ملاح سواریوں کو اجازت دیدے کہ جاؤ جزیرے میں اتر کر اپنی ضرورتیں پوری کر لو، مگر ہوشیاری سے کام لینا، جگہ خطرناک ہے اور ابھی سفر دور دراز سر پر ہے۔ غرض سواریاں اتریں اور ادھر اُدھر منتشر ہو کر کئی اقسام پر منقسم ہو گئیں۔

بعض تو ضرورت حاجت پوری کر کے لوٹ پڑے اور فضول وقت گزارنا ان کو اچھا نہ معلوم ہوا، پس دیکھا کہ کشتی خالی پڑی ہے لہٰذا اپنی پسند کے موافق ساری کشتی میں اعلی درجے کی ہوادار اور فراخ جگہ منتخب کر کے وہاں بیٹھ گئے۔

اور بعض جزیرے کے خوشگوار ہوا کھانے اور خوش الحان پرندوں کی سریلی آوازوں کے سننے میں لگ گئے، سبز مخملی فرش اور رنگ برنگ کے پھول بوٹوں اور طرح طرح کے پتھروں اور درختوں کی گلکاریوں میں مشغول ہو گئے، مگر پھر جلدی ہوش آگیا اور فوراً کشتی کی جانب واپس ہوئے، یہاں پہنچ کر دیکھا کہ جگہ تنگ

رہ گئی ہے اور پُر بہار اور پُر فضا جگہوں پر ان پہلے آجانے والے لوگ بستر لگا چکے ہیں، لہٰذا اس تنگ ہی جگہ میں تکلیف کے ساتھ بیٹھ گئے۔

اور چند لوگ اس جزیرے کی عارضی بہار پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ دریائی خوشنما سیپیوں اور پہاڑی خوبصورت پتھروں کے چھوڑنے کو ان کا دل ہی نہ چاہا، پس ان کا بوجھ لاد کر انہوں نے اپنی کمر پر رکھا اور سمندر کے کنارے پر پہنچے کہ کشتی پر سوار ہوں، دیکھا کہ کشتی بھر چکی ہے کہ اس میں نہ اپنے بیٹھنے کی جگہ ہے، نہ فضول بوجھ کے رکھنے کا کوئی امکان ہے، اب حیران ہے کہ کیا کریں؟ ادھر تو بوجھ کے پھینکنے کو نفس گوارا نہیں کرتا، اور اُدھر اپنے بیٹھنے تک کو جگہ نہیں ملتی، غرض قہر درویش بجان درویش، نہایت دِقت کے ساتھ ایک نہایت تنگ جگہ میں گھس بیٹھے اور کنکروں، پتھروں کے بارِ گراں کو اپنے سر پر لاد لیا، اب ان کی حالت کا تم ہی اندازہ کر لو کہ کیا ہوگی، کمر الگ دکھے گی، گردن جدا ٹوٹے گی اور جس مصیبت و تکلیف کے ساتھ وقت کٹے گا اس کو ان کا ہی دِل خوب سمجھے گا۔

اور بعض لوگ جزیرے کے دِل افروز حسن پر ایسے عاشق ہوئے کہ کشتی اور سمندر سب کو بھول گئے، پھول سونگنے اور پھل کھانے میں مصروف ہو گئے اور کچھ خبر نہ رہی کہ کہاں جانا ہے، اور یہاں رہ کر درندوں اور موذی جانوروں کی غذا بننا ہے، آخر جب سب کے بعد بادِلِ نخواستہ ساحل پر پہنچے تو کشتی میں نام کو بھی جگہ نظر نہ آئی، تھوڑی دیر بعد کشتی لنگر اٹھا کر وہاں سے چل پڑی اور یہ لوگ کنارے پر کھڑے حسرت بھری نظروں سے اپنے ہمراہیوں کو دیکھتے رہ گئے، آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جزیرے کے درندوں نے ان کو پھاڑ ڈالا اور موذی جانوروں نے ان کے

نازک اور خوبصورت بدن کو ٹکڑے کر دیا۔ یہی حال بعینہ دنیاداروں کا ہے، اب تم خود غور کر کے سمجھ لو کہ کن لوگوں پر کونسی مثال چسپاں ہوتی ہے۔[۱]

دورِ حاضر کا عالمگیر فتنہ

یہی "حب دنیا" ہی ہے جس کو مادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی اس دور کا عالمگیر فتنہ ہے جہاں بڑے بڑے ہوشیار، عقل مند اور سمجھ دار لوگ حیران و سرگردان ہیں، اس فتنے نے دنیا کے ہر کونے کو متاثر کیا ہے۔ دین اسلام بلکہ کسی بھی دین و مذہب کا موجودہ دور میں بڑا حریف و مقابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ یہی "مادیت" کا فتنہ ہے جس کے مقابلے کا یہ حال ہے کہ جس دل، گھر، علاقہ اور ماحول میں اس کو جگہ ملتی ہے وہاں سے رفتہ رفتہ دین واخلاق کا جنازہ نکلنا شروع ہو جاتا ہے اور کچھ ہی عرصہ میں بڑی معصومیت کے ساتھ بغیر کسی ظاہری ٹکراؤ کے اپنے مد مقابل کو شکست دے کر بڑی بے رحمی اور بے دردی سے نکال دیتا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ دجال اسی فتنے کو ہوا دے گا اور اسی کی تاثیر ہو گی کہ لوگ جوق در جوق اس کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوں گے۔

مادیت کا شکار کون؟

اگر کوئی شخص یہ بات معلوم کرنا چاہے کہ وہ خود مادیت کا شکار ہے یا نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ حب دینا اور مادیت نے اس دل میں جگہ بنائی ہے؟ تو اس کے لئے معیاری طریقہ یہی ہے کہ درج ذیل دونوں باتوں میں اپنا محاسبہ کرتا رہے:

---

۱ تبلیغِ دین: ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

۱: دین و دنیا اور آخرت کے حوالہ سے اس کا نظریہ اور تصور کیا ہے؟ اور کیا اس کا نظریہ اس تصور کے ساتھ موافقت اختیار کرتا ہے جو اس حوالہ سے اسلام دینا چاہتا ہے؟

۲: عملی طور پر وہ دین و دنیا کے تقاضوں میں ٹکراؤ کے وقت کیا کرتا ہے؟ جہاں دنیوی مفاد اور دینی احکام کا تضاد نظر آتا ہے وہاں اس کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے؟ اس کے ہاتھ پاؤں کس پہلو کی طرف اٹھتے ہیں اور کس پہلو سے غفلت برتتے ہیں؟

اگر کوئی شخص ان دونوں باتوں میں اسلامی تعلیمات کے مطابق چلتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ابھی وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مادیت کے فتنے سے محفوظ و مامون ہے ورنہ تو کسی نہ کسی درجے میں وہ اس بلا کا شکار ہے۔ البتہ نظریاتی طور پر اگر کوئی شکار ہے تو وہ عملی طور پر شکار ہونے کی بنسبت زیادہ خطرناک اور مذموم ہے بلکہ اسی نظریاتی پستی کی ایک حد ایسی بھی ہے جہاں پہنچ کر انسان کا دین و ایمان ہی رخصت ہو جاتا ہے۔

وعیدات

دیگر مذموم صفات و اخلاق کی بنسبت چونکہ یہ صفت "حب دنیا" زیادہ خطرناک اور مہلک ہے، اس لئے یہاں کچھ زیادہ نصوص نقل کی جاتی ہیں۔

چند قرآنی آیات

سورۃ "ہود" میں ارشاد ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ (١٥) أُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ}.[١]

ترجمہ:"جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی آرائش چاہتا ہے ،تو انکے اعمال ہم یہیں پورے کر دیتے ہیں اور انھیں کچھ نقصان نہیں دیا جاتا یہ وہی ہیں جن کیلئے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور برباد ہو گیا جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا تھا اور خراب ہو گیا جو کچھ کمایا تھا"۔

سورۃ"الاسراء"میں ہے:

{مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ۝
وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا}.[٢]

ترجمہ:"جو کوئی دنیا چاہتا ہے تو ہم اسے سر دست دنیا میں سے جس قدر چاہتے ہیں دیتے ہیں پھر ہم نے اس کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے جس میں وہ ذلیل وخوار ہو کر رہے گا اور جو آخرت چاہتا ہے اور اس کے لیے مناسب کوشش بھی کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہو گی"۔

سورۃ"النازعات"میں ہے:

---

[١] سورةهود،رقم الاية: ١٥، ١٦.

[٢] سورةالإسراء،رقم الاية: ١٨، ١٩.

{يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَىٰ (٣٥) وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَنْ يَرَىٰ (٣٦) فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ (٣٧) وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (٣٨) فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ}.[١]

ترجمہ: "جس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا اور ہر دیکھنے والے کے لیے دوزخ سامنے لائی جائے گی، سو جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی سو بیشک اس کا ٹھکانا دوزخ ہی ہے"۔

سورۃ "النحل" میں ہے:

{ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ}.[٢]

ترجمہ: "یہ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر محبوب بنایا اور نیز اس لیے کہ اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

چند فرمودات رسول ﷺ

"سنن ترمذی" میں ہے:

حدثنا عبد الرحمن بن ثابت بن ثوبان، قال: سمعت عطاء بن قرة، قال: سمعت عبد الله بن ضمرة، قال: سمعت أبا هريرة، يقول:

---

[١] سورة النازعات،رقم الاية: ٣٥ — ٣٩.

[٢] سورةالنحل،رقم الاية: ١٠٧.

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ألا إن الدنيا ملعونة ملعون ما فيها إلا ذكر الله وما والاه وعالم أو متعلم.[١]

ترجمہ:"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دنیا اور اس کی تمام چیزیں ملعون ہیں البتہ اللہ کا ذکر اور جو اس کے برابر ہو اور عالم یا متعلم اللہ کے نزدیک محبوب ہیں"۔

"صحیح بخاری" میں ہے:

عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما، قال: أخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم بمنكبي، فقال: «كن في الدنيا كأنك غريب أو عابر سبيل».[٢]

ترجمہ:"عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے میرا مونڈھا پکڑ کر ارشاد فرمایا: کہ تم دنیا میں اس طرح رہو گویا تم مسافر ہو یا راستہ طے کرنے والے ہو"۔

"مسندِ احمد" میں ہے:

---

١ سنن الترمذي ت بشار: أبواب الزهد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم،رقم الحديث: ٢٣٢٢ ج٤ص ١٣٩.

٢ صحيح البخاري: باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: «كن في الدنيا كأنك غريب أو عابر سبيل» ج٨ص ٨٩.

عن أبي موسىٰ الأشعري، أن رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم قال: " من أحب دنياه أضر بآخرته، ومن أحب آخرته أضر بدنياه، فآثروا ما يبقىٰ علىٰ ما يفنىٰ".[١]

ترجمہ:"حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے اپنے لئے دنیا کو پسند کیا اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا اور جس نے اپنے لئے آخرت کو پسند کیا وہ اپنی دنیا کا نقصان (کچھ نہ کچھ) کرے گا بس تم باقی رہنے والی چیز کو فناء ہو جانے والی چیز پر ترجیح دو"۔

دین و مادیت میں اختلاف کے مظاہر

دین اسلام اور موجودہ جذبہ مادیت کا جن جن امور میں اختلاف ہے، ان کی فہرست یوں تو بہت طویل ہے لیکن اس اختلافی روش میں جس بات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ نظریہ کا اختلاف ہے، یہی وہ چیز ہے جس کو تمام اختلافی باتوں میں اساسی مقام حاصل ہوتا ہے، دیگر باتوں میں اختلاف یہی سے پھوٹتا ہے۔ مادیت کا غایت مقصود یہ ہے کہ انسان "باوقار زندگی" گزارے اور بس۔ جبکہ دین کی نظر میں خود زندگی گزارنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ راہِ سفر ہے اور اصل مقصود اخروی زندگی میں کامیابی ہے۔ مقصود کے اس حد درجہ اختلاف کی وجہ سے بہت سے نظریات واعمال میں اختلاف خود بخود پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ:

---

[١] مسند أحمد ط الرسالة: ج٣٢ص ٤٧٠.رقم الحديث: ١٩٦٩٧.

الف: دنیا کے متاع واسباب کو کس کس طرح حاصل کیا جائے؟ دنیا کی کمائی اور آمدن کے ذرائع کیا ہونے چاہیئے؟

ب: کمانے کے بعد خرچ وصرف کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیئے؟ کہاں مال خرچ کرلینا چاہیئے اور کہاں نہیں؟ کتنا اور کیسے خرچ کیا جائے؟

ج:انسان کے اعمال واشغال کیا ہوں؟اورروزمرہ کی مصروفیات میں کن چیزوں کو داخل کرے؟

د:عزت وذلت اور فضل وکمال کا معیار کیا ہے؟ مثالی شخصیت اور مثالی کردار کا ترازو کیا ہے؟

یہ اور ان جیسی بیسیوں باتوں میں اسلام اور مادیت کا نقطہ نظر اور راہ سفر بالکل مختلف اور متضاد بلکہ متصادم ہے۔

مادیت کا علاج کیونکر ممکن ہے؟

حب دنیا اور مادیت کے فتنے کا حملہ،حملے کا محل وقوع،اس کا طریقہ واردات اور نقصانات وخطرات معلوم ہو گئے تو اس کے بعد اس کا علاج جاننا بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں رہا۔اس کا طریقہ یہی ہے کہ اعتقادی اور نظریاتی میدان میں اپنی اصلاح کرتا رہے، دین ودنیا کے درمیان جو کچھ علاقہ نصوص سے واضح ہورہا ہے،اس کو نظریہ کی حیثیت سے اختیار کیا جائے، دنیا کی حیثیت، اس میں حد سے زیادہ دوڑ دھوپ کے نقصانات اور اس میں پنہاں خطرات وخدشات کا بار بار استحضار کیا جائے۔یہ علمی اور نظریاتی حد تک علاج ہے۔ عملی لحاظ سے اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ دینی تقاضے اوراس کے مفاد وترجیح کو بہر حال مقدم رکھا جائے،

مفادات میں تصادم اور ترجیحات میں ٹکراؤ کے وقت کبھی دنیوی ومادی ترجیح کو غلبہ نہ دے، ایک عرصہ تک اس طرح تکلف کے ساتھ کرتا رہے، ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ یہ استقامت اپنا رنگ دکھائے گی اور دل سے حب دنیا اور مادیت کا عفریت رخصت ہو جائے گا۔

لیکن یاد رہے کہ یہ سب کچھ باتیں صرف جاننے کی حد تک ہے جبکہ نرے جاننے سے کسی مرض کا علاج نہیں ہوتا۔ عملی طور پر مجاہدہ اور محنت کرنے سے ہی صلاح واصلاح کا مقصود حاصل کیا جاسکتا ہے اور اس کا مناسب، معقول اور مجرب طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے دل ودماغ کو اللہ تعالیٰ نے اس فتنے سے محفوظ ومامون کر رکھا ہے، ان کی صحبت سے فائدہ اٹھایا جائے، ان کے چشمہ فیض سے اپنی بساط بھر توانائی حاصل کی جائے، ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر سنجیدگی کے ساتھ اپنی علاج ومعالجہ کی فکر کی جائے۔

کبر وتکبّر

مذموم صفات واخلاق میں سے ایک اہم اور نہایت مذموم صفت تکبر ہے، اس مرض کی وجہ سے انسان پر قبول حق کے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں اور معاشرتی لحاظ سے یکسانیت بھی عنقا ہو جاتی ہے، معاشرے کے لئے اس کی حیثیت کسی جذام سے کم نہیں، اس لئے قرآن وحدیث میں اس کی بڑی ہی تاکیدی مذمت فرمائی گئی ہے۔

اس کا صحیح شرعی مفہوم اور واقعی تعریف کیا ہے؟ اور برائی ومذمت کا نکتہ کیا ہے؟ اس میں اہلِ علم کے بیانات مختلف ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جس قدر اس کی

مذمت زیادہ وارد ہوئی ہے اور حرمت سب عام وخاص کو معلوم و مشہور ہے، اسی قدر تعریف وتحدید بھی آسان نہیں۔ یہاں اس کی کچھ تفصیل ذکر کردی جاتی ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ رحمہ اللہ تکبر کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حقيقة الكبر: أن يرىٰ نفسه فوق غيره في صفات الكمال فيحصل فيه نفخة وهزّة مِن هذه الرّذيلة والعقيدة".[۱]

ترجمہ: "تکبر کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اچھی صفات میں اپنے آپ کو دوسروں سے ایسا برتر واعلی سمجھے کہ اس کی وجہ سے اس میں ہٹ دھرمی اور بڑاپن پیدا ہو جائے"۔

آپ ہی کی دوسری کتاب "کیمیائے سعادت" میں ہے:

"تکبر کے یہ معنیٰ ہیں کہ آدمی اپنے تئیں اوروں سے فائق اور بہتر جانے اور اس سبب سے خوش ہو ہو کر پھولے تو جو ہوا اسے پھلاتی ہے، اس کو تکبر کہتے ہیں"۔[۲]

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

واعلم: أن الكبر خلق باطن تصدر عنه أعمال هي ثمرته، فيظهر علىٰ الجوارح، وذلك الخلق هو رؤية النفس علىٰ المتكبر عليه، يعنى يرىٰ نفسه فوق الغير في صفات الكمال، فعند ذلك يكون متكبراً.[۳]

---

۱ الأربعين في اصول الدين،ص۱۸۸.

۲ کیمیائے سعادت،ص۴۰۱.

۳ مختصر منهاج القاصدين:ص: ۲۲۷.

ترجمہ:" جان لو کہ کبر ایک باطنی صفت ہے اور اس سے اعمال صادر ہوتے ہیں وہ اس کا نتیجہ ہے ان کا ظہور اعضاء وجوارح کے ذریعے ہوتا ہے، اور یہ صفت کسی نعمت کو بڑی سمجھنے سے زیادہ اپنے نفس کو بڑا سمجھنا ہے، یعنی جس وقت آدمی اچھی صفات میں اپنے آپ دوسروں سے برتر واعلی سمجھے اسی وقت وہ متکبر کہلائے گا"۔

"طریقہ محمدیہ" میں یہ تعریف کی گئی ہے:

"الاسترواح والرّكون إلى رؤية النفس فوق المتكبَّر عليه".[1]

ترجمہ:" کسی چیز (نعمت) کے بڑے ہونے سے زیادہ اپنے نفس کی طرف جھکنا اور اس سے خوش ہونا"۔

علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ تکبر کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

التكبر خلق باطني لأنه استعظام النفس ورؤية قدرها فوق قدر الغير.[2]

ترجمہ:" تکبر ایک باطنی صفت ہے جس میں اپنے نفس کو بڑا اور دوسروں سے اونچا سمجھا جاتا ہے"۔

"اخلاق اور فلسفہ اخلاق" میں ہے:

" کبر دراصل نفس کی اس خود پسندی کا نام ہے جو دوسروں کو حقیر اور اپنی بلندی کے اظہار کے لئے کی جائے"۔[3]

---

[1] الطريقة المحمديه:ص٢١٤.

[2] الزواجر عن اقتراف الكبائر، ج١ص١٢٠.

[3] اخلاق اور فلسفہ اخلاق،ص٥٣٦.

کیا ہر بھلائی میں تفوق کا احساس تکبر ہے؟

ان عبارات سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ صفات کمال میں اپنے آپ کو کسی سے برتر سمجھنا کبر ہے جو کہ ناجائز، حرام اور مذموم ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ کمال کی صفات میں علم، مال و دولت، حسن و جمال اور حسب و نسب وغیرہ امور زیادہ مشہور ہیں اور عموماً تصوف کی کتابوں میں بھی یہی چیزیں مثال کے طور پر ذکر کر دی جاتی ہیں لیکن ان میں علم کے علاوہ دیگر تمام صفات ایسی ہیں جن میں معاشرتی لحاظ سے ایک فرد کا دوسرے سے بڑھنا ظاہر و عیاں ہے جس سے انکار کرنا بدیہی چیز سے انکار کرنے کے مترادف ہے، مثال کے طور پر زید سید بھی ہے اور حسین و مالدار بھی، جبکہ عمر بے چارہ ایک عام قوم سے تعلق رکھنے والا بد صورت انسان ہے جو مال و دولت میں بھی کچھ زیادہ صاحب حیثیت نہیں، اب اگر زید ان چیزوں میں عمر سے اپنے آپ کو برتر سمجھتا ہے تو یہ کیونکر مذموم ہو سکتا ہے جبکہ یہ بات خارج کے مطابق ہے! ایک واقعی چیز کا اعتقاد رکھنا کیونکر ناجائز ٹھہر سکتا ہے؟ اور کیسے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ دین اسلام مسلمان کو کسی ایسی بات کا نظریہ رکھنے پر مجبور کرے جو اس کے واقعی مشاہدے کے خلاف ہو!

اسی طرح ان جیسی صفات کو دیکھ کر کسی حد تک ضرور اپنی فوقیت کا خیال پیدا ہوتا ہے جو ایک حد تک غیر اختیاری چیز ہے جس کا انسان مکلف نہیں ہے، چنانچہ عہدوں اور مختلف مناصب میں اوپر نیچے کا فرق عیاں ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!

تکبر کا حقیقی مفہوم

حقیقت یہ ہے کہ محض اتنی سی بات مذموم تکبر کے لئے کافی معلوم نہیں ہوئی۔اب سوال یہ ہوتا ہے کہ پھر مذموم تکبر ہے کیا چیز؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے زعم وخیال کے مطابق فضل وکمال کی صفات کو اپنے اندر دیکھ لے، ان کی بنیاد پر اپنے آپ کو دیگر لوگوں کی بنسبت ممتاز حیثیت کا حامل سمجھنے لگے اور لوگوں کو اپنی بنسبت کچھ حقیر وکم تر تصور کرنے لگے تو یہ وہ مذموم تکبر ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے۔ ایک حدیث شریف سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے، "صحیح مسلم" کی روایت ہے:

عن عبد الله بن مسعود، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر» قال رجل: إن الرجل يحب أن يكون ثوبه حسنا ونعله حسنة، قال: «إن الله جميل يحب الجمال، الكبر بطر الحق، وغمط الناس».[١]

ترجمہ: "عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا، اس پر ایک آدمی نے عرض کیا کہ ایک آدمی چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کی جوتی بھی اچھی ہو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ جمیل ہے اور جمال ہی کو پسند کرتا ہے، تکبر تو حق کی طرف سے منہ موڑنے اور دوسرے لوگوں کو کمتر سمجھنے کو کہتے ہیں"۔

---

[١] صحيح مسلم: باب تحريم الكبر وبيانه، ج١ص ٩٣.

اہلِ فن کا تائیدی نکتہ

اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ محقق اہل تصوف نے اس بات کی تصریح فرمائی ہیں کہ تکبر کا مرض عجب وخود پسندی سے پیدا ہوتا ہے، عجب میں ترقی پیدا ہونے لگے اور انسان صرف اپنے آپ کو پسند کرنے پر ہی اکتفاء نہ کرے بلکہ ساتھ دیگر لوگوں کو بھی اپنے سے حقیر خیال کرنے لگے تو یہی تکبر ہے۔

اہلِ فن کی اس صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ تکبر میں عجب کا مادہ ضرور موجود ہوتا ہے جبکہ عجب کے بارے آگے تفصیل آرہی ہے کہ اس میں مناط ذم یہی ہے کہ نعمت کو اللہ تعالی کا فضل واحسان خیال کرنے کی بجائے اپنا استحقاق سمجھا جائے اور اس کے زائل ہونے سے بے فکر ہو جائے۔

وعیدات

ارشادِ خداوندی ہے:

{كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ}.[١]

ترجمہ: "اسی طرح اللہ ہر ایک متکبّر سرکش کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے"۔

"صحیح مسلم" میں ہے:

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " احتجت النار، والجنة، فقالت: هذه يدخلني الجبارون، والمتكبرون، وقالت: هذه يدخلني الضعفاء، والمساكين، فقال الله عز وجل لهذه: أنت

---

[١] سورةغافر،رقم الاية: ٣٥.

عذابي أعذب بك من أشاء - وربما قال: أصيب بك من أشاء - وقال لهذه: أنت رحمتي أرحم بك من أشاء ولكل واحدة منكما ملؤها".[1]

ترجمہ:"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دوزخ اور جنت کا آپس میں جھگڑا ہوا دوزخ نے کہا: میرے اندر بڑے بڑے ظالم اور متکبر لوگ داخل ہوں گے اور جنت نے کہا: میرے اندر کمزور اور مسکین لوگ داخل ہوں گے تو اللہ عزوجل نے دوزخ سے فرمایا: تو میرا عذاب ہے میں تیرے ذریعے جسے چاہوں گا عذاب دوں گا اور اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا تو میری رحمت ہے میں تیرے ذریعے جس پر چاہوں گا رحمت کروں گا لیکن تم میں ہر ایک کا بھرنا ضروری ہے"۔

"مستدرکِ حاکم" میں ہے

قال عبد الله بن عمر: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: «ما من رجل يتعاظم في نفسه ويختال في مشيته إلا لقي الله وهو عليه غضبان» .[2]

ترجمہ:"حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھے یا اپنی چال میں متکبرانہ چال کو جگہ دے، وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ اس سے ناراض ہو گا"۔

---

[1] صحيح مسلم: باب النار يدخلها الجبارون والجنة يدخلها الضعفاء، ج٤ص ٢١٨٦-

[2] المستدرك على الصحيحين للحاكم ،رقم الحديث: ٢٠١،ج١ص ١٢٨.

نقصانات

تکبر نہایت مذموم صفت ہے جو گویا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ لڑنے اور نزاع کرنے کے مترادف ہے چنانچہ ایک حدیث قدسی میں ذکر کیا گیاہے کہ عظمت اللہ تعالیٰ کا ازار اور کبر وبڑائی اس کی چادر ہے جو شخص اللہ سے ان چیزوں میں منازعت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا کمر توڑ دیتے ہیں۔ منازعت کرنے کا مطلب یہی ہے کہ کوئی شخص ان صفات کو اپنے اندر جگہ دینے لگ جائے۔

دوسرا بڑا نقصان اس کا وہی ہے جس کی طرف درج بالا روایت میں اشارہ فرمایا گیاہے کہ یہ قبول حق کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے ، اس سے مخلوق خدا کی حقارت پیدا ہوتی ہے جبکہ ایک صحیح روایت میں یہ مضمون بیان فرمایا گیاہے کہ انسان کے شریر ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ کسی مسلمان کو حقیر سمجھے۔

تیسرا بڑا نقصان اس کا یہ ہے کہ خود مذموم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ عادت دیگر بہت سے اخلاق مطلوبہ کی راہ میں بھی حائل بن جاتا ہے، چنانچہ تواضع کرنا، مسلمان کے ساتھ محبت رکھنا، خیر خواہی کا جذبہ رکھنا، غصہ میں بردباری سے کام لینا، خدمت خلق کرنا، نرم برتاؤ کرنا اور بلاضرورت امتیازی مقام کو نہ چاہنا وغیرہ نیک اور محمود صفات وعادات ایسی ہیں کہ تکبر کے ہوتے ہوئے ان پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔

اسباب تکبر

تکبر کسی بھی ایسی صفت کی وجہ سے ہوتا ہے جس کو انسان باعث کمال اور موجب فضل وفوقیت سمجھتا ہو، اس میں انسان کے زعم وخیال اور اس کے مزاج ومذاق کا بھی دخل ہے، بعض چیزیں ایسی ہیں جو عقل سلیم کی نظر میں اسباب کمال

میں سے نہیں ہیں لیکن کچھ لوگ اس کو اپنی فضیلت وفوقیت کا باعث شمار کرنے لگتے ہیں۔ عام طور پر علم وعبادت، حسن وجمال،مال ودولت، عہدہ ومنصب، ناموری وشہرت اور خاندانی حیثیت ومقام ایسے عناصر ہیں جن کی بنیاد پر انسان تکبر کے شکار ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگ اس مصیبت سے محفوظ ہوتے ہیں،اکثر لوگ کسی نہ کسی درجے میں اس کے ضرور شکار ہوتے ہیں۔البتہ خدا کے باتوفیق بندے ریاضت ومجاہدہ وغیرہ کے ذریعے سے اس سے چھٹکارا حاصل کرلیتے ہیں ورنہ تو بہت سے لوگ اسی کے سائے تلے رہتے ہیں جس کی وجہ یا تو جہالت وناواقفیت ہوتی ہے،یا اس مرض سے نجات پانے کی اہمیت دل میں نہیں ہوتی اور یا علاج کو مشکل باور کرلینے کی وجہ سے اس کی ہمت نہیں کرپاتے۔ علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ومنها: يتعين علىٰ كل إنسان أراد الخلاص من ورطة الكبر وثمرته القبيحة - إذ هو من المهلكات ولا يخلو أحد من الخلق عن شيء منه، وإزالته فرض عين وهي لا تمكن بمجرد التمني، بل بالمعالجة باستعمال أدويته النافعة في إزالته من أصله.[1]

ترجمہ:"ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ تکبر کی لعنت اور اس کے برے نتائج سے اپنے آپ کو بچائے، کیونکہ یہ ہلاک کردینے والی ہے اور کوئی بھی انسان اس مرض سے خالی نہیں اس وجہ سے اس کا ازالہ فرض عین ہے جو کہ صرف تمناؤں سے ممکن

---

[1] الزواجر عن اقتراف الكبائر، ج١ص١٢٠.

نہیں بلکہ اس کے لئے مستقل علاج کی ضرورت ہے ایسی دوائیوں کے ذریعے جو اس مرض کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے مفید ہو"۔

علم بھی باعثِ کبر ہے

اہل علم کہلانے والے حضرات بھی اس سے محفوظ نہیں رہتے، بلکہ علم اور معلومات خود تکبر کے اساسی اسباب وآلات میں سے ایک اہم سبب ہے، اس لئے اہل علم کی اکثریت بھی اس کی شکار ہوجاتی ہے، علامہ ابن حجر مکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فالتكبر أسرع إلى العلماء الذين لم يمنحوا نور التوفيق منه إلى غيرهم، لأن الواحد منهم يرى غيره بالنسبة إليه كالبهيمة فيقصر في حقوقه التي طلبها الشارع منه كالسلام والعيادة والبشر، ويطلب منه أن لا يخل بشيء من حقوقه لمحبته الترفع عليه، وفاعل ذلك أجهل الجاهلين لأنه جهل مقدار نفسه وربه، وخطر الخاتمة، وعكس الموضوع.[1]

ترجمہ: "جن علماء کو اللہ تعالی کی طرف سے علم کا نور نصیب نہیں ہوتا، تکبر ان میں دوسروں کی بنسبت زیادہ تیزی کے ساتھ سرایت کر جاتا ہے اس لئے کہ ایسا عالم اوروں کو اپنے سامنے جانور کی طرح سمجھتا ہے اس وجہ سے وہ دوسروں کے ان حقوق میں بھی کوتاہی کرتا ہے جو شارع کی طرف سے مطلوب ہیں جیسے سلام کرنا، عیادت کرنا اور مبارک باد دینا، اور اس برتری کی محبت کی وجہ سے خود چاہتا ہے کہ

---

[1] الزواجر عن اقتراف الكبائر، ج۱ص۱۱۹.

دوسرے اس کے حقوق میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔ایسے کردار والا سب سے بڑا جاہل ہے،اس لئے کہ وہ اپنی حیثیت،اپنے رب کی قدر،خاتمہ بد اور بات بالکل الٹ جانے کے خطرے سے ناواقف ہے"۔

علامہ ابن قدامہ مقدسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وآفة الكبر عظيمة، وفيه يهلك الخواص، وقلما ينفك عنه العباد والزهاد والعلماء.[1]

ترجمہ:"کبر کی آفت بہت بڑی ہے،اس میں خواص بھی گر جاتے ہیں اور بہت کم علماء،زاہد اور عبادت گزار اس سے بچ جاتے ہیں"۔

علاج وحل

اس کے علاج کا ایک حصہ تو وہی ہے جو "عجب" کے علاج کے تحت ذکر کیا گیا ہے،اس کو ایک نظر پھر دیکھ لیا جائے۔اس کے ساتھ ساتھ تکبر میں چونکہ دوسرے افراد کو بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے،اس لئے ان نصوص کا بھی استحضار کیا جائے جس میں مسلمان کی اہمیت اور اس کو حقیر سمجھنے کی ممانعت ومذمت کی گئی ہے اور ساتھ یہ بات بھی دل کو سمجھادی جائے کہ ان ظاہری صفات وعادات میں فوقیت سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس سے زیادہ مقبول ومقرب ہوں گا؟جس شخص کو میں اپنے سے کم تر سمجھ رہا ہوں،ممکن ہے کہ اس میں کوئی ایک ایسی عادت ہو جو مجھے معلوم نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو وہ اس قدر پسند آجائے کہ مجھ سے زیادہ درجہ پائے اور یا میرے اندر کوئی ایک ایسی پوشیدہ

---

[1] مختصر منهاج القاصدين،ص: ۲۲۷.

کمزوری ہو جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئے اور اس کی وجہ سے اخروی لحاظ سے دوسرا شخص مجھ سے بازی لے جائے۔

عملی طور پر اس کا علاج یہی ہے کہ تکبر کے مقتضی کے خلاف اقدام کرتا رہے، اپنے لئے کسی امتیازی سلوک کو روا نہ رکھے۔

عجب اور خود پسندی

اللہ تعالیٰ جو نعمتیں، اچھی خصلتیں عطاء فرماتے ہیں، ان کو بڑائی کا ذریعہ سمجھنا، ان پر مطمئن ہو جانا، اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کرنے سے غفلت برتنا اور ان کے ختم ہونے سے بے فکر رہنا، یہ عجب ہے، امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حقيقة العجب: استعظام النّفس وخصالها الّتي هي من النّعم والرّكون إليها مع نسيان إضافتها إلى المنعم والأمن مِن زوالها.[1]

ترجمہ: "عجب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی گئی خوبیوں کو بڑی چیز سمجھے اور اس (نفس اور خصلتوں) کے سامنے جھک جائے اور ان (نعمتوں) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا بھول جائے اور ان کے زائل ہونے کے خوف سے مطمئن ہو جائے"۔

اس کے قریب قریب تعریف علامہ برکوی رحمہ اللہ اور دیگر محققین نے بھی فرمائی ہیں۔ اصل مذموم عجب وہی ہے جس میں درج بالا تمام باتیں پائی جائیں، چنانچہ اگر کسی نعمت و خصلت کو عظیم سمجھا جائے لیکن ساتھ اس کو دل سے فضل خداوندی تصور کرے، اپنا استحقاق خیال نہ کرے، اور اس کے زائل ہونے کا

---

[1] الأربعين في أصول الدين، ص١٩٦.

بھی خطرہ ہو تو یہ مذموم عجب نہیں ہے، اگر چہ خود بینی وخود پسندی کا یہ بھی ایک درجہ ہے اور تربیت میں پختگی نہ ہو تو رفتہ رفتہ یہی چیز مذموم عجب کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

نقصانات

عجب ،خود پسندی اور خود بینی کانام ہے، یہ انسان کو اپنے عیوب اور کمزوریوں سے غافل رکھتی ہے، اسی طرح دوسرے افراد کے کمالات و تجربات سے بھی عموماً دور ہی رکھتی ہے جبکہ انسان کے صلاح واصلاح کے عمومی ذرائع یہی ہیں، لہٰذا اس بیماری کے ہوتے ہوئے علمی اور روحانی ترقی کے دروازے مسدود ہو جاتے ہیں اور انسان اپنے ذات کی حد تک تو بہت بڑا ہوتا ہے لیکن اسی جذبہ خود پسندی کی وجہ سے وہ بہت سے ایسے کام کرتا ہے جن کی وجہ سے عام لوگوں کے دلوں میں اس کی کوئی خاص وقعت واہمیت نہیں رہ پاتی۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبدیت وتضرع کا تعلق بھی کچھ زیادہ گہرا اور پائیدار نہیں رہتا۔

علاج وحل

فکر و تدبر کر کے دل میں یہ بات بٹھائی جائے اور بار بار مراقبہ کر کے اس کا استحضار کیا جائے کہ:

الف: جس نعمت کی وجہ سے انسان خود پسندی کا شکار ہوتا ہے، وہ اس کا اختیاری ہے اور نہ ہی وہ اس کا کوئی ضروری استحقاق ہے، بلکہ یہ چیز بھی دیگر تمام نعمتوں کی طرح اللہ تعالیٰ ہی کے مشیت اور اسی کے فضل وکرم سے میسر ہوتی ہے، کوئی شخص اگر نیک اعمال کی تصویر اور سراپا بندگی بھی بن جائے تو بھی اس پر اللہ تعالیٰ کی

طرف سے کسی خاص نعمت یا خصلت ملنے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ انسان تو دنیا میں غلام سے بھی زیادہ ہلکے درجے یعنی بندے کی حیثیت سے جیتا ہے تو بندے کا مالک پر کیا استحقاق ہو سکتا ہے! نعمتوں کا استحقاق تو بڑے دور کی بات ہے، سچ تو یہ ہے کہ خود دنیا میں باقی رکھنا اور اللہ تعالیٰ کے حق میں ہزار حق تلفیوں کے باوجود مواخذہ نہ کرنا اور بسیطہ ارض پر چھوڑنا بھی اس کا بیش بہا احسان و کرم ہی ہے، قرآن کریم میں ہے:

{ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى}.[۱]

ترجمہ: "اور اگر اللہ لوگوں کو انکی بے انصافی پر پکڑے تو زمین پر کسی جاندار کو نہ چھوڑے لیکن ایک مدت مقرر تک انھیں مہلت دیتا ہے پھر جب ان کا وقت آتا ہے تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں"۔

دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے:

{وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللهَ كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيرًا}.[۲]

---

[۱] سورةالنحل،رقم الاية: ٦١.

[۲] سورةفاطر،رقم الاية: ٤٥.

ترجمہ: "اور اگر اللہ لوگوں سے ان کے اعمال پر گرفت کرتا تو سطح زمین پر کوئی جاندار نہ چھوڑتا لیکن وہ انہیں ایک وقت مقرر تک ڈھیل دیتا ہے پس جب انکا وقت مقرر آجائے گا تو بیشک اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے"۔

ب: اللہ تعالیٰ بہت ہی صمد اور غنی ذات ہے، اسی کی طرف سے تھوڑی سی بھی بے التفاتی ہو جائے تو خطرہ ہے کہ ساری نعمتیں سلب ہو جائیں اور نعمت میسر بھی ہو تو بھی موجب فضل اس لئے نہیں ہے کہ استدراج بھی ہو سکتا ہے اور خاتمے کا علم نہیں ہے کہ کیسے ہو گا؟ اس لئے نہ نعمتیں باعث کمال ہیں اور نہ ہی دائمی رہ سکتی ہیں بلکہ کسی بھی وقت سلب کی جا سکتی ہیں۔

ریاء

ریاء کو ہمارے ہاں اردو میں دکھلاوے سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ادھوری اور ناقص تعبیر ہے جو ریاء کے پوری اصطلاحی مفہوم کا کامل متبادل لفظ نہیں ہے، چنانچہ ریاء کے مفہوم سے واضح ہو جائے گا ان شاء اللہ۔

ریاء کا شرعی مفہوم اور اصطلاحی تعریف کیا ہے؟ امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حقيقة الرّياء: طلب المنزلة في قلوب النّاس بالعبادات وأعمال الخير.[1]

ترجمہ: "ریاء کی حقیقت یہ ہے کہ عبادات اور نیک اعمال کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں قدر و منزلت طلب کی جائے"۔

---

[1] الأربعين في أصول الدين، ص ۲۰۰.

علامہ برکوی نے اس مسئلے کے متعلق کہ تلاوتِ قرآن پر اجرت لینا ناجائز ہے، ایک مفید رسالہ تالیف فرمایا ہے، اس کے مقدمے میں "ریاء" کے متعلق تفصیلی بحث ذکر کی ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:

وفي الشرع إرادة نفع الدنيا بعمل الآخرة.

ترجمہ: "شرع میں آخرت کے عمل سے کسی دنیوی نفع کا کام لینا ریاء ہے"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

الف: یہاں دنیوی نفع سے مراد ہر وہ نفع ہے جو مرنے سے پہلے ہو، چاہے مخلوق سے ایسے نفع کو حاصل کرنے کا ارادہ کیا جائے یا اللہ تعالیٰ سے۔ یعنی اگر کوئی نیک عمل اور عبادت اس لئے انجام دیا جائے کہ اس کے بدلے اللہ تعالیٰ مجھے کوئی دنیوی نفع دیدے تو یہ بھی ریاء میں داخل ہے۔

ب: "ریاء" کے مادہ میں اگرچہ رؤیت اور دکھانے کا معنیٰ ہے لیکن شرعاً ریاء کے تحقق کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں کو دکھانے ہی کی نیت ہو، بلکہ اگر دکھانے کی نیت نہ ہو، اور تنہائی میں کوئی عبادت انجام دیا جائے لیکن اس کا مقصد دنیوی فائدہ ملنا ہو تو یہ بھی ریاء مذموم میں داخل ہے، تاہم چونکہ عام طور پر ریاء دکھلاوے کی صورت میں متحقق ہوتی ہے اس لئے اس کو ریاء کہا جاتا ہے۔

ج: جن صورتوں میں دکھلاوا نہیں ہوتا، ان کو اگر ریاء کے مفہوم میں داخل نہ بھی سمجھا جائے تو بھی اس میں شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ مذمت و ممانعت میں وہ ریاء کے ساتھ ملحق اور اسی کے مانند ہیں، آخر ریاء کی مذمت تو اسی لئے ہے کہ وہ اخلاص کی ضد ہے اور اخلاص کا فقدان ان صورتوں میں بھی ہوتا ہے (کیونکہ اخلاص محض

اللہ تعالیٰ کی رضاء اور تقرب کو مقصود بنانے سے عبارت ہے جبکہ ان صورتوں میں بھی دنیاہی مقصود بنائی گئی ہے)۔

د:اس کے بعد چوتھی ضروری اور اہم بات یہ تحریر فرمائی ہے جو ریاء کی درج بالا تعریف کا نتیجہ اور اسی پر تفریع ہے کہ اگر کوئی شخص ذکر و تلاوت وغیرہ عبادات دنیوی نفع حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے،تو اگر اس دنیوی نفع سے اصل مقصود کوئی دینی واخروی فائدہ ہو تب تو ریاء نہیں ہے ورنہ یہ بھی ریاء کے تحت داخل ہے(خواہ تنہائی میں انجام دی جائیں)۔فرماتے ہیں:

فمن اشتغل بشيء من الآيات والأذكار والأدعية، لحفظ نفسه أو لواحد من أصدقاءه من الآفات الدنيوية، أو لقهر العدو، فإن كان مراده من الحفظ والقهر، التفرغ للعبادة والتمكن من تأييد مذهب أهل الحق، والرد على أهل البدع ونشر العلم، وحث الناس على العبادة، ونحو ذلك، فهذه كلها إرادة سديدة، ونيات محمودة، لا يدخل شيء منها في باب الرياء، إذ المقصود منها أمر الآخرة بالحقيقة.[1]

ترجمہ:"جو شخص بعض آیات اور اوراد واذکار کواس لئے وظیفہ بنائے کہ اس کے ذریعے دنیوی آفات وبلیلات سے اپنی یا کسی دوست کی جان کی حفاظت کرے یا دشمن کو مغلوب کرے،تو اگر اس حفاظت اور غلبہ سے اس کا غرض یہ ہو کہ عبادت کے لئے

---

[1] رسالة إنقاذ الهالكين في حكم أخذ الأجرة على تلاوة القرآن الكريم،المبحث للثاني في حقيقة الرياء لغة وشرعاً وما يتعلق به،ص: ۵۳.وراجع أيضا الطريقة المحمدية، ص۱۷۸.

فارغ ہو جائے یا یہ کہ اہلِ حق کے مذہب کی تایید اور اہلِ بدعت کی تردید کر سکے اور علم کی نشر واشاعت اور لوگوں کو عبادت پر آمادہ کر سکے، تو یہ سب ارادے اور نیتیں درست اور پسندیدہ ہیں، ان میں کوئی بھی بات ریاء میں داخل نہیں ہے، اس لئے کہ حقیقت میں ان سب سے اخروی کام مقصود ہے"۔

ریاء کی مختلف تعریفات کا حل

امام غزالی رحمہ اللہ کی درج بالا تعریف کے مطابق لوگوں کے دل میں اپنی قدر ومنزلت پیدا کرنا ہی ہے یعنی ریاء کا مقصد حب جاہ ہی ہے جبکہ دوسری تعریف میں عموم ہے چاہے جاہ ومنزلت مقصود ہو یا کوئی دوسرا مادی نفع حاصل کرنا مطلوب ہو[1]۔ ان دونوں میں راجح تفسیر کونسی ہے؟ اس بات میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے کہ عبادات اور دیگر دینی اعمال واشغال سے دنیا حاصل کرنے کا قصد کرنا مذموم اور ایک ناکردنی اقدام ہے، لیکن ریاء کی درج بالا تشریحات میں کونسی تشریح زیادہ مناسب ہے؟

---

[1] واضح رہے کہ اس اختلاف کا حاصل اتنا ہے کہ اگر جاہ ومنزلت کے علاوہ دیگر مادی منافع کے لئے کوئی عبادت انجام دی جائے تو اس پر ریاء کا اطلاق ہو گا یا نہیں؟ علامہ برکوی کے نزدیک یہ بھی ریاء ہی ہے جبکہ امام غزالی رحمہ اللہ کے نزدیک اس پر ریاء کا اطلاق نہیں ہو گا۔ باقی اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عبادت میں ان چیزوں کا قصد کرنا اخلاص کے منافی ہے اور اس نیت کی وجہ عمل کا ثواب بھی جاتا رہتا ہے، چنانچہ امام غزالی رحمہ اللہ نے "اربعین" میں اخلاص کی بحث کے ضمن میں اس بات کی تصریح فرمائی ہے اور مادی نفع کے ارادے کرنے کو منافی اخلاص امور میں سے شمار فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: الاربعین فی اصول الدین، ص۲۶۹و۲۷۰۔

غور وفکر کے بعد واضح ہوتا ہے کہ ریاء کا عام متبادر معنیٰ تو وہی ہے جو امام غزالی رحمہ اللہ کی عبارت میں ذکر کیا گیا ہے لیکن ریاء کی مذمت اور ممانعت کی وجوہات واسباب پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ عبادات اور اعمال دین میں تعبد اور تقرب الٰہی کی شان پر دنیا کو ترجیح دینا ریاء کی روح ہے چاہے وہ دنیا جاہ ومنزلت کی شکل میں ہو یا مال ودولت اور سیم وزر کی صورت میں۔ مادی منافع کو اس میں داخل کرنے کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ جاہ ومنزلت سے بھی بسا اوقات یہی مادی چیزیں حاصل کرنا ہی مقصود ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علامہ برکوی رحمہ اللہ کی درج بالا تشریح زیادہ جامع معلوم ہوتی ہے۔

یہاں دونوں تشریحات میں یہ قید ہے کہ عبادت اور ان جیسی اخروی اعمال سے دنیا کو مقصود بنایا جائے، لہٰذا اگر دنیوی اعمال سے دنیا کمانا مقصود ہو چاہے جاہ حاصل کرنا مقصود ہو یا مال ودولت، تو یہ مذموم ریاء میں داخل نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر جائز بھی ہے یا نہیں؟ تو اگر اس میں کسی دھوکہ دہی وغیرہ ناجائز عنصر سے کام نہ لیا جائے تو ممنوع نہیں ہے البتہ انجام کار کے لحاظ سے اگر یہی دنیا کسی ناجائز چیز کا باعث بن جائے تو دوسری بات ہے۔

یاد رہے کہ یہاں "اعمال دین" یا "عبادات" جیسے الفاظ سے وہ تمام امور مراد ہیں جو شرعاً مطلوب ہوں چاہے لزوم وجوب کے درجہ میں مطلوب ہوں جیسے فرائض اور واجبات، اور یا ندب واستحباب کی حد تک مطلوب ہو۔ مباح امور اگرچہ نیک نیتی سے عبادت بن سکتے ہیں لیکن چونکہ بذات خود مطلوب نہیں، اس لئے وہ اس کے تحت داخل نہیں ہیں۔

وعیدات

{فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ (٤) الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (٥) الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ (٦) وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ}.[1]

ترجمہ: "پس ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے، جو اپنی نماز سے غافل ہیں، جو دکھلاوا کرتے ہیں اور برتنے کی چیز تک روکتے ہیں"۔

"مسند احمد" میں ہے:

عن محمود بن لبيد، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: " إن أخوف ما أخاف عليكم الشرك الأصغر " قالوا: وما الشرك الأصغر يا رسول الله؟ قال: " الرياء، يقول الله عز وجل لهم يوم القيامة: إذا جزي الناس بأعمالهم: اذهبوا إلى الذين كنتم تراءون في الدنيا فانظروا هل تجدون عندهم جزاء".[2]

ترجمہ: "حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے تمہارے اوپر سب سے زیادہ "شرک اصغر "کا خوف ہے لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ ! ﷺ شرک اصغر سے کیا مراد ہے ؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ریاکاری، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ریاکاروں سے فرمائے گا" جبکہ لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا" کہ جنہیں دکھانے کے لئے دنیا میں تم اعمال کرتے تھے ان کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ کیا ان کے پاس اس کا کوئی بدلہ ہے؟"۔

" صحیح مسلم" میں ہے:

---

[1] سورة الماعون، رقم الآية: ٤ – ٧.

[2] مسند أحمد ط الرسالة، ج٣٩ص ٣٩-رقم الحديث: ٢٣٦٣٠.

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " قال الله تبارك وتعالى: أنا أغنى الشركاء عن الشرك، من عمل عملا أشرك فيه معي غيري، تركته وشركه".[1]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، کہ میں شریکوں کی شرکت سے بے نیاز ہوں، جو اپنے عمل میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرے، میں اس کو اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں"۔

"سنن ترمذی" میں ہے:

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: تعوذوا بالله من جب الحزن، قالوا: يا رسول الله: وما جب الحزن؟ قال: واد في جهنم تتعوذ منه جهنم كل يوم مائة مرة. قلنا: يا رسول الله ومن يدخله؟ قال: القراءون المراءون بأعمالهم.[2]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: غم کے کنویں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ غم کا کنواں کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جہنم میں ایک وادی ہے، جس سے جہنم بھی دن میں سو مرتبہ پناہ مانگتا ہے، عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس میں کون داخل ہو گا آپ ﷺ نے فرمایا: ریاکاری سے قرآن پڑھنے والے اور اپنے اعمال کے ذریعے ریاء کرنے والے"۔

---

[1] صحيح مسلم: باب من أشرك في عمله غير الله، ج٤ ص ٢٢٨٩، رقم الحديث: ٢٩٨٥.

[2] سنن الترمذي ت بشار: باب ما جاء في الرياء والسمعة، ج٤ص ١٧١.

نقصانات

ایک تو خود دسیوں نصوص میں اس کی سخت مذمت کی گئی ہے، اس کے متعلق متعدد وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ ساتھ بڑا نقصان یہ ہے کہ اخلاص نیک عمل کے روح کی مانند ہے اور ریاء اخلاص کی ضد ہے جس کی وجہ سے عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوتا اور اس عمل سے متعلق اثرات وبرکات سے بھی محرومی مقدر ہو جاتی ہے۔ ریاء کی اساس وبنیاد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور چیز کو مقصود اصلی کا درجہ دیا جائے بلکہ گویا اللہ تعالیٰ اور اس کی رضاء کے بلمقابل دوسری چیز کو غالب رکھا جائے اور یہی "مقصودیت غیر" کا بت ایک ایسا عنصر ہے جو اپنے دامن میں دسیوں نقصانات رکھتا ہے، اس کو سدھارنے اور ٹھکانے پہنچانے کے لئے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، اس کی وجہ سے انسان کا سکون واطمینان رخصت ہو جاتا ہے، یکسوئی اور خودداری کی صفت ماند پڑ جاتی ہے۔

ریاء کا شرعی حکم

الف: ریاء کا جو شرعی مفہوم پہلے تحریر کیا گیا ہے یعنیٰ دینی اعمال وعبادات سے دنیا کو مقصود بنانا، اس مفہوم کے لحاظ سے ریاء ناجائز، گناہ اور نہایت مذموم کام ہے، قرآن وحدیث کی بیسیوں نصوص میں اس کی سخت مذمت کی گئی ہے، اس لئے اس کے ناجائز ہونے میں شبہ نہیں۔

ب: دنیوی اعمال سے اگر دنیا کو مقصود بنایا جائے تو یہ فی نفسہ مذموم نہیں ہے جب تک کہ اس میں جھوٹ اور دھوکہ وغیرہ کوئی ناجائز عنصر شامل نہ ہو۔

علامہ برکوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اعلم أن الرياء حرام قطعي بلا خلاف، يستحق فاعله العذاب بالنار.[١]

ترجمہ:" جان لو کہ ریاء بلا خلاف قطعی حرام ہے، اور اس کا مرتکب آگ کے عذاب کا مستحق ہے"۔

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فإن قيل: هل الرياء حرام، أم مكروه، أم مباح؟فالجواب: أن فيه تفصيلاً، وهو إما أن يكون بالعبادات، أو بغيرها، فان كان الرياء بالعبادات، فهو حرام، فإن المرائي بصلاته وصدقته وحجته، ونحو ذلك، عاص آثم، لأنه يقصد بذلك غير الله تعالى المستحق للعبادة وحده، فالمرائي بذلك في سخط الله.

وأما إن كان بغير العبادات، فهو كطلب المال على ما تقدم، لا يحرم من حيث إنه طلب منزلة في قلوب العباد، ولكن كما يمكن كسب المال بتلبيسات وأسباب محظورة، فكذلك الجاه، وكما أن كسب قليل من المال وهو الذي طلبه يوسف عليه السلام في قوله: {إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ}ولا نقول بتحريم الجاه وإن كثر، إلا إذا حمل صاحبه على ما لا يجوز على نحو ما ذكرنا في المال.[٢]

---

[١] رسالة إنقاذ الهالكين في حكم أخذ الأجرة على تلاوة القرآن الكريم،المبحث الثالث في حكم الرياء وما يلحق به،ص: ٥٩.

[٢] مختصر منهاج القاصدين،ص: ٢١٧.

ترجمہ: "اگر کوئی پوچھے کہ ریاء حرام ہے یا مکروہ ہے یا مباح؟ تو جواب یہ ہے کہ اس میں کچھ تفصیل ہے، وہ یہ کہ ریاء یا تو عبادات کے ذریعے ہو گا یا عبادات کے علاوہ کسی اور چیز کے ذریعے، پس اگر عبادات کے ذریعے ہو، تو حرام ہے۔ لہٰذا حج، نماز اور صدقہ جیسی عبادات کے ذریعے ریاء کرنے والا عاصی و گنہگار ہے، اس لئے کہ وہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ، جو کہ تنہا عبادت کا مستحق ہے کے ماسوا کا قصد کر رہا ہے، پس اس کے ذریعے ریاء کرنے والا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں ہے اور اگر (ریاء) عبادات کے علاوہ کے ذریعے ہو، جیسے مذکورہ اعمال کے ذریعے مال طلب کرنا، تو یہ اس حیثیت سے حرام نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں مرتبہ طلب کرنا ہے، لیکن جس طرح دھوکہ دہی اور ممنوع طریقوں سے مال کمانا ممکن ہے اسی طرح جاہ و شہرت بھی ممکن ہے، اور جس طرح کچھ مال کمانا، جیسا کہ حضرت یوسفؑ نے اس قول میں طلب کیا {اِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ} اور ہم جاہ و شہرت کو حرام نہیں کہتے اگرچہ زیادہ ہو، الا یہ کہ یہ جاہ و شہرت اس کو ناجائز کاموں پر آمادہ کردے جیسا کہ ہم نے مال میں ذکر کیا (کہ حرام اور دھوکہ دہی کے ذریعے مال کمانا)"۔

ریاء کے مراتب اور درجات

ریاء کے مختلف مراتب ہیں:

الف: پہلا مرتبہ یہ ہے کہ کسی نیک عمل کی اصل بنیاد ہی ریاء ہو یعنی ریاء ہی کے جذبے سے نیک عمل کیا جائے، اگر ریاء کا مقصد پورا نہ ہوتا تو اصل عبادت ہی انجام نہ دیتا۔ یہ ریاء کا سب سے مذموم درجہ ہے، پھر عبادات کی بھی مختلف اصناف ہیں اور ان سے متعلق احکام بھی مختلف ہیں چنانچہ اگر کوئی شخص اصل ایمان اسی ریاء کے جذبے سے لائے تو وہ حقیقۃً مسلمان ہی نہیں بنے گا۔

ب: دوسرا درجہ یہ ہے کہ ریاء ہی عمل کا باعث نہ ہو بلکہ عبادت کی نیت بھی باعث ہو یعنیٰ عبادت اور ریاء دونوں ہی عمل کرنے کے باعث بنے۔

ج: تیسرا درجہ یہ ہے کہ عمل شروع تو عبادت ہی کی نیت سے کیا جائے لیکن شروع کرنے کے بعد اس میں ریاء کا پہلو شامل ہو جائے۔ اب ریاء کا پہلو اگر عبادت کے پہلو سے غالب یا اس کے مساوی ہو تو اس ریاء کا حکم ظاہر ہو جائے گا اور عمل کا ثواب ضائع ہو جائے گا اور اگر مغلوب ہو تو اس میں محقق اہل علم کی آراء مختلف ہیں:

الف: متعدد اہلِ علم کے نزدیک اصل عمل کا بقدرِ اخلاص ثواب ملے گا لیکن ریاء کے بقدر عقاب کا مستحق ہو گا یا ثواب ضائع ہو گا۔

ب: بعض محققین کے نزدیک اس صورت میں عمل کا ثواب بالکل نہیں ملے گا۔ "طریقہ محمدیہ" اور اس کی شرح "بریقہ" میں ہے:

(وأما تأثيره) أي الرياء (في الطاعة) بإبطالها ونقص أجرها (فالمغلوب) بأن يكون جانب الخلوص غالبا علىٰ جانب الرياء في رياء التخليط (ينقص أجرها) أي أجر العبادة (ولا يبطلها) حتىٰ لا يلزم القضاء في الفرض والواجب.. (والمساوي) لعل المراد منه ما يكون شاملا لما يكون كل منهما مستقلا بالبعث علىٰ العمل ولما

يكون مجموعهما باعثا عليه (والغالب والمحض يبطلها) أي الطاعة.. (لعدم النية فيها) أي في هذه الثلاثة.[1]

ترجمہ:"طاعت میں ریاء کی تاثیر اس کو باطل کرنے اور اجر کم ہونے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، پس جس صورت میں ریاء کے ساتھ اخلاص مخلوط ہو تو اگر اس میں اخلاص کی جانب غالب ہو، تو اس عبادت کا اجر کم ہوتا ہے اور باطل نہیں ہوتا، یہاں تک کہ اس صورت میں فرض وواجب کی قضا بھی لازم نہیں ہوتی۔۔۔اور جو طاعت ریاء اور اخلاص دونوں پر برابر مشتمل ہو کہ ہر ایک نے الگ اس عمل پر ابھارا ہو اور دونوں کا مجموعہ اس عمل پر آمادہ کرنے والا ہو، اور غالب ریاء اور محض ریاء طاعت کو باطل کرتا ہے، اس لئے کہ ان تینوں میں نیت نہیں ہوتی"۔

ریاء شامل ہونے کی چار صورتوں کا حکم

اس عبارت میں ریاء کے مؤثر ہونے کی چار صورتیں ذکر کی گئی ہیں:

ا: عبادت میں ریاء کا پہلو مغلوب ہو اور عبادت وتقرب کی نیت غالب ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ عبادت درست ہے جس سے ذمہ فارغ ہو جائے گا اور ثواب بھی ملے گا البتہ ریاء کی وجہ سے اس میں کمی ہو گی۔

۲: ریاء یعنی دنیوی مفاد حاصل کرنے کا پہلو اور عبادت وتقرب کا ارادہ، دونوں برابر ہوں۔

۳: ریاء کا پہلو غالب ہو اور عبادت کا قصد مغلوب ہو۔

---

[1] بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية، القسم الثاني في الأخلاق الذميمة، ج٢ص١١١.

۴: خالص ریاء ہی ہو۔ ان تینوں صورتوں کا حکم یہ ہے کہ ثواب بھی نہیں ہے اور ذمہ بھی فارغ نہیں ہو گا۔ ذمہ فارغ نہ ہونے کی وجہ یہ ذکر فرمائی گئی ہے کہ اس قدر ریاء پائے جانے کے بعد عبادت کی نیت باقی نہ رہی جبکہ نیت کسی بھی عبادت میں ضروری ہے۔

علامہ برکوی نے اپنی ایک دوسری کتاب میں یہ مبحث کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ:

ا: ریاء یا عمل مکمل ہونے کے بعد پیدا ہو گی یا عمل کے ساتھ ساتھ شامل ہو گی۔ اگر عمل کے بعد ریاء صادر ہو جائے کہ مثلاً ایک شخص نے کوئی نیک کام کیا اور پھر دنیوی نفع حاصل کرنے کے لئے اس کا تذکرہ کرتا ہے ۔اس کا حکم بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ نیک عمل کا ثواب ضائع ہو جائے گا۔ لیکن امام غزالی رحمہ اللہ نے بعض دیگر نصوص کی بناء پر اس بات کو ترجیح دی ہے کہ سابقہ عمل اگر اخلاص کے ساتھ کیا تھا تو اس کا ثواب تو ضائع نہ ہو گا لیکن اس ریاء کا گناہ ہو گا۔

۲: اگر ریاء عمل کے ساتھ ساتھ شامل ہو تو یا تو خالص ریاء کا جذبہ ہو گا یا عبادت و تقرب کی نیت بھی ہو گی۔ اگر خالص ریاء ہی کے جذبے سے کوئی عبادت انجام دی تو اس عمل کا ثواب نہیں، اگر عبادت ایسی ہو کہ وہ تجزی و تقسیم قبول کرتی ہو مثلاً تلاوت قرآن کریم، ذکر اور صدقہ وغیرہ، تو اس صورت میں جہاں تک ریاء شامل نہ ہوئی تھی اس کا ثواب ہو گا اور باقی کا ثواب ضائع ہو جائے گا۔

۳: اگر ریاء خالص نہ ہو بلکہ اس میں عبادت اور تقرب کی نیت بھی شامل ہو تو اگر عمل پر اصل باعث خالص ریاء ہو یا ریاء اور عبادت کا جذبہ، دونوں چیزوں کا مجموعہ عمل کا باعث قرار پایا ہو تو ان دونوں صورتوں میں عمل ضائع ہو جائے گا اور اگر اصل باعث رضاء خداوندی کا حصول ہو لیکن ساتھ ریاء بھی شامل ہو گئی تو اس صورت میں اصل عمل تو ضائع نہ ہو گا، البتہ ریاء کی وجہ سے ثواب میں کمی ہو گی۔ اور اگر ریاء اور جذبہ عبادت دونوں چیزیں مستقل مستقل باعث ہوں تو اس صورت میں دلائل کے ظاہری تعارض کی وجہ سے امام غزالی رحمہ اللہ (وغیرہ) نے تردد کا اظہار فرمایا ہے لیکن خود علامہ برکوی صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ اس صورت میں ذمہ فارغ ہو جائے گا۔[۱]

☆☆☆☆☆☆☆

[۱] رسـالة إنقاذ الهالكين في حكم أخذ الأجرة على تلاوة القرآن الكريم، المبحث الثالث في حكم الرياء وما يلحق به، ص: ٥٩.

- ✓ باب چہارم: اخلاق حسنہ وصفات حمیدہ
- ✓ توبہ
- ✓ خوف خدا
- ✓ زہد مفہوم ومقام
- ✓ صبر
- ✓ شکر
- ✓ اخلاص
- ✓ توکل واعتماد
- ✓ محبت الٰہی
- ✓ رضابالقضاء
- ✓ محاسبہ نفس

باب چہارم:

اخلاق حسنہ وصفات حمیدہ

توبہ کا مفہوم واہمیت

توبہ لغوی لحاظ سے واپس لوٹنے کو کہا جاتا ہے، یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ انسان جب گناہ و کوتاہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے دور ہو جائے تو اپنے کئے پر ندامت کے ساتھ واپس اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آئے۔امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حقیقة التّوبة الرّجوع إلى الله تعالى عنْ طريق البعد إلى طريق القرب.[۱]

ترجمہ:"توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ دوری کا راستہ چھوڑ کر قرب کے راستے سے اللہ کی طرف لوٹا جائے"۔

توبہ تب معتبر ہے جب اس میں درج ذیل شرائط پائی جائیں:

۱: اخلاص۔ یعنیٰ جو گناہ صادر ہو چکا ہے،اس پر دلی ندامت اور آئندہ کے لئے اس کی طرف نہ جانے کا وعدہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی نیت سے ہو۔ لہٰذا اگر کسی دنیوی مفاد کے حصول یا نقصان سے بچاؤ کے لئے یہ کیفیت بن جائے تو وہ توبہ معتبر نہیں۔ یہ شرط اس لئے لگائی گئی کہ تمام نیک اعمال کے قبول ہونے کی بنیاد اخلاص ہے،اس کے بغیر نیک اعمال جسم بے روح کے مانند ہیں۔

---

[۱] الأربعين في أصول الدّين،ص۲۲٦.

۲: گناہ چھوڑنا۔ گناہ چھوڑ کر توبہ کی جائے، لہٰذا اگر کوئی شخص گناہ میں بھی مصروف عمل ہے اور ساتھ توبہ واستغفار کی مشق بھی جاری ہے تو ایسا توبہ معتبر نہیں ہے ،توبہ کا معنیٰ ہی واپس لوٹنا ہے جب گناہ سے واپس لوٹا نہیں تو توبہ کیونکر ہو سکتا ہے! بلکہ ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک گونا مذاق کے مترادف ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی متعلق ہے کہ اگر بندگان کے حقوق میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو اور اس سے توبہ کرنا مقصود ہو تو صرف قلبی ندامت یا زبانی گناہ نہ کرنے کا وعدہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ حق دار کو اس کا حق لوٹانا یا دلی رضامندی کے ساتھ معاف کروانا بھی ضروری ہے،ورنہ اصل اقدام کا گناہ تو امید ہے کہ معاف ہو جائے گا لیکن دوسرے کے حق کا وبال اور اس کو پاس رکھنے اور حق دار کو حق نہ دینے کا گناہ سر پر عائد رہے گا۔

۳: ندامت اور پشیمانی۔ یعنیٰ جو گناہ صادر ہو جائے،اس پر دلی ندامت اور قلبی پشیمانی ہو، درحقیقت یہی چیز توبہ کی بنیاد ہے اور جس قدر گناہ پر ندامت زیادہ ہو گی تو اسی قدر توبہ میں خلوص واستحکام بھی زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر ندامت ہی نہ ہو تو توبہ پر آمادگی کیونکر متصور ہو سکتی ہے!

۴: آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پختہ وعدہ کرے کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا۔ عزم کرنا کافی ہے، اگر آئندہ غلطی سے دوبارہ یا بار بار بھی گناہ ہوتا رہے تو بھی توبہ ختم یا ضائع نہیں ہو گا۔

۵: توبہ کا زمانہ ہو۔ اگر کوئی شخص آخری سانس کے وقت توبہ کرے تو ضابطہ کے مطابق اس کا بھی اعتبار نہیں ہے،اسی طرح قرب قیامت میں جب

مغرب کی طرف سے سورج طلوع ہو جائے گا تو اسی کے ساتھ توبہ کا دروازہ مسدود ہو جائے گا اور اس کے بعد کوئی توبہ کرے بھی، تو قبول نہ ہو گا۔

توبہ کی فضیلت واہمیت سے متعلق چند نصوص

سورۃ "بقرۃ" میں ہے:

{إِنَّ اللهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ}.[1]

ترجمہ: "بیشک اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور بہت پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

" صحیح بخاری" میں ہے:

لله أفرح بتوبة عبده من رجل نزل منزلا وبه مهلكة، ومعه راحلته، عليها طعامه وشرابه، فوضع رأسه فنام نومة، فاستيقظ وقد ذهبت راحلته، حتى إذا اشتد عليه الحر والعطش أو ما شاء الله، قال: أرجع إلى مكاني، فرجع فنام نومة، ثم رفع رأسه، فإذا راحلته عنده.[2]

ترجمہ: "اللہ اپنے بندے کی توبہ سے اس آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو ایسی جگہ میں اترے جہاں ہلاک ہونے کا خطرہ ہو اور اس کے ساتھ اس کی سواری ہو جس پر اس کا کھانا اور پانی ہو، وہ سر رکھ کر سو جائے اور جب بیدار ہو کر دیکھے تو اس کی سواری غائب ہو، پھر جب گرمی اور پیاس کی شدت اس کو سخت پریشان کرے، اور مایوس

---

[1] سورةالبقرة،رقم الاية: ٢٢٢.

[2] صحيح البخاري: باب التوبة،ج٨ص ٦٨.

ہو کر کہے کہ اپنی جگہ واپس چلا جاؤں گا، لوٹ کر جب (سخت پریشانی میں) اس کی آنکھ لگ جاتی ہے، اور پھر سر اٹھا کر دیکھے تو اس کی سواری اس کے پاس کھڑی ہو"۔

توبہ کا حکم

جس طرح گناہ سے بچنا ضروری اور ارتکاب کرنا گناہ ہے یوں ہی اگر کہیں گناہ صادر ہو جائے تو اس سے توبہ کرنا بھی ضروری اور غفلت برتنا گناہ ہے، قرآن وسنت کے دسیوں نصوص میں صرف توبہ کی ترغیب یا اس کے فضائل ہی بیان نہیں کئے گئے بلکہ ساتھ ساتھ اس کا امر بھی دیا گیا ہے اور "امر" کا صیغہ اصلاً وجوب کے لئے آتا ہے۔ توبہ گناہ کو ختم کرنے کی ایک امکانی صورت ہے تو جس طرح اصل گناہ کا کرنا ناجائز اور ممنوع تھا اور چھوڑنا ضروری تھا، یوں ہی استطاعت کے باوجود گناہ کو ختم نہ کرنا اور برقرار رکھنا بھی ممنوع ہے۔ اگر کسی سے ظاہری گناہ صادر نہ بھی ہو یا گناہ تو صادر ہوا ہے لیکن اس کے بعد شرائط کے مطابق ایک بار توبہ کر لی اور اب غالب گمان یہی ہے کہ کوئی گناہ ذمہ پر برقرار نہیں ہے تو اس صورت میں بھی توبہ واستغفار کرنا بلکہ اس کا معمول جاری رکھنا مسنون، مفید اور نہایت کارِ ثواب اور رہبر ترقی ہے۔ تمام صالحین، اہل علم اور خود حضور نبی کریم ﷺ کی عادتِ شریف تھی کہ کثرت سے استغفار کرتے تھے اور ان کا استغفار خوب استحضار کے ساتھ ہوتا تھا جس کے ضمن میں توبہ کی تمام تر شرائط متحقق ہو جاتی تھیں۔ قرآن حدیث کے بیسیوں نصوص میں توبہ واستغفار کی جو فضیلت بار بار بیان فرمائی گئی ہے، اس کا بھی تقاضا یہی ہے۔

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ کا موقف اس حوالہ سے مزید احتیاط پر مبنی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ توبہ بہر حال واجب ہے کیونکہ:

الف: انسان بہر صورت کسی نہ کسی ظاہری یا باطنی گناہ میں ملوث رہتا ہے۔

ب: اگر تمام گناہوں سے سالم بھی ہو، تب بھی اللہ تعالیٰ سے غفلت تو ہوتی ہی ہے اور غفلت بھی دوری اور بعد کا ذریعہ ہے اس لئے توبہ کرکے واپس لوٹنا ضروری ہے۔

ج: اگر کہیں کوئی خوش نصیب ایسا بھی ہو جو کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو تو بھی بعض اوقات ان کی ایمانی حالت اور باطنی کیفیت میں ضرور نشیب وفراز آتا ہے تو ممکن ہے کہ اوپر کی حالت اور بلند تر درجے سے انحطاط آیا ہو اور یہ بھی ایسی چیز ہے جس سے بھی توبہ کرنے کی ضرورت ہے[۱]، چنانچہ خود حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد عالی ہے:

"صحیح مسلم" میں ہے:

عن أبي بردة، عن الأغر المزني، وكانت له صحبة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: «إنه ليغان على قلبي، وإني لأستغفر الله، في اليوم مائة مرة».[۲]

---

۱ الأربعين في أصول الدّين،ص۲۲۷.

۲ صحيح مسلم:باب استحباب الاستغفار والاستكثار منه، ج٤ص ۲۰۷۵.

ترجمہ:"حضرت اغر مزنی صحابی رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میرے دل پر (کبھی کبھی) غفلت آجاتی ہے اسی وجہ سے میں دن میں سو مرتبہ اللہ سے استغفار کرتا ہوں"۔

توبہ نہ کرنے کے اسباب وعناصر

تج توبہ نہ کرنے کے متعدد اسباب و عناصر ہیں، جن میں سے چند اہم اسباب یہ ہیں:

ا: ناواقفیت: کسی کام کے گناہ ہونے کا علم نہ ہو یا توبہ کرنے کا حکم یا طریقہ کار ہی معلوم نہ ہو۔

۲: فقدان احساس: گناہ سے توبہ کرنے کا تو علم ہوتا ہے لیکن اس حکم کی اہمیت وافادیت نہیں معلوم ہوتی۔

۳: بے جا اعتماد و بھروسہ: اپنے کسی نیک عمل یا نیک لوگوں کے ساتھ تعلق پر بھروسہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم پر بے جا بھروسہ کرلیا جاتا ہے کہ وہ ضرور معاف فرمائیں گے۔

۴: بعض اعمالِ بد کی نحوست ہوتی ہے کہ ان کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے شخص کو توبہ کرنے کی توفیق ہی نصیب نہیں ہوتی۔ چنانچہ توبہ کی توفیق ملنا اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کے توبے کا قبول ہونا، یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بیش بہا انعام واکرام ہی ہے جس سے ہر شخص کو نوازنا ضروری نہیں ہے، اس لئے بعض اعمال کی پاداش میں یہ نعمت سلب ہوجاتی ہے۔

علاج وحل

۱: اللہ تعالیٰ کے کمالات واحسانات کو بار بار سو چاجائے ،ایسے باکمال ومہربان ومحسن رب کی نافرمانی کی برائی پر بھی مکرر سوچتا رہے۔

۲: توبہ واستغفار سے متعلق جو نصوص وارد ہوئے ہیں، ان کو بھی کبھی کبھی دیکھا یاسنا جائے۔

۳: اپنے اعمال واخلاق کا محاسبہ کرکے گناہوں پر اس کو ٹوکا جائے اور استغفار وتوبہ کا اہتمام پابندی کے ساتھ جاری رکھے۔

خوف خدا

دنیا یا آخرت میں اللہ تعالیٰ کے پکڑ اور مؤاخذے سے ڈرتے رہنا،خوفِ خدا کہلاتا ہے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفات وافعال پر غور کیاجائے اور دوسری جانب اپنے کمزوریوں اور غفلت بھری زندگی کو سامنے رکھ لیاجائے تو دل ہی دل میں خوف ودہشت پیدا ہوتی ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں یا دنیا ہی میں مؤاخذہ نہ ہوجائے۔ یہ نیک صفات اور مطلوب عادات میں سے ایک اہم صفت وخُلق ہے جو کئی سعادتوں کا ذریعہ ہے۔

حکم

اس قدر خوفِ خدا دل میں رکھنا جو گناہ سے بچنے یا ضروری احکام کی بجا آوری کے لئے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہو، واجب ہے۔ ایک تو اسی لئے کہ یہ گناہ سے تحفظ یا واجبات کی ادائیگی کے لئے ضروری مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے اور ساتھ اس لئے بھی کہ خوف خدا سے متعلق نصوص پر عمل کرنے کی کم از کم یہی شکل

متعین ہے۔اس سے زیادہ خوف خدا مطلوب، محمود اور بڑی مفید صفت وعادت ہے جو اپنے دامن میں بڑی خوبیاں اور متعدد فوائد رکھتا ہے۔البتہ اس قدر خوف دل میں سمانا جو اللہ تعالیٰ اوراس کے عفو ومغفرت سے ناامیدی اور عملی بے کاری کا ذریعہ بن جائے،ناجائز اور ممنوع ہے جس سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

خوف خدا سے متعلق چند نصوص واقوال

سورۃ" آل عمران "میں ہے:

{فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ}.[1]

ترجمہ:"پس تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو"۔

سورۃ"الرحمن "میں ہے:

{ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ}.[2]

ترجمہ:"اوراس کے لیے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے دو باغ ہوں گے"۔

سورۃ"البینۃ"میں ہے:

{جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ }.[3]

---

[1] سورةآل عمران،رقم الاية: ١٧٥.

[2] سورةالرحمن،رقم الاية: ٤٦.

[3] سورةالبينة،رقم الاية: ٨.

ترجمہ:"ان کا بدلہ ان کے رب کے ہاں ہمیشہ رہنے کے بہشت ہیں ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے یہ اس کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے"۔

سورۃ"النازعات"میں ہے:

{وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ (٤٠) فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ}.[١]

ترجمہ:"اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اپنے نفس کو بری خواہش سے روکا، سو بیشک اس کا ٹھکانا بہشت ہی ہے"۔

"مصنف ابن ابی شیبہ"میں ہے:

عن عبد الله، أنه كان يقول في خطبته: إن أصدق الحديث كلام الله وأوثق العرى كلمة التقوى ...ورأس الحكمة مخافة الله.[٢]

ترجمہ:"حضرت عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ وہ خطبہ میں فرمایا کرتے تھے:سب سے سچی بات اللہ تعالی کی ہے اور سب سے مضبوط رسی تقوی کا بول ہے۔۔۔اور سب سے اعلی حکمت اللہ کا ڈر ہے"۔

"شعب الایمان"میں ہے:

قال عمر بن عبد العزيز: " من خاف الله أخاف، الله منه كل شيء، ومن لم يخف الله خاف من كل شيء".[٣]

---

١ سورةالنازعات،رقم الاية: ٤٠، ٤١.

٢ مصنف ابن أبي شيبة،رقم الحديث ٣٤٥٥٢، ج٧ص ١٠٦.

٣ شعب الإيمان، ج٢ص ٣٠٤.

ترجمہ:"حضرت عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے ہے: جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالی اس سے ہر چیز کو ڈراتا ہے اور جو اللہ سے نہیں ڈرتا وہ ہر چیز سے ڈرتا ہے"۔

"شعب الایمان" میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

قال الفضيل بن عياض: إن " خفت الله لم يضرك أحد، وإن خفت غير الله لم ينفعك أحد".[1]

ترجمہ:"حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں: کہ اگر تو اللہ سے ڈرا تو کوئی بھی تجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور اگر تو غیر اللہ سے ڈرا تو کوئی تجھے نفع نہیں پہنچا سکے گا"۔

فوائد

ا: تمام حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام، اہل علم اور نیک لوگوں کی مشترکہ سنت ہے، حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام خوف خدا میں دیگر تمام لوگوں سے ممتاز وفائق ہوتے تھے، اسی طرح جو افراد بھی ان کے قریب ہوتے ہیں، ان کے خوف وخشیت کا پیمانہ دیگر لوگوں سے برتر اور فائق ہوتا ہے۔ صحیح بخاری شریف کی ایک طویل حدیث کا حصہ ہے جس میں حضور نبی کریم ﷺ نے چند افراد کو خطاب کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ:

أما والله إني لأخشاكم لله وأتقاكم له.[2]

ترجمہ:"اللہ کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالی سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ تقوے والا ہو"۔

---

[1] شعب الإيمان، ج٢ص ٣٠٥.

[2] صحيح البخاري: باب الترغيب في النكاح، ج٧ص ٢.

۲: اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور شریعت کے حکم عدولی سے بچنے کا بہترین ذریعہ اور آسان ترکیب ہے، اسی طرح بہت سے احکام کی بجاآوری کا باعث ہے۔ لہٰذا "اتباع شریعت" کے جو کچھ فوائد وثمرات ہیں، ان میں خوف خدا کا بھی غیر معمولی حصہ ہے۔

۳: انسان کے اندر عبودیت کا جذبہ برقرار رہنے کا ذریعہ ہے اور یہی عبودیت ہی انسان کی عزت وشرافت اور دیگر مخلوق سے فوقیت وبرتری کا راز ہے۔

۴: عجب وخود پسندی، کبر وفخر وغیرہ اخلاقی خرابیوں سے بچنے کا خصوصی ذریعہ ہے۔

خوف خداوندی پیدا کرنے کا طریقہ

جس طرح کسی چیز کو نہ چاہنا، نہ کھانا، نہ بولنا اصل ہے اور اس کے اضداد کی حیثیت ایک عارض کی سی ہے جن کا انسان کسی خاص عنصر کی وجہ سے ارتکاب کرتا ہے، یوں ہی انسان میں اصل یہی ہے کہ وہ کسی چیز سے نہ ڈرے لیکن بعد میں مختلف عوامل کی وجہ سے خوف وڈر کی کیفیت اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ذہن وماحول کے مطابق مختلف چیزوں سے ڈرنے لگ جاتا ہے۔ ڈرنے کے عوامل کی اصل بنیاد "سمجھ وشعور" ہے یعنی کسی چیز کے بارے میں جب انسان یہ فرض کرلیتا ہے کہ یہ مجھے نقصان پہنچاسکتی ہے اور میرے نقصان وپریشانی کا ذریعہ بن سکتا ہے تو اس سے ڈرنے کی کیفیت خود بخود جنم لینا شروع ہو جاتی ہے اور پھر جس حد تک یہ احساس ہوتا ہے، اسی قدر ڈر وخوف کا مادہ بھی متحقق ہو جاتا ہے۔ خطرناک چیز کی خطرناکی سے اسی وقت آدمی ڈرتا ہے جب اس کا احساس بھی ہو،

نا سمجھ بچے بسا اوقات سانپ اور بچھو کے ساتھ بھی کھیلنا شروع کرتے ہیں، یہی نا سمجھی ہی ہے جس کی بدولت بعض نادان بکریاں بھیڑیوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کو ترجیح دیدیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے خوف اوراس سے خشیت کی بنیاد بھی یہی "معرفت" ہے، لہٰذا "خوف خدا" پیدا کرنے کا فطری طریقہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر بار بار غور کرکے نظریہ وعقیدہ کی حیثیت دیدی جائے کہ وہ زبردست قادر ومالک ہستی ہے جو دنیا وآخرت میں جس طرح چاہے، انسان کو ہر طرح کے تکالیف ومصائب، مشکلات ونقصانات اور ناپسندیدہ وناقابل برداشت صورت حال سے دو چار کرسکتی ہے۔بار بار کی دہرائی سے جب یہ تصور پختہ ہوجائے گا تو خود بخود ہی خوف خدا کا مادہ پیدا ہو گا۔

اطمینانی اور بے خوفی کے اسباب

انسان اسی چیز کے حوالے سے بے فکر رہتا ہے جس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ رکھتا ہو، چاہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ چیز بے حس اور لاشعور ہے یا بالکل بے حس تو نہ ہو لیکن طاقت وقدرت کی نعمت سے محروم ہو یا قدرت بھی ہو لیکن اس قدر نہ ہو جس سے کسی خطرہ کا خدشہ ہوسکے۔ خطرہ پیش آسکنے کے باوجود بے خوفی درج ذیل وجوہات کی وجہ سے ہوتی ہے:

ا: اپنی قدرت وطاقت کا بہت زیادہ ہونا۔ چنانچہ چیونٹی بھی بسا اوقات انسان کو کسی حد تک نقصان پہنچا سکتی ہے لیکن ڈرنے کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ انسان کی بنسبت اس کی طاقت ہیچ ہے۔

۲: امن واطمینان کے استحقاق کا اور مخاطب کے انصاف کا یقین۔ جب انسان یہ یقین کرلیتا ہے کہ میں کسی بھی جرم سے ہر طرح بری اور کوسوں دور ہوں، امن واطمینان کے لئے جو باتیں ضروری ہیں وہ سب میرے اندر جمع ہیں اور ساتھ اس بات کا بھی یقین ہو کہ مخاطب انصاف کا ہر طرح شیدائی اور اسی پر عامل وکاربند ہے ،تب بھی ایسے مخاطب کے حوالہ سے اطمینان کی کیفیت رہتی ہے۔ چنانچہ انصاف وعدالت پر کاربند دنیا میں عام طور پر غیر مجرم لوگ اسی بنیاد پر حکومتی پکڑ سے اطمینان میں رہتے ہیں۔

۳: مخاطب کے متعلق اگر یہ یقین پیدا ہو جائے کہ وہ کسی بھی وجہ سے پکڑنا نہیں چاہ رہا، تو بھی اس سے بے فکری ہی پیدا ہوتی ہے، مثلاً کسی شخص کے ہاں رحم وکرم، معافی اور نرمی کا اس قدر فیضان ہو کہ شدت وغضب اور مواخذہ وانتقام کا نام وہاں موجود نہ ہو، یا کسی شخص کے ساتھ قرابت داری یا احسان مندی کا رشتہ ہو اور معلوم ہو کہ وہ شخص ان جیسے تعلقات سے متاثر و مجبور بھی ہو جاتا ہے۔

یہی وہ بنیادی اور اہم وجوہات ہیں جن کی بناء پر کسی شخص سے بے فکری اور بے خوفی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو اچھی طرح سمجھ کر مستحضر رکھا جائے تو یہ بات یقینی طور پر حاصل ہو جائے گی کہ وہاں ان وجوہات کا دور دور تک بھی کوئی شائبہ نہیں ہے، چنانچہ اس کی قدرت وطاقت کا تو کیا کہنا! ہر ممکن چیز اس کی قدرت کے تحت داخل ہے،وہ وجو چاہے کر سکتا ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی عابد وشاکر ہو لیکن بہر حال وہ اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا پورا پورا حق ادا نہیں کر سکتا۔ حق عبودیت کی ادائیگی کا احساس، توفیق دینا اور پھر اس پر

استقامت بخشنا بھی بھاری بھر نعمتیں ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حق ومعبودیت کا دامن مزید پھیلتا اور بھاری ہو جاتا ہے تو بے چارہ انسان کیونکر پورا پورا حق ادا کر پائے گا، ایک شاعر "محمود وراق" نے کیا ہی خوب کہا ہے:

إذا كان شكري نعمةَ الله نعمةً ... علي له في مثلها يجب الشكر

فكيف بلوغ الشكر إلا بفضله ... وإن طالت الأيام واتصل العمر

إذا مس بالسراء عم سرورها ... وإن مس بالضراء أعقبها الأجر

وما منهما إلا له فيه منة ... تضيق بها الأوهام والبر والبحر

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر میرا شکر اداء کرنا ان نعمتوں کی طرح ایک اور نعمت ہے جس پر شکر ضروری ہے

اللہ کے فضل کے بغیر صحیح معنیٰ میں شکر کیسے کیا جاسکتا ہے اگرچہ عمر بہت ہی لمبی کیوں نہ ہو جائے

جب خوشی دیتا ہے تو اس کی مسرّت پھیل جاتی ہے اور جب غم دیتا ہے تو اس کے بعد ثواب عطا کرتا ہے

ان میں سے ہر ایک کے اندر اس کا ایسا احسان ہے جسے نہ وہم وخیال سما سکتا ہے نہ بحر وبر"۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ صرف رحیم وکریم اور عفو ودر گزر کرنے والا ہی نہیں ہے بلکہ عزیز، قہار اور انتقام لینا بھی ان کے یقینی صفات میں سے ہیں، اس لئے کسی عقل مند کے لئے مؤاخذہ سے مطمئن ہو جانا کہاں ممکن ہے؟ اس کی ایک صفت "صمد" اور "غنی" ہونا بھی ہے جس کا یہ عالم ہے کہ ہر وہ ماسوا سے ہر طرح مستغنی ہے، رشتہ وناطہ یا احسان مندی کا تو وہاں تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے شان

استغناء کا یہ حال ہے کہ اپنے نہایت مقرب رسول حضرت عیسی علیہ الصلاۃ والسلام کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

{لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللهَّ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللهَّ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَللهَّ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَاللهَّ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ}.[۱]

ترجمہ: "بیشک وہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا اللہ تو وہی مسیح مریم کا بیٹا ہے، کہہ دے پھر اللہ کے سامنے کس کا بس چل سکتا ہے، اگر وہ چاہے کہ مسیح مریم کے بیٹے اور اس کی ماں اور جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو ہلاک کر دے اور آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی سلطنت اللہ ہی کے واسطے ہے، جو چاہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

زہد مفہوم و مقام

دل کا استطاعت کے باوجود دنیا سے کنارہ کش ہو جانے کو زہد کہا جاتا ہے، جب کسی کا دل دنیا سے بالکل بے رغبت ہو جائے تو ایسے شخص کو زاہد کہا جاتا ہے۔ حضرت امام غزالی اور بعض دیگر علماء تصوف (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے کھانے، پہننے اور رہن سہن وغیرہ مختلف ضروریات کے لحاظ سے اس کے لئے مقدار یں بھی مقرر فرمائی ہیں کہ مثلاً کھانا کتنے وقفے سے اور کتنا کھائے؟ لباس کیسا اور کتنا ہو؟ سامان معیشت کب اور کتنا ہو؟ یوں ہی بود و باش کی جگہ کیسی ہو؟ لیکن ان باتوں

---

[۱] سورۃالمائدۃ،رقم الایۃ: ۱۷.

کا اصل مدار ضرورت پر ہے، کونسی چیز کی کس حد تک ضرورت ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جس کے جواب میں ماحول و معاشرہ، افراد واصناف وغیرہ عناصر کی وجہ سے بے تحاشا تفاوت ہو سکتا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زہد کا اصل مقام و محل دل ہے کہ دل میں دنیا سے لگاؤ نہ رہے اور اس کا غالب نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے کاموں میں ضرورت سے زیادہ اشتغال نہ رہے۔ جس طرح مذموم اخلاق میں سے "حب دنیا" کا اصل تعلق دل کے ساتھ تھا لیکن اس کا اثر ظاہری اعضاء وجوارح اور اشغال و مصروفیات پر ہوتا تھا، یوں ہی مطلوب اخلاق میں سے "زہد" اس کی بالکل متضاد صفت ہے جو محمود و مطلوب ہے۔

اگر عملی طور پر دنیا اور اس کے اسباب ومتاع نصیب نہ ہوں تو یہ فقر ہے، زہد نہیں ہے۔ زہد اور فقر میں فرق یہ ہے کہ فقر اسباب دنیا کے بالکل مہیا نہ ہونے یا خاص مقدار میں میسر نہ ہونے کا نام ہے جبکہ زہد دل نہ لگانے سے عبارت ہے۔ البتہ زہد کا عام طور پر نتیجہ اختیاری فقر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، فقر کے ساتھ ساتھ اگر دل پر محنت کی جائے تو بڑی آسانی کے ساتھ اس کو زہد میں تبدیل بلکہ اس کے ساتھ متصف کیا جا سکتا ہے۔

زہد کے مراتب واحکام

جیسا کہ ابھی تحریر کیا گیا، زہد دنیا اور اس کے اسباب وسامان سے دل نہ لگانے کا نام ہے، پھر دنیا اور اس کے متاع واسباب کی ہزاروں صورتیں ہیں جو بنیادی طور پر "جاہ"، "مال" اور "باہ (شہوت)" کے تحت داخل ہو جاتی ہیں لیکن ان

چیزوں کے ساتھ دل لگانے کی بھی سینکڑوں صورتیں متصور ہو سکتی ہیں، اس لحاظ سے زہد کے مراتب و درجات بھی مختلف ہو سکتی ہیں۔ زہد کی ان تمام شکلوں کا حکم یکساں نہیں ہے بلکہ اگر زہد کو ترکِ دنیا کا نام قرار دیا جائے یا اس کو زہد کی لازمی شرط کی حیثیت دیدی جائے تو اس کے مطابق زہد کی سب صورتوں کو مطلوب قرار دینا بھی مشکل ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:

الف: دنیا سے اس قدر جی لگانا جو کسی ضروری حکمِ شرعی کے خلاف ورزی کا ذریعہ بن جائے، ناجائز اور ممنوع ہے اور اس سے بچنے کی حد تک "زہد" لازم ہے۔

ب: جو احکام شرعاً لازم اور واجب تو نہ ہو لیکن شریعت کی طرف سے اس کی ترغیب وارد ہوئی ہو جن کو نفل یا مندوب و مستحب اعمال کہا جاتا ہے، اگر دنیا کے ساتھ دل لگانے سے صرف ان احکام میں خلل آتا ہو تو یہ لگاؤ بھی مذموم ہے لیکن گناہ و ناجائز کی حد تک مذموم نہیں ہے بلکہ نامناسب اور خلافِ اولیٰ کی حد تک مذموم ہے، اس قدر لگاؤ سے زہد بھی اسی حد تک مطلوب و محمود ہے۔

ج: دنیا میں چونکہ بہت لذت و مٹھاس محسوس ہوتی ہے اور یہ بالکل نشہ آور چیز کے مانند ہے جس کا تھوڑا استعمال رفتہ رفتہ زیادہ اور مستقل استعمال کا باعث بن جاتا ہے، اس لئے اس میں خوب احتیاط کی ضرورت ہے، اس باب میں اباحت وجواز کی آخری حد پر جاکر رُکنا زیادہ مناسب اس لئے نہیں ہے کہ اس کا نتیجہ عموماً گناہ میں مبتلا ہونے کی صورت میں عائد ہو جاتا ہے۔

علامہ ابو طالب مکی رحمہ اللہ اپنی مشہور کتاب "قوت القلوب" زہد کا حکم بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ثم إن الدنيا هي نصيب كل عبد من الهوى وما دنا من قلبه من الشهوات، فمن زهد في نصيبه وملكه من هواه المذموم فهذا هو الزهد المفترض، ومن زهد في نصيبه من المباح وهو فضول الحاجة من كّل شيء، فهذا هو الزهد المفضل يرجع ذلك إلى حظوظ جوارحه التي هي أبواب الدنيا منه وطرقها إليه، فالزهد في محرّماتها هو زهد المسلمين به يحسن إسلامهم، والزهد في شبهاتها هو زهد الورعين به يكمل إيمانهم، والزهد في حلالها من فضل حاجات النفس هو زهد الزاهدين به يصفو يقنيهم.[1]

ترجمہ: "دنیا ہر شخص کے خواہشات اور قلبی شہوات کا حصہ ہے، پس اپنے حصے کی بُری خواہشات سے بے رغبتی اختیار کرنا تو فرض ہے اور جس نے مباح مگر غیر مفید یعنی فضول حاجات سے بے رغبتی اختیار کی تو یہ زہد کا افضل قسم ہے جس کا مرجع یہ ہے کہ انسان اپنے اعضاء سے لذت اندوزی ترک کر دے کہ اعضاء ہی دنیا کے دروازے اور راستے ہیں۔ پس حرام سے منہ موڑنا مسلمانوں کا زہد ہے جس سے ان کے اسلام میں حسن آتا ہے اور مشتبہات میں رغبت نہ رکھنا متّقیوں کا زہد ہے جس سے ان کا ایمان کمال کو پہنچتا ہے اور نفس کے ضروری حاجات کے ماسواء حلال سے کنارہ کش ہونا، حقیقی زاہدوں کا زُہد ہے جس سے ان کا یقین نکھر تا ہے"۔

---

[1] قوت القلوب في معاملة المحبوب ووصف طريق المريد إلى مقام التوحيد،ذكر ماهية الدنيا وكيفية الزهد فيها وتفاوت الزهاد في مقاماتهم ج١ص ٤٤٠.

زہد کے فضائل ومناقب

سورۃ "طٰہٰ" میں ارشادِ خداوندی ہے:

{وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ (١٣١) وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا نَّحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ}.[١]

ترجمہ: "اور تو اپنی نظر ان چیزوں کی طرف نہ دوڑا جو ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو دنیاوی زندگی کی رونق کے سامان دے رکھے ہیں، تاکہ ہم انھیں اس میں آزمائیں اور تیرے رب کا رزق بہتر اور دیرپا ہے، اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور خود بھی اس پر قائم رہ، ہم تجھ سے روزی نہیں مانگتے ہم تجھے روزی دیتے ہیں اور پرہیزگاری کا انجام اچھا ہے"۔

"سننِ ابنِ ماجہ" میں ہے:

خرج زيد بن ثابت من عند مروان بنصف النهار، قلت: ما بعث إليه هذه الساعة إلا لشيء يسأل عنه، فسألته، فقال: سألنا عن أشياء سمعناها من رسول الله – صلى الله عليه وسلم –، سمعت رسول الله – صلى الله عليه وسلم – يقول: "من كانت الدنيا همه فرق الله عليه أمره، وجعل فقره بين عينيه، ولم يأته من الدنيا إلا ما كتب له،

---

[١] سورةطه،رقم الاية: ١٣١، ١٣٢.

ومن كانت الآخرة نيته جمع الله له أمره، وجعل غناه في قلبه، وأتته الدنيا وهي راغمة".[1]

ترجمہ:"حضرت زید بن ثابتؓ مروان کے پاس سے ٹھیک دوپہر کے وقت نکلے میں نے کہا اس وقت جو مروان نے زید بن ثابتؓ کو بلایا تھا تو ضرور کچھ پوچھنے کیلئے بلایا ہو گا میں نے ان سے پوچھا انہوں نے کہا: مروان نے ہم سے چند باتیں پوچھیں جو ہم نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سنی تھیں، میں نے آپ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ: جس شخص کی بڑی فکر دنیا ہو اللہ تعالیٰ اس کے کام بکھیر دے گا اور فقر اس کی مقدر کر دے گا اور دنیا اس کو اتنی ہی ملے گی جتنی اس کی تقدیر میں لکھی ہے اور جس کی نیت اصل آخرت کی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے سب کام درست کر دے گا اور اس کے دل کو غنا سے بھر دے گا اور دنیا ذلیل ہو کر کر اس کے پاس آئے گی"۔

"مستدرکِ حاکم" میں ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " يقول الله عز وجل: ابن آدم تفرغ لعبادتي املأ صدرك غنى، وأسد فقرك وإلا تفعل ملأت صدرك شغلا ولم أسد فقرك.[2]

ترجمہ:"حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ عم نوالہٗ کا فرمان ہے کہ اے آدم کی اولاد! تو میری عبادت کے لیے فارغ ہو جا میں تیرے سینہ کو غنا سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو زائل کر دوں گا، اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو میں تجھے مشاغل میں پھانس دوں گا اور تیرا فقر زائل نہیں کروں گا"۔

---

[1] سنن ابن ماجه ت الأرنؤوط: باب الهم بالدنيا، ج٥ص ٢٢٧.

[2] المستدرك على الصحيحين للحاكم ،رقم الحديث: ٣٦٥٧ ج٢ص ٤٨١.

فوائد وثمرات

۱: زہد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق استوار ہو جاتا ہے جو آخرت سے قطع نظر کر کے خود دنیا میں بھی بڑے فائدے اور مزے کی چیز ہے۔

۲: قناعت کی دولت نصیب ہو جاتی ہے۔ ذہنی انتشار اور پریشانیوں کا لاوا کم ہونے لگتا ہے۔ یہ معقول و مجرب بھی ہے اور منصوص بھی۔ عقل و تجربہ تو ظاہر ہے کہ جب دل میں کسی چیز کے ساتھ لگاؤ ختم ہو جاتا ہے تو اس سے عملی وابستگی بھی ڈھیلی پڑ جاتی ہے، پریشانیوں کی بڑی وجہ ضرورت سے زیادہ دوڑ دھوپ ہے جب نہ اس کی اہمیت رہی اور نہ عملی شغل، تو پریشانیوں کی بڑی بنیاد ہی منہدم ہو گئی۔ تجربہ کا ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے۔ جہاں تک منصوص ہونے کی بات ہے تو "سنن ابن ماجہ" کی روایت ہے:

زيد بن ثابت من عند مروان بنصف النهار، قلت: ما بعث إليه هذه الساعة إلا لشيء يسأل عنه، فسألته، فقال: سألنا عن أشياء سمعناها من رسول الله – صلى الله عليه وسلم –، سمعت رسول الله – صلى الله عليه وسلم – يقول: "من كانت الدنيا همه فرق الله عليه أمره، وجعل فقره بين عينيه، ولم يأته من الدنيا إلا ما كتب له،

ومن كانت الآخرة نيته جمع الله له أمره، وجعل غناه في قلبه، وأتته الدنيا وهي راغمة".[١]

ترجمہ: "حضرت زید بن ثابتؓ مروان کے پاس سے ٹھیک دوپہر کے وقت نکلے میں نے کہا اس وقت جو مروان نے زید بن ثابت کو بلا بھیجا تو ضرور کچھ پوچھنے کیلئے بلایا ہو گا میں نے ان سے پوچھا انہوں نے کہا مروان نے ہم سے چند باتیں پوچھیں جن کو ہم نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا میں نے آپ سے سنا آپ فرماتے تھے جس شخص کو بڑی فکر دنیا کی ہی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے کام پریشان کر دے گا اور اس کی مفلسی دونوں آنکھوں کے درمیان کر دے گا اور دنیا اس کو اتنی ہی ملے گی جتنی اس کی تقدیر میں لکھی ہے اور جس کی نیت اصل آخرت کی طرف ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے سب کام درست کر دے گا اس کے پھیلاؤ کو اس کی دلجمعی کیلئے اور اس کے دل میں بے پرواہی ڈال دے گا اور دنیا جھک مار کر اس کے پاس آئے گی"۔

۳: اس کے ذریعے لوگوں کی نظر میں محبوبیت پیدا ہوتی ہے کیونکہ نفرت وحسد کا بلا سبب دنیوی نعمتوں میں تفوق کا احساس یا اس کا خدشہ ہے، اسی خطرے سے عام طور پر حسد ونفرت کے جذبات جنم لیتے ہیں اور جب کسی کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ اس سے مجھے فائدے ملنے کی توقع تو ہے لیکن نقصان کوئی نہیں پہنچتا تو اس سے عام طور پر حسد نہیں کیا جاتا۔ ایک روایت میں بھی یہ نکتہ بیان فرمایا گیا ہے، چنانچہ "مستدرک حاکم" کی روایت ہے:

---

[١] سنن ابن ماجه ت الأرنؤوط: باب الهم بالدنيا، ج٥ص ٢٢٧.

عن سهل بن سعد، رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم وعظ رجلا فقال: «ازهد في الدنيا يحبك الله عز وجل وازهد فيما في أيدي الناس يحبك الناس».[1]

ترجمہ:"حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: دنیا سے زہد اختیار کرو(یعنی دنیا کی محبت میں گرفتار نہ ہو، اس کی فضولیات سے اعراض کرو اور امور آخرت کی طرف متوجہ رہو) اگر تم ایسا کروگے تو گویا تم اس چیز سے نفرت کرنے والے ہوں گے جس سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے اور اس کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ تم سے محبت رکھے گا اور اس چیز کی طرف رغبت نہ کرو جو لوگوں کے پاس ہے(یعنی جاہ ودولت) لوگ تم سے محبت کریں گے"۔

حصول زہد کا طریقہ

بہت سے نیک اخلاق واعمال کی طرح زہد بھی ایک خلافِ طبیعت صفت ہے، مادیت کے اس دور میں اب رفتہ رفتہ اس کو خلاف طبیعت ہی نہیں بلکہ خلاف عقل وعزت بھی تصور کیا جانے لگا ہے اور ایسے کام غیر معمولی جد وجہد ہی سے حاصل کئے جاسکتے ہیں، لہٰذا تکلف ومجاہدے سے ہی یہ صفت عادت کا جز بن سکتی ہے اور محض ایک آدھ بار کرنے سے عادت وصفت کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی بلکہ لگاتار اور تسلسل کے ساتھ تکلف کرتے رہنے کی ضرورت ہے، کسی بھی اچھی

---

[1] المستدرك على الصحيحين للحاكم: كتاب الرقاق رقم الحديث٧٨٧٣ ،ج٤ص ٣٤٨.

صفت کو حاصل کرنے کا یہ مناسب عملی طریقہ ہے کہ تکلف کے ساتھ اس پر کار بند رہا جائے، صوفیاء کرام کا مقولہ ہے کہ "بداية الزهد التزهّد"۔

البتہ اس مجاہدے کو آسان بنانے کے لئے نظریاتی طور پر آخرت کی افادیت، وہاں کی بیش بہا نعمتیں، دنیا کی مذمت میں وارد ہونے والے نصوص اور زہد کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فضائل وفوائد کا استحضار نہایت مفید بلکہ اصل واساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر نظریاتی طور پر ان چیزوں کا بار بار استحضار کیا جاتا رہے اور ذہن طبیعت میں یہ چیزیں راسخ ہو جائیں تو اس کے بعد زہد اختیار کرنے کے لئے مزید کسی تکلف ومجاہدے کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ زہد چھوڑنے اور خلاف زہد کام کرنے کے لئے مجاہدات کی ضرورت متحقق ہو گی۔

صبر

صبر، نفس روکنے اور ضبط کرنے کو کہا جاتا ہے۔ عام طور پر مشہور تو یہ ہے کہ مصیبت کے وقت نفس کو جزع فزع اور گلے شکوں سے بچائے رکھنا صبر ہے، چنانچہ علامہ سید شریف جرجانی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

الصبر: هو ترك الشكوى من ألم البلوى لغير الله لا إلى الله.[1]

ترجمہ: "مصیبت میں غیر اللہ کے سامنے شکایتیں چھوڑنا صبر ہے نہ کہ اللہ تعالی کے سامنے"۔

---

[1] التعريفات، ص: ١٣١.

لیکن حقیقت یہ ہے کہ صبر کچھ اسی میں منحصر نہیں بلکہ اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ عام ہے، چنانچہ غمی وپریشانی کے وقت جس طرح صبر ہوتا ہے یوں ہی خوشی اور نعمت کے وقت بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے گو دونوں جگہ صبر کی صورت مختلف ہو۔ اس لئے صبر کی جامع تعریف وہی ہونی چاہئے جو امام غزالی رحمہ اللہ اور بعض دیگر محققین نے فرمائی ہیں، امام غزالی رحمہ اللہ کی عبارت یہ ہے:

حقيقة الصّبر ثُبات باعث الدّين في مقابلة باعث الهوىٰ.[1]

ترجمہ: "صبر کی حقیقت یہ ہے کہ خواہشات کے جزبات کے سامنے دین کا جزبہ ڈٹ جائے"۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ کسی بھی موقع پر نفس وخواہش کے تقاضا پر دینی تقاضا کو ترجیح دینا صبر کہلاتا ہے۔ اب غمی کے موقع پر نفس گلے شکوے پر اترنا چاہتا ہے اور دین تحمل وبردباری اور رضا بالقضاء کا درس دیتا ہے تو اس موقع پر تحمل سے کام لینے کو صبر کہا جائے گا، اسی طرح کوئی نعمت وخوشی میسر ہوئی تو اس موقع پر نفس عجب وکبر اور فخر ومباہات کی روایات قائم کرنا چاہتا ہے اور دین اظہار نعمت کے طور پر خوشی کی اجازت اور شکر وتواضع کا درس دیتا ہے لہٰذا ایسی صورت حال میں تواضع کا دامن تھامے رکھنا اور نفس کو عجب وفخر وغیرہ ناجائز جذبات سے بچاتے رہنا صبر ہے۔

---

[1] الأربعين في أصول الدّين، الأصل الرّابع، ص٢٤٩.

فضائل

سورۃ "الانفال" میں ہے:

{وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ}.[١]

ترجمہ: "اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

سورۃ "الزمر" کی آیت ہے:

{إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ}.[٢]

ترجمہ: "بیشک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا"۔

"مستدرکِ حاکم" میں ہے:

عن أبي ظبيان، قال: كنا نعرض المصاحف عند علقمة فقرأ هذه الآية: «إن في ذلك لآيات للموقنين» فقال: قال عبد الله: اليقين الإيمان كله وقرأ هذه الآية: {إن في ذلك لآيات لكل صبار شكور} قال: فقال عبد الله: «الصبر نصف الإيمان» هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه".[٣]

---

١ سورةالأنفال،رقم الاية: ٤٦.

٢ سورةالزمر،رقم الاية: ١٠.

٣ المستدرك على الصحيحين للحاكم:رقم الحديث: ٣٦٦٦،ج٢ص ٤٨٤.

ترجمہ: "ابو ظبیان سے مروی ہے کہ ہم حضرت علقمہؓ کے سامنے اپنے قرآنی نسخے پیش کیا کرتے تھے، آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی«إن في ذلك لآيات للموقنين» اور فرمایا کہ حضرت عبد اللہ نے فرمایا: یقین پورا ایمان ہے اور یہ آیت تلاوت فرمائی{إن في ذلك لآيات لكل صبار شكور} حضرت علقمہؓ فرماتے ہیں کہ پھر حضرت عبد اللہ نے فرمایا«الصبر نصف الإيمان» کہ صبر نصف ایمان ہے"۔

"الترغیب فی فضائل الأعمال" میں ہے:

عن أبي وائل، عن عبد الله، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «الصبر نصف الإيمان، واليقين الإيمان كله».[1]

ترجمہ: "حضرت عبد اللہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صبر آدھا ایمان ہے اور یقین پورا ایمان ہے"۔

صبر کا مادہ پیدا کرنے کا طریقہ کار

خوشی کے موقع پر نافرمانی اور بے صبری کا مظاہرہ کرنا تو بڑے ہی نمک حرامی اور بد اخلاقی کی بات ہے کہ اللہ تو استحقاق کے بغیر بلکہ جرم وغفلت کی ہزاروں واردات کے باوجود خوشی ونعمت دے رہا ہے اور بندہ اسی عین خوشی کے وقت بھی اس کو ناراض کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ جہاں تک غمی کے موقع پر صبر کا تعلق ہے تو اس کے متعلق اتنی بات کا یقین کر لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نہ ظالم ہے، نہ

---

[1] الترغيب في فضائل الأعمال وثواب ذلك لابن شاهين :كتاب الصبر وما فيه من الفضل،ص: ٨٨.

کسی مسلمان سے بلا وجہ دشمنی کرنا چاہتا ہے اور نہ کوئی چیز اس کی علم اور قدرت سے باہر ہو سکتی ہے۔ ان تینوں باتوں کے باوجود جب وہ کسی مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو اس میں ضرور کوئی حکمت وخیر خواہی کا پہلو موجود ہوگا، لہٰذا پریشان ہونے اور اللہ تعالیٰ کے حدود وبندگی سے نکلنے کی بجائے مزید عبودیت اور اچھی طرح استقامت کا مظاہرہ کرلینا ضروری ہے۔ قرآن کریم کے اندر بڑے ہی معنیٰ خیز اسلوب میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

{ قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (٥١) قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ }.[١]

ترجمہ: "کہہ دو ہمیں ہر گز نہ پہنچے گا مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا وہی ہمارا کارساز ہے اور اللہ ہی پر چاہیئے کہ مومن بھروسہ کریں، کہہ دو تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ایک کے منتظر ہو اور ہم تمہارے حق میں اس بات کے منتظر ہیں، کہ اللہ اپنے ہاں سے تم پر کوئی عذاب نازل کرے، یا ہمارے ہاتھوں سے تم بھی انتظار کرو، ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے ہیں"۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کا مصیبت میں مبتلا ہونا اس لئے نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ظلم کررہا ہے یا اس سے انتقام لینا چاہتا ہے، بلکہ اس میں مسلمان کا بڑا فائدہ مضمر ہوتا ہے کہ کبھی تو صبر کرکے درجات میں ترقی کا باعث بن جاتا ہے اور کبھی اپنے بعض اعمالِ بد کا بدلہ دنیا میں چکھا دیا جاتا ہے تاکہ آخرت میں جاتے وقت بالکل صاف ستھرا ہو کر جائے۔

---

[١] سورة التوبة، رقم الاية: ٥١، ٥٢.

ایک شخص کو کچھ تکلیف پہنچی اور دربار نبوت میں حاضر ہوا، نبی اکرم ﷺ نے اس کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ:

" أَنْتَ عَبْدٌ أَرَادَ اللهُ بِكَ خَيْرًا. إِذَا أَرَادَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ بِعَبْدٍ خَيْرًا عَجَّلَ لَهُ عُقُوبَةَ ذَنْبِهِ، وَإِذَا أَرَادَ بِعَبْدٍ شَرًّا أَمْسَكَ عَلَيْهِ بِذَنْبِهِ حَتَّىٰ يُوَافِيَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَأَنَّهُ عَيْرٌ".[1]

ترجمہ: "آپ ایسے آدمی ہے کہ اللہ نے تمہارے ساتھ خیر کا ارادہ فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے گناہ کی سزا فوراً دے دیتا ہے اور جب کسی بندے کے ساتھ شر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے گناہ کو روک لیتا ہے یہاں تک کہ جب قیامت کے دن اس کے ساتھ حساب کرے گا تو اس کے گناہ (کثرت کی وجہ سے) گدھوں کی طرح محسوس ہوں گے"۔

صبر کے لحاظ سے لوگوں کے چار درجات

صبر کے لحاظ سے لوگوں کے درجات و مراتب مختلف ہیں:

۱: بعض لوگ تو ایسے کم نصیب ہوتے ہیں جن میں یہ مادہ ہی نہیں ہوتا۔ ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو جی میں آتا ہے کر گزرتے ہیں، شریعت کی لگام ان کو کسی کام سے روکنے کے لئے کافی ثابت نہیں ہوتی۔

۲: بعض لوگوں میں کسی حد تک یہ تو مادہ موجود ہوتا ہے لیکن بہت کمزور، چنانچہ نفس کے حملہ کرتے وقت یا شہوانی طوفان کے وقت عموماً یہ بند ٹوٹ جاتا ہے اور بے صبری کا مظاہرہ ہو ہی جاتا ہے۔

---

[1] مسند أحمد ط الرسالة: رقم الحديث: ١٦٨٠٦، ج٢٧ص ٣٦٠.

۳: کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں یہ مادہ کافی حد تک موجود ہوتا ہے، نفس کی چاہت اور خواہشات کے دباؤ کے وقت کبھی صبر کی صفت غالب آجاتی ہے اور کبھی نفس کی مرضی کو ترجیح مل جاتی ہے۔

۴: بعض خوش نصیب افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں یہ مادہ اس سے بھی زیادہ راسخ اور مستحکم ہوتا ہے، چنانچہ وہ بے صبری کے تقاضوں اور نفس کی خلاف شریعت چاہتوں کے وقت اکثر صبر وہمت ہی کا دامن پکڑے رہتے ہیں اور عموماً بے صبری کا مظاہرہ کرکے گناہ ومعصیت کے شکار نہیں ہوتے۔ بعض اوقات بے صبری کا شکار ہو جانا اور گناہ کا ارتکاب ہو جانا بعید نہیں ہے لیکن احساس کے فوراً بعد سخت نادم وپشیمان ہو جاتے ہیں۔

ان چار درجات میں سے ہر اوپر والا درجہ نچلے درجے سے بہتر ہے لیکن اس میں قابل تقلید درجہ یہی آخری اور چوتھا درجہ ہے۔

کوئی شخص صبر کے حوالہ سے اپنا درجہ ومقام معلوم کرنا چاہے تو روزمرہ امور کا محاسبہ کرکے اندازہ کر سکتا ہے کہ خوشی اور غمی کے کتنے مواقع میں صبر کا مظاہرہ کیا اور کتنی جگہوں پر بے صبری کا شکار ہو کر گناہ کا ارتکاب ہوا!

صبر کے تین اجزاء

صبر کے تین اجزاء ہیں:

الف: پہلا جز دل ہے۔ خوشی کے موقع پر دل میں یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ میں نعمت کا مستحق ہوں، فخر وکبر سے دور رہا جائے اور نماز وغیرہ کسی ضروری حکم میں کوتاہی نہ لائی جائے بلکہ اس کو محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی نعمت خیال

کرے، احسان مندی کے جذبے کے ساتھ دل میں اس کی تعظیم بٹھائی جائے۔ اسی طرح غمی و مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ سے شکایت اور نفرت کا جذبہ نہ رکھا جائے، اپنے ظاہری اعمال کے بل بوتے اپنے آپ کو اس بات سے بالاتر نہ سمجھا جائے کہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ اسی کو "رضا بالقضاء" کہا جاتا ہے کہ دل سے اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر ہر طرح اطمینان رکھا جائے۔

ب: خوشی کے وقت استحقاق ورفعت کا دعویٰ نہ ہو اور غمی کے وقت شکایت ونفرت یا اپنی معصومیت ونیک کاری کا اظہار نہ ہو[1]۔

"سنن بیہقی" کی روایت ہے:

عن أبیٰ هريرةَ قال: قال رسولُ اللهِّ -صلىٰ الله عليه وسلم-: "قال اللهُّ تَبارَكَ وتَعالَىٰ: إذا ابتَلَيتُ عبدِیَ المُؤمِنَ فلَم يَشكُنِی إلىٰ عُوّادِهِ

---

[1] البتہ ہر شکایت صبر کے منافی نہیں ہے بلکہ وہ شکایت جو مخلوق سے ہو اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے برہمی، ناراضگی یا اس سے کچھ تنفر کے خیال سے ہو۔ اگر خود اللہ تعالیٰ سے اپنی کمزوری اور مشقت کا ذکر کیا جائے یا مخلوق سے کسی جائز غرض کے لئے ایسا کچھ عرض کردیا جائے تو یہ منافی صبر نہیں ہے، چنانچہ قرآن کریم میں سیدنا حضرت یعقوب علیہ الصلاۃ والسلام اور حضرت ایوب علیہ الصلاۃ والسلام کی دعائیں مذکور ہیں جن میں انہوں نے ظاہری شکایت کے انداز میں اپنی بعض تکالیف کا ذکر کیا ہے، اسی طرح بعض سلف سے منقول ہے کہ انہوں نے عیادت کرنے والے بعض لوگوں کو بھی اپنی مرض وتکلیف کا ذکر کیا۔

أطلَقتُه مِن إســارِي، ثمَّ أبدَلتُه لحمًا خيرًا مِن لحمِه ودمًا خيرًا مِن دَمِه، ثُمَّ يَستأنِفُ العَمَلَ ".[١]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میں اپنے مؤمن بندے کو آزمائش میں ڈالتا ہوں اور وہ اپنے عیادت کرنے والوں سے شکایت نہیں کرتا تو میں اس کو جہنم کی قید سے آزاد کرتا ہو پھر اس کے گوشت کو بہتر گوشت میں بدل دیتا ہوں اور اس کے خون کو بہتر خون میں بدل دیتا ہوں پھر وہ نئے سرے سے نیک عمل شروع کرتا ہے"۔

ج: خوشی یا غمی، کسی بھی موقع پر شریعت کے ضروری احکام میں کوتاہی نہ برتی جائے ، اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو چھوڑنے یا غافل رہنے سے دامن کو بچاکے رکھا جائے۔

صبر کا شرعی حکم

الف: صبر کا ایسا درجہ جس کی خلاف ورزی کرنا گناہ ومعصیت ہو، ضروری ہے اوراس کو چھوڑنا ممنوع ہے، چاہے غمی کے موقع پر ہو یا خوشی وفرحت کی جگہ پر ہو۔ مثال کے طور پر کوئی بیماری یا مصیبت آپڑی تو زبان سے اللہ تعالیٰ کی شکایت شروع کردی، یا دل میں اپنے عافیت کے استحقاق کا تصور جمایا، یا دیگر اعضاء وجوارح

---

[١] السنن الكبرى للبيهقي ت التركي :بابُ ما يَنبَغِي لِكُلِّ مُسلِمٍ أن يستَشعِرَه مِنَ الصَّبرِ على جَميعِ ما يُصيبُه مِنَ الأمراضِ والأوجاعِ والأحزانِ؛ لِما فيها مِنَ الكَفاراتِ والدَّرَجاتِ،رقم الحديث: ٦٦٢٢ -ج٧ص ١٦٤.

سے کسی گناہ کا ارتکاب کیا۔ خوشی وشادی کے موقع پر شرعی جواز کے حدود کو پامال کر دیا اور خوشی کے ایسے طریقوں کا

ارتکاب کرڈالا جو شرعاً جائز نہ تھیں، یا خوشی منانے میں اس قدر مصروفیت رہی کہ نماز وغیرہ شرعی واجبات کی ادائیگی کی بھی نوبت نہیں مل سکی۔

ب: جس صبر کی خلاف ورزی کرنا گناہ نہ ہو بلکہ خلاف مستحب یا صرف خلاف عزیمت ہو تو ایسا صبر بھی فقہی لحاظ سے لازم نہیں ہے، البتہ بلند تر اخلاق اور ایک محبوب صفت وعادت ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے، اس کو تھامے رکھنا ہی اچھا ہے۔ مثال کے طور پر زید نے ناحق خالد کو مارا تو اب خالد کو یہ حق حاصل ہے کہ زید کو اسی قدر مارے جس قدر اس نے ظلماً مارا تھا اور یہ حق اگر خالد وصول کرنا چاہے تو گناہ نہیں ہے، البتہ زیادہ اچھی بات یہی ہے کہ اس سے بھی درگزر کر جائے جبکہ یہ درگزر کرنا مزید کسی دینی مفسدے کا ذریعہ نہ ہو۔ قرآن کریم میں ہے:

{وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (٤٠) وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ (٤١) إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (٤٢) وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ}.[١]

ترجمہ: "اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پس جس نے معاف کر دیا اور صلح کر لی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، بیشک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور جو کوئی ظلم اٹھانے

---

[١] سورةالشورى،رقم الاية: ٤٠ — ٤٣.

کے بعد بدلہ لے تو ان پر کوئی الزام نہیں، الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق سرکشی کرتے ہیں، یہی ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے اور البتہ جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا بیشک یہ بڑی ہمت کا کام ہے"۔

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسّلام اور دیگر صالحین لوگوں کا یہی امتیازی وصف ہے اور یہی وصف جب دل میں رسوخ حاصل کرے تو بڑی فضیلت وسعادت کا ذریعہ ہے۔

شکر کا مفہوم وتعارف

کسی کے نعمت واحسان کا اعتراف کر کے اس کی تعظیم کرنے کو شکر کہا جاتا ہے۔ نیک صفات واخلاق میں سے اس کو بھی ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ سید شریف جرجانی صاحب فرماتے ہیں:

الشكر اللغوي: هو الوصف بالجميل على جهة التعظيم والتبجيل على النعمة من اللسان والجنان والأركان.[۱]

ترجمہ: "لغت میں شکر یہ ہے کہ دل، زبان اور اعضاء سے کسی نعمت پر قدر وتعظیم کے ساتھ اس کی خوبی بیان کی جائے"۔

قاضی محمد بن علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ اس بات کو نقل کرنے کے بعد مزید تحریر فرماتے ہیں:

والشكر عرفا صرف العبد جميع ما أنعم الله عليه من السّمع والبصر وغيرهما إلى ما خلق له وأعطاه لأجله، كصرفه النّظر إلى مطالعة

---

[۱] التعريفات: ص ۱۲۸.

مصـنوعاته والسّـمع إلىٰ ما تلقى ما ينبئ عن مرضـياته والاجتناب عن منهياته.[١]

ترجمہ:"عرف میں شکر یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالی کی دی ہوئی سماعت اور بصارت وغیرہ جیسی تمام نعمتوں کو ان مواقع میں صرف کرے جن کے لئے ان کی تخلیق کی گئی اور جس وجہ سے وہ عطا کی گئیں، جیسے نظر کو اللہ تعالی کی پیدا کردہ عجائبات کے مطالعہ میں صرف کرنا اور سماعت کو ان باتوں کو سننے میں صرف کرنا جو اللہ تعالی کی مرضیات کے کرنے اور ممنوعات سے بچنے کی طرف رہنمائی کرے"۔

فضائل

سورۃ "النساء" میں ہے:

{مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا}.[٢]

ترجمہ:"اے منافقو) اللہ تمہیں سزادے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گزار بنو اور ایمان لے آؤ اور اللہ قدردان جاننے والا ہے"۔

سورۃ "ابراہیم" میں ہے:

{وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (٧) وَقَالَ مُوسَىٰ إِنْ تَكْفُرُوا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ}.[٣]

---

[١] كشاف اصطلاحات الفنون والعلوم: ج١ص ١٠٣٨.

[٢] سورةالنساء،رقم الاية: ١٤٧.

[٣] سورةإبراهيم،رقم الاية: ٧، ٨.

ترجمہ: "اور جب تمہارے رب نے سنا دیا تھا کہ البتہ اگر تم شکر گزاری کروگے تو اور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بھی سخت ہے۔
اور موسیٰ نے کہا اگر تم اور جو لوگ زمین میں ہیں سارے کفر کروگے، تو اللہ بے پروا تعریف کیا ہوا ہے"۔

"سننِ ابنِ ماجہ" میں ہے:

عن أبي هريرة، عن النبي - صلى الله عليه وسلم -، أنه قال: "الطاعم الشاكر بمنزلة الصائم الصابر".[1]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کھانا کھا کر شکر کرنے والا روزہ رکھ کر صبر کرنے والے کے برابر ہے"۔

فوائد و ثمرات

الف: شکر ایک نیکی، عبادت اور ساتھ انسانیت کا تقاضا ہے، شکر کے ساتھ ان تمام نصوص پر عمل کرنے کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے جو اس کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں اور ساتھ انسان ہونے کا تقاضا بھی پورا ہوتا ہے کیونکہ محسن کے احسان کا اعتراف کرنا اور اس کی تعظیم واحترام کرنا انسانیت اور خود عقل وشعور کا تقاضا ہے۔

ب: شکر گزاری کے نتیجے میں نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، قرآن کریم میں بڑی تاکید کے ساتھ اعلان فرمایا گیا ہے کہ:

---

[1] سنن ابن ماجه ت الأرنؤوط: باب فيمن قال: الطاعم الشاكر كالصائم الصابر، ج٢ص٦٤٦.

{ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ}.[١]

ترجمہ: "اور جب تمہارے رب نے سنا دیا تھا کہ البتہ اگر تم شکر گزاری کروگے تو اور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بھی سخت ہے"۔

ج: تمام حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور صالحین کی مشترکہ سنت اور اجتماعی صفت ہے جس کی تابعداری کرنا خیر وفلاح ہی کا موجب ہے۔

د: پابندی کے ساتھ شکر ادا کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عشق ومحبت کی دولت نصیب ہو جاتی ہے اور یہی وہ گوہر بے بدل اور جوہر بیش بہا ہے جو دین پر عمل کرنے کی اصل بنیاد ہے، اسی کو حاصل کرنے کے لئے تمام مجاہدات وریاضات کئے کروئے جاتے ہیں۔

ر: شکر گزاری پر مواظبت کی جائے تو عجب، کبر اور فخر وغیرہ رزائل اور مذموم صفات اپنے آپ ہی دھل جاتے ہیں۔

شکر کے تین اجزاء

امام غزالی رحمہ اللہ اور بعض دیگر محقق صوفیاء کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ شکر کے تین اجزاء وارکان ہیں جن میں سے ایک کا تعلق اعتقاد و نظریے کے ساتھ

[١] سورۃإبراھیم،رقم الایة: ٧.

ہے، دوسرے کا انسانی حال و کیفیت کے ساتھ جبکہ تیسرے کا تعلق ظاہری اعضاء وجوارح کے ساتھ ہے[1]۔

اعتقاد کی حد تک شکر کرنا یہ ہے کہ اصل نعمت دینے والے کو پہچانے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس کو اللہ کا انعام واحسان ہی سمجھے، اپنا استحقاق تصور نہ کرے۔ حال کے ساتھ شکر کرنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت پر خوش ہو جایا جائے لیکن خوشی کی وجہ محض یہ نہیں ہونی چاہئے کہ پسند کی چیز مل گئی یا اس چیز کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کروں گا بلکہ بنیادی وجہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت کا ملنا اس کی خوشی ورضامندی کی علامت ہو سکتی ہے اور نعمت میں ملی چیز کو اللہ تعالیٰ کی طاعت کے کام میں استعمال کر کے مزید تقرب نصیب ہو جائے گی۔ عمل کے ساتھ شکر یہ ہے کہ زبان سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی جائے اور نعمت کی چیز کو اللہ کی طاعت میں استعمال کی جائے یا کم از کم کسی مباح مصرف ہی میں خرچ کر دیا جائے، مثال کے طور آنکھ اور کان اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہیں، اب ان کے شکر کا عملی طریقہ یہ ہے کہ ان دونوں اعضاء کو نیکی کے کاموں میں استعمال کیا جائے یا کم از کم جائز امور میں استعمال کرنے کی پابندی کی جائے، کسی ناجائز کام میں ان کو استعمال نہ کیا جائے۔

---

[1] قرآن وسنت میں جن چیزوں کو شکر قرار دیا گیا ہے اور جن باتوں کو منافی شکر قرار دیا گیا ہے، ان کو اگر جمع کر دیا جائے تو یہی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے جو حضرت امام غزالی رحمہ اللہ وغیرہ کے حوالہ سے متن میں درج کیا گیا ہے۔

شکر کا اصل مرتبہ یہی ہے کہ ان تینوں طریقوں سے شکر بجالائی جائے اور اللہ تعالیٰ کے اصل "شکر گزار بندے" وہی ہیں جو یہ تینوں اجزاء بروئے کار لاتے ہیں، لہٰذا:

الف: اگر کوئی شخص نعمت کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی چیز / فرد کی طرف منسوب کرتا ہے یا اس کو اپنا استحقاق خیال کرتا ہے، تو یہ شکر کے خلاف ہے۔ قرآن کریم میں قارون کے قصہ اور بعض دیگر جگہ اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ نعمت کو اپنا استحقاق سمجھنا خدا ناشناس لوگوں کا عقیدہ ہے۔

ب: اللہ تعالیٰ کی نعمت پر خوشی نہیں کرتا بلکہ اس کی عمومی یا خصوصی نعمتوں پر غمگین ہو جاتا ہے، یہ بھی شاکر نہیں۔

ج: نعمت کی چیز کو خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور شریعت کی خلاف ورزی میں استعمال کرتا ہے، مثال کے طور پر آنکھ کی عظیم دولت کو نامحرم عورتوں کی طرف دیکھنے میں استعمال کرتا ہے تو بھی شکر کے تقاضا کے خلاف ہے بلکہ یہ صرف ایک آنکھ ہی کی ناشکری نہیں ہے، ان تمام نعمتوں کی ناشکری ہے جن کے بغیر دیکھنے کا یہ عمل پورا نہیں ہوتا، چنانچہ آنکھ تب ہی دیکھنے کا کام کرتی ہے جب بدن میں حیات موجود ہو، روشنی ہو، سامنے کی چیز بھی زمین یا فضاء میں موجود ہو، کوئی حائل نہ ہو، عقل وشعور کام کرتا ہے اور وہ سامنے کی چیز کو شہوت کا قابل تصور کرے وغیرہ وغیرہ۔ ایک بد نظری میں اتنی ساری نعمتوں کی ناشکری پائی جاتی ہے اور یہ قضیہ کچھ آنکھ یا دیکھنے کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے بلکہ ہر گناہ کے کام کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس میں اللہ

تعالیٰ کی دسیوں نعمتوں کا استعمال ہوتا ہے اور تبھی جاکر کوئی کام پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔

شکر کا حکم

قرآن وسنت کے متعدد نصوص میں شکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی ضد یعنیٰ ناشکری سے منع کیا گیا ہے، ان دونوں باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ شکر کرنا شرعاً ضروری ہے۔ شکر کو نعمت کے ساتھ جوڑا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وجوب شکر کی بنیاد نعمت خداوندی کا ملنا ہے، جبکہ نعمتوں میں ہر آن تسلسل رہتا ہے۔ اس لئے قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر وقت آدمی شاکر ہی رہے بلکہ شکر کرنے کی توفیق نصیب ہونا خود بھی نعمت وسعادت ہے اس لئے ضابطہ کے مطابق اس پر بھی شکر واجب ہونا چاہئے، لیکن ظاہر ہے کہ انسان انجام کار حق شکر ادا کرنے سے عاجز ہی آئے گا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بندوں پر یہ احسان فرمایا کہ شکر کے مفہوم میں بھی توسیع فرمائی اور مقدار وتعداد میں بھی خوب وسعت دی گئی۔ "سنن ابی داوٗد" کی روایت ہے:

عن أبي ذر، عن النبي – صلَّى الله عليه وسلم – قال: "يُصبِحُ علىٰ كُل سُلامَىٰ من ابن آدم صَدَقة: تسليمُه علىٰ من لقي صدقة، وأمرُه بالمعروف صدقة، ونهيُه عن المنكر صدقة، وإماطتُه الأذىٰ عن

الطريق صدقة، وبُضعةُ أهلِه صدقة، ويجزئ من ذلك كله ركعتان من الضحىٰ".[١]

ترجمہ:"حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: روزانہ ہر صحت مند انسان پر صدقہ لازم ہے، کسی سے ملنے والے سے اس کا سلام کرنا، اچھی بات کی تلقین کرنا، بری بات سے روکنا، راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا اور اپنی بیوی سے جماع کرنا یہ سب صدقہ ہے اور ان سب سے چاشت کی صرف دو رکعتیں پڑھنا بھی کافی ہیں"۔

"صحیح ابن حبان" کی روایت ہے:

عن أبي ذر أن رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم قال: "ليس من نفس بن آدم إلا عليها صدقة في كل يوم طلعت فيه الشمس". قيل: يا رسول الله، ومن أين لنا صدقة نتصدق بها؟ فقال: "إن أبواب الخير لكثيرة: التسبيح، والتحميد، والتكبير، والتهليل، والأمر بالمعروف، والنهي عن المنكر، وتميط الأذىٰ عن الطريق، وتسمع الأصم، وتهدي الأعمىٰ، وتدل المستدل علىٰ حاجته، وتسعىٰ بشدة ساقيك مع اللهفان المستغيث، وتحمل بشدة ذراعيك مع الضعيف، فهذا كله صدقة منك علىٰ نفسك".[٢]

---

[١] سنن أبي داود ت الأرنؤوط: باب صلاة الضحى، ج٢ص٤٦٠.

[٢] صحيح ابن حبان – محققا:فصل ذكر الخصال التي تقوم لمعدم المال مقام الصدقة لباذلها، ج٨ص ١٧١.

ترجمہ: "حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ہر ابنِ آدم پر روز ایک صدقہ لازم ہے۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم کہاں سے صدقہ کریں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: خیر کے بہت سے دروازے ہیں: تسبیح کرنا، حمد کرنا، اللہ اکبر پڑھنا، لا الہ الا اللہ پڑھنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا، راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹانا، گونگے کو سننا، اندھے کی رہنمائی کرنا، محتاج کی اس کی حاجت کی طرف رہنمائی کرنا، مدد طلب کرنے والے بے بس کی بھرپور مدد کرنا اور کمزور کا بوجھ اٹھانا، یہ سب آپ کا اپنی جان کی طرف سے صدقہ ہے"۔

ہر عضو کے بدلے صدقہ کا مفہوم

ان دونوں روایات میں جو ہر عضو یا سانس کے بدلے صدقے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، بظاہر اس سے یہی مراد ہے کہ عضو یا سانس کی نعمت کے بدلے شکر ضروری ہے، متعدد شارحین نے اس کی تصریح بھی فرمائی ہیں، چنانچہ علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فكَأَن معنى الحَدِيث: على كل عظم من عِظَام ابْن آدم صَـدَقَة، لِأَنَّهُ إِذا أصبح الْعُضْو سليما فَيَنْبَغِي أَن يشْكر، وَيكون شكره بِالصَّدَقَةِ، فالتسبيح والتحميد وَمَا ذكره يجْرِي مجْرى الصَّدَقَة عَن الشاكر.[١]

ترجمہ: "حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ: انسان کے بدن میں ہر جوڑ کے بدلے ایک صدقہ لازم ہے جب صبح صحیح وسالم بیدار ہوتا ہے، تو اس کو چاہئے کہ شکر اداء

---

[١] كشف المشكل من حديث الصحيحين: ج١ص ٣٦٨.

کرے، اور اس کا شکر صدقہ سے اداء ہوتا ہے، اللہ تعالی کی حمد وثناء اور ذکر کرنا بندہ کی طرف سے صدقہ کرنے کے قائم مقام ہے"۔

علامہ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إذ ما مِنْ عظم ولا عرق ولا عَصَبٍ إلا وعليه أَثَرُ صنع الله، فيجبُ علىٰ العبدِ الشكرُ علىٰ ذلك لله والحمد له علىٰ خلقه سوياً صحيحاً، وهذا هو المراد بقوله: ((عليه صلاةٌ كلَّ يومٍ)) ؛ لأنَّ الصَّلاة تحتوي علىٰ الحمد والشكر والثناء.[1]

ترجمہ: "کوئی ہڈی، رگ اور کوئی پٹھہ ایسا نہیں جس پر اللہ تعالی کی کاری گری کا اثر نہ ہو، پس بندہ پر اس کا شکر اداء کرنا اور اس کا حمد کرنا واجب ہے کہ اللہ تعالی نے اسے صحیح سالم پیدا فرمایا، یہی مراد ہے آپؐ کے اس ارشاد کا ((علیہ صلاۃٌ کلَّ یومٍ)) اس لئے کہ نماز حمد، ثناء اور شکر پر مشتمل ہوتا ہے"۔

آگے تحریر فرماتے ہیں:

ومعنىٰ الحديث: أنَّ تركيب هذه العظام وسلامتها مِن أعظم نِعَمِ الله علىٰ عبده، فيحتاج كلُّ عظم منها إلىٰ صدقة يتصدق ابنُ آدم عنه، ليكونَ ذلك شكراً لهذه النعمة.[2]

ترجمہ: "حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ: بدن کے جوڑوں کی ترکیب اور اس کی سلامتی اللہ تعالی کے ان عظیم انعامات میں سے ہے جو اس نے اپنے بندوں پر کئے

---

[1] جامع العلوم والحكم الأرنووط،الْحَدِيثُ السَّادِسُ وَالْعِشْرُونَ كُلُّ سُلَامَى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ، ج٢ص٧٣.

[2] جامع العلوم والحكم ت ماهر الفحل،الحديث السادس والعشرون،٢ص ٧٠٦.

ہے لہذا انسان پر ہر جوڑ کے بدلہ میں ایک صدقہ لازم ہے تا کہ وہ اس نعمت کا شکرانہ بن جائے"۔

روایات کا خلاصہ

ان روایات کا حاصل یہ ہوا کہ:

۱: اعضاء و جوارح کا صحیح سالم رہنا اور سانس ملنے کی توفیق ہونا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہیں جس پر خدا تعالیٰ کا شکر کرنا واجب ہے۔ اسی سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ روایات میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی حیثیت مثال اور نمونہ کی ہے اور مقصود یہی ہے کہ ہر نعمت کا شکریہ واجب ہونا چاہئے۔

۲: لیکن اس واجبی شکر کی ادائیگی کے لئے کوئی مخصوص صورت متعین نہیں ہے بلکہ کوئی بھی عبادت یا نیکی کا کام ہو، وہ شکر شمار ہوتا ہے۔

۳: خیر و بھلائی کے ہر کام سے شکر کی ادائیگی کی جا سکتی ہے، اگر کسی کے بس میں یہ بھی نہ ہو تو کم از کم یہ کرلے کہ لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھے، اس سے بھی شکر ادا ہو سکتا ہے۔

شکر کی واجب اور نفل قسمیں

اس تفصیل کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شریعت نے جن امور کے کرنے یا چھوڑنے کو ضروری قرار دیا ہے، ان پر عمل کرنا ضروری ہے اور یہ واجب شکر کی ادائیگی کی صورت ہے، اس کے علاوہ جن امور کے کرنے یا چھوڑنے کو محض بہتر قرار دیا ہے، حکم شرعی پر عمل کرنے کے

جذبے سے اس کو انجام دینا یہ نفل شکر کی ادائیگی کی صورت ہے جس کی صورتیں مختلف اور مراتب متعدد ہیں۔[1]

اخلاص

"خلوص" کسی چیز کو کھسوٹ وملاوٹ سے صاف کرنے کا نام ہے، اسی سے "اخلاص" کا لفظ نکلتا ہے، اب اصل معنٰی کے لحاظ سے اخلاص

کسی بھی چیز کے خالص کرنے کو کہا جاتا ہے لیکن شریعت نے اس کو اس بات کے ساتھ مخصوص فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور قربت حاصل کرنے کی نیت کو دیگر نیتوں سے پاک وممتاز رکھا جائے کہ نیکی کے کام کرنے سے یہی اصل مقصود ہو۔ علامہ ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ اس کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الإخلاص إفراد الحق سبحانه فِي الطاعة بالقصد وَهُوَ أَن يريد بطاعته التقرب إِلَى اللَّهِ سبحانه دُونَ شَيْء آخر من تصنع لمخلوق أَوِ اكتساب محمدة عِنْدَ النَّاس أَوْ محبة مدح من الخلق أَوْ معنىً من المعاني سِوَى التقرب بِهِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى ويصح أَن يقال الإخلاص تصفية الفعل عَن ملاحظة المخلوقين ويصح أَن يقال الإخلاص التوقي عَن ملاحظة الأشخاص.[2]

---

[1] وراجع أيضا : جامع العلوم والحكم ت ماهر الفحل،الحديث السادس والعشرون،٢ص ٧١٨.

[2] الرسالة القشيرية،بَاب الإخلاص،ج٢ص٣٥٩.وراجع أيضا إحياء علوم الدين،بيان حقيقة الإخلاص،ج٤ص٣٧٩.

ترجمہ: "اخلاص کہتے ہیں کسی بھی نیک کام میں ایک ذاتِ حق کو مقصود بنانے کو کہ نیکی کے کام سے مطلوب محض اللہ تعالی کا قرب ہو، نہ کہ لوگوں کے سامنے بناوٹ یا لوگوں میں مقبولیت یا یہ کہ لوگ میری تعریف کریں یا کوئی اور بات جو قربِ خداوندی کے علاوہ ہو، یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اخلاص فعل کو مخلوق کی نظر سے یکسر پاک کرنے کو کہتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ اخلاص لوگوں کی نظر سے مکمل بچاؤ کا نام ہے"

امام عز الدین بن عبد السّلام رحمہ اللہ اخلاص وریاء کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الْإِخْلَاص أَن يُرِيد الله بِطَاعَتِهِ وَلَا يُرِيد بِهِ سواهُ... وَأما الرِّيَاء فَهُوَ أَن يُرِيد النَّاس بِطَاعَة الله تَعَالَى وعبادته.[1]

ترجمہ: "اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالی کی اطاعت سے اللہ کے سوا کسی اور کا ارادہ نہ ہو۔۔۔اور ریاء یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اور اطاعت سے لوگوں کا ارادہ ہو"۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اخلاص یہ ہے کہ اللہ کی طاعت کے کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی قربت ہی کو مقصود رکھا جائے، اس کے علاوہ کوئی دنیوی مفاد مطلوب نہ رہے۔

اخلاص کے دو ارکان

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ اخلاص کے دو ضروری ارکان ہیں جن میں سے اگر ایک رکن بھی موجود نہ ہو تو اخلاص مفقود ہو جاتا ہے۔

---

[1] مقاصد الرعاية لحقوق الله عز وجل،فصل فِي بَيَان الْإِخْلَاص والرياء،ص: ٥٤.

اخلاص کا پہلا رکن

الف: نیت کا ہونا۔ اگر کسی عمل میں کوئی نیت نہ ہو تو اخلاص بھی نہیں ہو گا، کیونکہ اخلاص نیت کے صاف رکھنے کو کہا جاتا ہے اور یہ تبھی تصور ہو سکتا ہے جب اصل نیت تو موجود ہو۔ مشہور حدیث ہے کہ:

«إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ما هاجر إليه».[1]

ترجمہ: "أعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر انسان کو وہی ملے گا جو اس نے نیت کی ہو، پس جس کی دوڑ دنیا کے لئے ہو کہ وہ اسے پالے گا یا کسی عورت کے لئے ہو کہ اس سے نکاح کر لے گا، پس اسی چیز کی طرف اس کی ہجرت شمار ہو گی جس چیز کی اس نے نیت کی ہو"۔

نیت کا مفہوم

نیت در اصل اس قصد وارادے کو کہا جاتا ہے جو کسی کام کے کرنے کا باعث بن جاتا ہے، اخلاص کا تعلق اسی قصد وارادے کے ساتھ ہے۔ لہٰذا اگر کسی عبادت کا اصل باعث کوئی دنیوی جذبہ ہو تو اگرچہ زبان سے اخلاص کا لفظ استعمال کیا جائے، وہ اخلاص شمار نہیں ہو گا، یوں ہی اگر یہ باعث کوئی دینی مقصد ہو تو اگرچہ زبانی طور پر کچھ نہ کہا جائے تو بھی اخلاص متحقق ہو گا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اس معنیٰ میں نیت کی نوعیت عام طور پر غیر اختیاری ہوتی ہے، لہٰذا اس میں اخلاص پیدا کرنے کا

---

[1] صحيح البخاري،باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم؟، ج١ص ٦.

طریقہ یہی ہے کہ محض جذبہ پیدا ہوتے ہی کوئی کام نہ کیا جائے بلکہ اس کے بعد فکر و تامل کی جائے اور نئے سرے سے نیت کی تصحیح کر کے اس کو سیدھا رکھا جائے۔

اخلاص کا دوسرا رکن

ب: نیت کا خالص ہونا۔ خالص ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء اور اس کی قرب حاصل کرنے کے علاوہ دیگر تمام نیتوں کو ختم کیا جائے اور اسی چیز کو مقصود و مطلوب کا درجہ دیدیا جائے۔ یعنیٰ دنیوی چیزوں کو پیش نظر نہ رکھا جائے کہ اس کام کے کرنے سے میری عزت و دبدبہ اور جاہ و منزل میں اضافہ ہو گا، لوگ میری تعریف و منقبت بیان کریں گے، مجھے کوئی مال مفاد حاصل ہو گا، اچھے / بڑے / مشہور لوگوں کی فہرست میں میرا نام شمار ہو گا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری چیزیں اخلاص کے منافی ہیں جن سے نیت کو خالص رکھنا ضروری ہے۔ البتہ اخروی فائدوں یا دینی مقاصد کو پیش نظر رکھنا اخلاص کے منافی نہیں ہے چنانچہ عذاب قبر، یا حشر و نشر کی سختیوں سے نجات، جنت میں زیادہ سے زیادہ درجات حاصل کرنے کی نیت ہو یا دینی احکام پر عمل کرنے کا جذبہ ہو، ان جیسی چیزوں کے پیش نظر کوئی کام کرنا اخلاص کے منافی نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عزیمت واخلاص کا کمال یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمام چیزوں سے یکسو ہو کر صرف اسی کی رضاء و قرب کو مقصود و مطلوب کا درجہ دیدیا جائے۔

اخلاص کی اہمیت

ا: جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اعمال و عبادات فرض ہیں یوں ہی اخلاص بھی فرض ہے۔

۲: اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی عمل کی قبولیت کے لئے اخلاص ضروری ہے، اس کے بغیر عمل قبول نہیں ہوتا۔

۳: اعمال وعبادات کی تاثیر اسی اخلاص پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر نماز وجہاد دو بڑے اور عظیم عبادات ہیں، نصوص میں اس کے متعدد فوائد وثمرات ذکر کئے گئے ہیں، نماز کے بارے میں خود قرآن کریم میں تاکید کے ساتھ یہ صراحت فرمائی گئی ہے کہ یہ فحاشی اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے، یہ تاثیر تب حاصل ہوگی جب نماز میں دیگر ضروری باتوں کے ساتھ اخلاص کا بھرپور لحاظ رکھا جائے۔ اس لئے عارفین فرماتے ہیں کہ اخلاص کے بغیر عمل کی حیثیت جسمِ بے جان اور دل بے حرکت کی ہوتی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عطاء اللہ اسکندری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الأعمال صُور قائمة وأرواحها وجود سرّ الإخلاص فيها".[1]

ترجمہ: "اعمال کھڑی شکلیں ہیں اوران کی روح ان میں موجود اخلاص کا جوہر ہے"

۴: یہی اخلاص ہے جس کے بل بوتے انفرادی اور اجتماعی اعمال کو حسن وخوبی کے ساتھ قائم رکھا جاسکتا ہے۔ کام چوری، غفلت، بے راہ روی اور فرض منصبی سے پہلو تہی وغیرہ عناصر پر اسی اخلاص ہی کی بدولت ٹھیک قابو پایا جاسکتا ہے۔ خصوصاً جن کاموں میں طوالت یا مشقت ہو یا کسی عمل کی تکمیل کے لئے اپنے مالی مفاد یا عہدہ ومنصب کی قربانی دینے کی ضرورت ہو، ایسے اعمال اخلاص کے بغیر

---

[1] الحكم العطائية مع شرح العلامة ابن عباد النّفري، ص۱۱۱.

عمل میں نہیں آتے۔اس لحاظ سے اخلاص صرف انفرادی زندگی ہی کے لئے ضروری نہیں ہے بلکہ اجتماعی زندگی کے لئے بھی یہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

۵: اخلاص کی ضد ریاء ہے جو بہت ہی مذموم اور ممنوع ہے یہاں تک کہ متعدد روایات میں اس کو شرک قرار دیا گیا ہے۔

اخلاص کے فضائل

سورۃ "البینۃ" کی آیت ہے:

{وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ}.[1]

ترجمہ:"اور انہیں صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں ایک رخ ہو کر خالص اسی کی اطاعت کی نیت سے اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں اور یہی محکم دین ہے"۔

"صحیح بخاری" میں ہے:

عمر بن الخطاب رضي الله عنه على المنبر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: «إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها، أو إلى امرأة ينكحها، فهجرته إلى ما هاجر إليه».[2]

---

١ سورۃالبينة،رقم الاية: ٥.

٢ صحيح البخاري،كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ ،ج١ص ٦.

ترجمہ:"حضرت عمر ابن الخطابؓ نے ممبر پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: اَعمال کا دار و مدار نیّتوں پر ہے اور ہر انسان کو وہی ملے گا جو اس نے نیت کی ہو، پس جس کی دوڑ دنیا کے لئے ہو کہ وہ اسے پالے یا کسی عورت کے لئے ہو کہ اس سے نکاح کرلے، پس اسی چیز کی طرف اس کی ہجرت شمار ہوگی جس چیز کی اس نے نیت کی ہو"۔

"سننِ نسائی" میں ہے:

عن أبي أمامة الباهلي قال: جاء رجل إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: أرأيت رجلا غزا يلتمس الأجر والذكر ما له؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «لا شيء له» فأعادها ثلاث مرات يقول له رسول الله صلى الله عليه وسلم: «لا شيء له»، ثم قال: «إن الله لا يقبل من العمل إلا ما كان له خالصا وابتغي به وجهه».[١]

ترجمہ:"حضرت امامہ باہلیؓ سے روایت ہے: کہ آپ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: کہ اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو اجرت وشہرت کی غرض سے جہاد کرے؟ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ سائل نے تین مرتبہ سوال دہرایا اور آپ ﷺ یہی جواب دیتے رہے کہ: اس کے لئے کچھ نہیں، پھر ارشاد فرمایا: اللہ تعالی صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جو خالص اسی کے لئے کیا گیا ہو اور جس سے اس کی رضاجوئی مقصود ہو"۔

"الجہاد لابنِ عاصم" میں ہے:

---

[١] السنن الكبرى للنسائي: من غزا يلتمس الأجر والذكر، ج٤ص ٢٨٦.

عَنْ يَحْيَىٰ بْنِ الْوَلِيدِ بْنِ عُبَادَةَ، عَنْ جَدِّهِ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ غَزَا فِي سَبِيلِ اللهِ وَهُوَ لَا يَنْوِي إِلَّا عِقَالًا فَلَهُ مَا نَوَىٰ».[١]

ترجمہ: "یحیی بن ولید بن عبادہ اپنے دادا حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: جس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور اس کی نیت اونٹ کی ایک رسی کی ہو، تو اس کو وہی ملے گا جو اس نے نیت کی"۔

اخلاص کا حکم

اخلاص کی ابتدا نیت سے ہوتی ہے اور اسی کے لحاظ سے اس کی مختلف قسمیں بن جاتی ہیں، شرعی حکم کے لحاظ سے اس کی درج ذیل قسمیں کی جاسکتی ہیں:

الف: نیت کا وہ درجہ جس پر عبادت کا صحیح ہونا موقوف ہو، جس کی تفصیل فقہی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس قدر فرض ہے جس کے بغیر عبادت ہی معتبر نہ ہوگی اور بندے کا ذمہ فارغ نہ ہوگا۔ لہذا اگر کوئی شخص رمضان کے مہینے میں صبح سے لے کر مغرب تک کھانے، پینے اور جنسی خواہشات کی تکمیل سے رکا رہے لیکن دل میں روزہ رکھنے کا قصد نہ ہو تو روزہ ادا ہوگا اور نہ ہی اس کا ذمہ فارغ ہوگا۔

ب: اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان لگانے کا درجہ۔ کہ عبادت میں برابر یہ استحضار رہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بعض کتابوں میں مقام مراقبہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

---

[١] الجهاد لابن أبي عاصم، النِّيَّةُ فِي الْجِهَادِ ،ج٢ص ٦١٨.

ج: مقام مشاہدہ۔ یعنی اس طور پر عبادت انجام دینا کہ گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ یہ دونوں درجے مشہور حدیث "حدیث جبرئیل" میں ذکر فرمائے گئے ہیں اور ان کو "احسان" کی تفسیر و مصداق قرار دیا گیا ہے جبکہ قرآن کریم کے متعدد نصوص میں "احسان" کی ترغیب دی گئی ہے اور ایک جگہ اس کا حکم بھی دیا گیا ہے، چنانچہ سورۃ بقرہ میں ارشادِ خداوندی ہے:

{وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ}.[۱]

ترجمہ: "اور نیکی کرو بیشک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

ان دونوں درجات کا حکم یہ ہے کہ یہ دونوں ہی مطلوب ہیں، عبادت میں پختگی، استحکام اور شان قبولیت بڑھانے کے لئے دونوں کی ضرورت ہے۔ اس درجہ کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی معیت نصیب ہوتی ہے اور رحمت خداوندی ان کے قریب ہوتی ہے، اور کمالِ اخلاص یہی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ اس کی حیثیت ایسے فرض کی نہیں ہے جس پر کسی عبادت کا درست ہونا ہی موقوف ہو۔

---

[۱] سورۃالبقرۃ،رقم الایۃ: ۱۹۵.

اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد

مفہوم وتعارف

یہاں توکل سے مراد یہ ہے کہ اپنے تمام تر معاملات میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی پر اعتماد و بھروسہ رکھا جائے، اسی کو حقیقی مؤثر سمجھا جائے۔ علامہ حارث محاسبی رحمہ اللہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والتوكل أَن ينْفَرد بإشـعار قلبه فِي تَفْوِيض الْمقدرَة الى الله سُـبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ والتبري من الْحول وَالْقُوَّة.[1]

ترجمہ: "توکّل یہ ہے کہ اللہ تعالی کو دل سے تمام قدرتوں کامالک سمجھے اور اپنے آپ کو قوّت وتدبیر سے یکسر خالی یقین کرے"۔

اس کے بعد ایک جگہ فرماتے ہیں:

"اے بھائی؛ جان لو کہ تم تبھی اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والا قرار پاسکتے ہو جب اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمام تر امیدوں کو ختم کردے۔ تیرا نفس یہ کیوں گوارا نہیں کرتی کہ تو (اللہ کے سوا) تمام تر تعلقات کو دل سے مٹادے اور سچے توکل کے ساتھ دل کو اسی کی طرف متوجہ کردے حالانکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لئے کافی ہے جو اس پر توکل کرتے ہیں۔ سچا توکل کرنے والے شخص کا دل کسی مخلوق کی طرف نہیں جھکتا دکھائی دیا کیونکہ اس کا دل تو اللہ تعالیٰ کی اس ذمہ داری پر یقین کرنے سے بھرا ہوا ہوتا ہے جو اس نے لے رکھی ہے۔"[2]

علامہ سید شریف جرجانی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] آداب النفوس للمحاسبي،ص: ١٧٣.

[2] آداب النفوس للمحاسبي،ص: ١٩١.

التوكل: هو الثقة بما عند الله، واليأس عما في أيدي الناس.[١]

ترجمہ:"توکّل اس بات پر بھرپور یقین واطمئنان کا نام ہے کہ اللہ تعالی کے پاس سب کچھ ہے اور اس بات سے مکمل مایوسی کا(نام ہے) کہ لوگوں کے دسترس میں کچھ نہیں"۔

آگے ذکر کیا جارہاہے کہ توکل کے لئے اسباب چھوڑنا ضروری نہیں ہے ،اس کے مطابق توکل کا حاصل مفہوم یہ ہے کہ کسی بھی معاملہ میں اسباب وغیرہ کسی بھی ماسوی اللہ کو مؤثر نہ سمجھا جائے،اس پر یقین نہ رکھا جائے بلکہ ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو حقیقی مؤثر اور کارساز سمجھا جائے،اسی پر دلی اعتماد اور قلبی بھروسہ رکھا جائے اگرچہ ظاہری طور پر جائز اسباب کو بروئے کار لایا جائے لیکن نتائج اور مسببات کو اس کے ساتھ نہ جوڑا جائے۔

توکل کے فضائل

سورۃ"آلِ عمران"میں ہے:

{فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ}.[٢]

ترجمہ:"پھر جب تو اس کام کا ارادہ کرچکا تو اللہ پر بھروسہ کر بیشک اللہ توکل کرنے والے لوگوں کو پسند کرتا ہے"۔

سورۃ"النحل"میں ارشاد ہے

---

[١] التعريفات:ص،٧٠.

[٢] سورة آل عمران،رقم الاية: ١٥٩.

{وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (٤١) الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ}.[١]

ترجمہ:"اور جنہوں نے اللہ کے واسطے گھر چھوڑا اس کے بعد ان پر ظلم کیا گیا تھا تو البتہ ہم نے انھیں دنیا میں اچھی جگہ دیں گے اور آخرت کا ثواب تو بہت ہی بڑا ہے کاش یہ لوگ سمجھ جاتے۔ جو لوگ ثابت قدم رہے اور اپنے رب پر بھروسہ کیا"۔

سورۃ "الطلاق" کی آیت ہے:

{وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا}.[٢]

ترجمہ:"اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے سو وہی اس کو کافی ہے بیشک اللہ اپنا حکم پورا کرنے والا ہے اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے"۔

"مسند احمد" میں ہے:

أخبرني بكر بن عمرو، أنه سمع عبد الله بن هبيرة، يقول: إنه سمع أبا تميم الجيشاني يقول: سمع عمر بن الخطاب يقول: إنه سمع نبي الله صلى الله عليه وسلم يقول: " لو أنكم تتوكلون على الله حق توكله، لرزقكم كما يرزق الطير، تغدو خماصا وتروح بطانا".[٣]

---

[١] سورة النحل،رقم الاية: ٤١، ٤٢.

[٢] سورة الطلاق،رقم الاية: ٣.

[٣] مسند أحمد ط الرسالة، ج١ص ٣٣٢.رقم الحديث: ٢٠٥.

ترجمہ:"حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم اللہ پر اس طرح ہی توکل کر لیتے جیسے اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو تمہیں اسی طرح رزق عطاء کیا جاتا جیسے پرندوں کو دیا جاتا ہے جو صبح کو خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں"۔

اہمیت وفوائد

اس معنیٰ میں توکل نیک اور مطلوب صفات وعادات میں سے ایک اہم صفت ہے۔

۱: قرآن کریم میں جابجا اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر مسلمانوں کو توکل کر لینا چاہیے، کئی جگہ حضور ﷺ کو بھی اس کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر توکل کریں۔ شیخ ابو محمد سہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ توکل سے بڑھ کر کوئی مقام ومرتبہ نہیں ہے۔[1]

۲: حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور دیگر مسلمانوں کی قابل تقلید صفات میں سے اس صفت "توکل" کو بھی گردانا گیا ہے اور جگہ جگہ اس کی صراحت کی گئی ہے۔

۳: توکل کی عادت راسخ ہو جائے تو انسان کی ذہنی پریشانیاں اور مایوسیاں کافور ہو جاتی ہیں، ہر حالت میں دلی اطمینان کی کیفیت مستحکم ہو جاتی ہے۔

---

[1] قوت القلوب في معاملة المحبوب ،ج۲ص۳.

۴: اس عادت کی برکت سے تمام تر گناہوں میں ملوث ہونے سے انسان کو نجات حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ گناہ کا کام یا تو کسی نفع کے حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے اور یا کسی نقصان و مضرت سے بچنے کے لئے اس کا ارتکاب کرتا ہے، جب توکل کا مقام حاصل ہو جائے اور یہ یقین ہو جائے کہ میرا اقدام ایک غیر مؤثر سبب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اس کے سہارے مقصود کا حاصل ہونا تو یقینی نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ناراضگی یقینی ہے اور اسی کے ہاتھ میں تمام امور کی تدبیر واختیار ہے، وہی میرے نفع و نقصان وغیرہ تمام تر امور کا مالک ہے تو اس کے بعد گناہ کرنے کی ہمت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ یوں توکل کی حیثیت ایک مضبوط حفاظتی حصار کی ہو جاتی ہے جس کے بل بوتے انسان معاصی و منکرات کے حملوں سے اچھی طرح محفوظ رہ سکتا ہے۔

توکل کی بنیاد اور اس کے دو اجزاء

توکل کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی صحیح پہچان اور معرفت پر ہے، توکل کی صفت تبھی نصیب ہو سکتی ہے جب اس بات پر اچھی طرح یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ستودہ صفات کائنات کی خالق و مدبر ہے، اس کے علم وقدرت کی کوئی حد نہیں ہے اور وہ بہت ودود ور حیم اور مہربان و کریم ہے۔ یہ باتیں اچھی طرح دل میں راسخ ہوں اور ان پر دو دو جمع چار کی طرح پختہ اور غیر متزلزل یقین ہو تبھی حقیقی معنیٰ میں توکل کی دولت نصیب ہو سکتی ہے۔

توکل کے دو جزء ہیں:

پہلا جزء: اعتقاد و تصور

اعتقاد و تصور کی حد تک توکل یہ ہے کہ بندہ اپنا معاملہ اسی کے سپرد کردے، اسی پر دل مطمئن ہو اور اسی کو مؤثر حقیقی سمجھا جائے، کسی بھی کام کے لئے ظاہری طور پر جو اسباب عمل میں لائے جاتے ہیں، ان پر دلی اعتماد و بھروسے کی بنیاد بالکل نہ رکھے بلکہ جس ذات نے اسباب میں ظاہری تاثیر رکھی ہے، اسی کو قبلہ حاجات بنائے رکھے۔

دوسرا جزء: کردار عمل

توکل اسباب کو یک لخت چھوڑنے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی توکل کا مقام حاصل کرنے کے لئے تمام تر اسباب کو چھوڑنا کوئی لازم ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسباب کی تین قسمیں ہیں اور تینوں کا حکم مختلف ہے:

الف: یقینی اسباب۔ مثلاً بدن کے بقاء کے لئے کھانا، پینا اور مہلک چیزوں سے اس کی حفاظت کرنا۔ ان جیسے اسباب کا حکم یہ ہے کہ اپنی

استطاعت کے مطابق ان کو اختیار کرنا شرعاً ضروری ہے اور قدرت کے باوجود ان کو اس حد تک چھوڑے رکھنا کہ بدن کی ہلاکت اور زندگی ختم ہونے کا سبب بن جائے، ناجائز، ممنوع اور خودکشی کے مترادف ہے۔

ب: ظنی اسباب: مثلاً کسی بیابان میں سفر درپیش ہو تو ساتھ زاد سفر لے جانا۔ ان جیسے اسباب کا حکم یہ ہے کہ پہلے کی طرح فرض تو نہیں ہیں البتہ توکل کے لئے اس کو چھوڑنا بھی کوئی ضروری نہیں ہے، اکثر علماء سلف کا یہی معمول رہا ہے کہ وہ ضرورت کی حد تک اسباب اختیار کرلیتے ہیں اور دلی اعتماد کا رشتہ اللہ تعالیٰ ہی

سے جوڑتے ہیں، خود اسوہ نبوی (ﷺ) سے بھی یہی تعلیم وہدایت ملتی ہے، چنانچہ ایک شخص حاضر ہو کر پوچھتے ہیں کہ یارسول اللہ: میں اپنی اونٹی کو کھلی چھوڑ کر توکل کروں؟ حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ (نہیں، پہلے) اپنی اونٹی کو باندھ لو، پھر (اس کے بعد) توکل کرو۔" صحیح ابن حبان" میں ہے:

قال رجل للنبي صلى الله عليه وسلم أرسل ناقتي وأتوكل؟ قال: "اعقلها وتوكل".[١]

ترجمہ:"ایک آدمی نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ کیا میں اپنی اونٹنی کھلا چھوڑوں اور پھر توکّل کروں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: پہلے اس کو باندھو اور پھر توکّل کرو"۔

ج: موہوم اسباب: یہ وہ اسباب ہیں جن سے یقینی طور پر نتائج ومسببات حاصل ہوتے ہوں اور نہ اس کا غالب گمان ہو۔ ان اسباب کا حکم کیا ہے؟ امام غزالی رحمہ اللہ وغیرہ اکثر محققین نے تحریر فرمایا ہیں کہ توکل کے لئے ان اسباب کو چھوڑنا شرط اور ضروری ہے۔[٢]

لیکن اس کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ ان اسباب کو اختیار کرنا شرعاً ضروری اور واجب ہو اور اختیار کرنا گناہ ومعصیت ہو بلکہ اگر ان اسباب کے اختیار کرنے میں کوئی

---

١ صحيح ابن حبان: ذكر الإخبار بأن المرء يجب عليه مع توكل القلب الاحتراز بالأعضاء ضد قول من كرهه، ج٢ص ٥١٠.

٢ الفتاوى الهندية كتاب الكراهية،الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات ج٥ص ٣٥٥. الأربعين في أصول الدين،ص٢٨٢.

ناجائز عنصر شامل ہو تو اختیار کرنے کی گنجائش ہے گو توکل کا عالی مرتبہ یہی ہے کہ ان جیسے اسباب کے درپے نہ ہو جائے۔

محبت الٰہی

محبت کسی چیز کو دل سے چاہنے کا نام ہے، تھوڑا چاہتا ہے یا زیادہ؟ زیادہ چاہتا ہو تو کس قدر؟ اس لحاظ سے محبت کے مراتب متعدد ہیں۔ علامہ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے محبت کرنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کے متعلق اہل علم کے اقوال مختلف ہیں لیکن یہ کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے ،اس کی توجیہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وحقيقة المحبة الميل إلى ما يوافق الإنسان.[1]

ترجمہ: "محبت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان طبیعت کے موافق اشیاء کی طرف مائل ہو جائے (جھک جائے)"

اچھے صفات واخلاق میں "اللہ کی محبت" کو مرکزی حیثیت حاصل ہے بلکہ صرف صفات واخلاق نہیں ،پورے دین پر عمل کرنے میں اس صفت کا بنیادی کردار ہے،اس لئے قرآن وحدیث میں بار بار مختلف اسالیب کے ساتھ اس کو ذکر کیا گیا ہے۔

نصوص

سورۃ "التوبۃ" میں ہے:

---

[1] الشفا بتعريف حقوق المصطفى مع حلشية الشمني: فصل في معني المحبة للنبي صلى الله عليه وسلم وحقيقتها،ج۲ص ۲۹.

{قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ}.[1]

ترجمہ: "کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں لڑنے سے زیادہ پیارے ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے اور اللہ نافرمانوں کو راستہ نہیں دکھاتا"۔

"صحیح بخاری" میں ہے:

عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: «لا يجد أحد حلاوة الإيمان حتى يحب المرء لا يحبه إلا لله، وحتى أن يقذف في النار أحب إليه من أن يرجع إلى الكفر بعد إذ أنقذه الله، وحتى يكون الله ورسوله أحب إليه مما سواهما».[2]

ترجمہ: "حضرت انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص ایمان کی لذت نہیں پائے گا، جب تک کہ وہ کسی آدمی سے صرف اللہ ہی کے لئے محبت نہ کرے اور آگ میں ڈال دیا جانا اس کو زیادہ پسند ہو اس سے کہ کفر کی طرف واپس ہو،

---

١ سورة التوبة، رقم الاية: ٢٤.

٢ صحيح البخاري، باب حديث الإفك، ج٨ ص ١٤.

جب کہ اللہ نے اس کو اس سے نجات دلائی ہے اور جب تک اللہ اور اس کا رسول دوسری تمام چیزوں سے زیادہ اسے محبوب نہ ہوں"۔

"مسندِ احمد میں" ہے:

عن أنس بن مالك، عن النبي أنه قال: " لا يؤمن أحدكم حتىٰ يكون الله ورسوله أحب إليه مما سواهما، وحتىٰ يقذف في النار أحب إليه من أن يعود في الكفر، بعد إذ نجاه الله منه، ولا يؤمن أحدكم حتىٰ أكون أحب إليه من ولده، ووالده والناس أجمعين". [1]

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اسے اللہ اور اس کے رسول دوسروں سے سب سے زیادہ محبوب نہ ہوں اور انسان کفر سے نجات ملنے کے بعد اس میں واپس جانے کو اسی طرح ناپسند کرے جیسے آگ میں چھلانگ لگانے کو ناپسند کرتا ہے۔ اور تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کی نگاہوں میں اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔

محبت الٰہی کی اہمیت و فوائد

۱: اللہ تعالیٰ سے محبت اس کے کمال اور انسانیت کے ساتھ اس کی احسان کا ثمرہ ہے، احسان شناسی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے غیر معمولی بلکہ سب سے بڑھ کر محبوب بنایا جائے۔

---

[1] مسند أحمد ط الرسالة، ج٢٠ص ٣٩٧.رقم الحديث: ١٣١٥١.

۲ : محبت خداوندی دین کے احکام پر عمل کرنے کا اصل واساس ہے، خاص کر جو احکام نفس کی چاہت کے خلاف اوراس پر بھاری ہو، محبت ہی کی بدولت ان پر دل جمعی کے ساتھ عمل کرنا ممکن ہے۔

۳: محبوب کا ہر حکم محبوب ہوتا ہے اس لئے اس کے نتیجے میں پورے دین سے محبت استوار ہو جاتی ہے۔

۴: محبت کے نتیجے میں اخلاص پیدا ہوتا ہے بلکہ اخلاص میں خاطر خواہ ترقی ہوتی رہتی ہے اور یہی اخلاص کلید کامیابی اور روحانی ترقی کی بنیادی سیڑھی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کا حکم

کسی چیز سے محبت کرنے کی مختلف سطحیں ہوسکتی ہیں، کبھی محض طبیعت کے تقاضے سے کسی چیز سے محبت ہوتی ہے جو چیز طبیعت کو مرغوب ہو، اس سے خود بخود محبت پیدا ہوتی ہے۔ محبت کی یہ قسم انسانی اختیار کے دائرے سے خارج ہوتی ہے، اس لئے انسان شریعت کی طرف سے مکلف بھی نہیں۔ محبت کی دوسری قسم عقلی ہے کہ سوچ وبچار کے بعد کسی چیز کے ساتھ محبت کا رشتہ قائم کرلیاجائے، یہ اختیاری چیز ہے اور حضرتِ انسان اس کا مکلف ہے۔ اللہ تعالیٰ، حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور تمام دینی شعائر کے ساتھ اس معنیٰ میں محبت رکھنا ضروری ہے۔ محبت کے بیسیوں درجات میں سے کونسا درجہ لازم ہے؟ اور اللہ تعالیٰ سے کس درجہ محبت رکھنا ضروری ہے؟ تو کم از کم اتنی محبت کرنا ضروری ہے جس پر ضروری شرعی احکام کی تعمیل موقوف ہو اور جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ضروری باتوں پر بھی عمل کرنے میں خلل آئے۔

اللہ کی محبت کیوں؟

انسان طبعی طور پر بخیل واقع ہوا ہے، وہ نفیس مادی چیزیں تو درکنار، محبت کا غیر مادی رشتہ بھی ہر کسی سے ہاتھ پکڑانے کو تیار نہیں ہوتا، بعض عناصر وامور کو دیکھ کر یا مان کر ہی محبت کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ کسی چیز سے انسان محبت کیوں کرتا ہے؟ نفسیاتی طور اس کے عمومی اسباب تین ہوتے ہیں، حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ نے ان اسباب کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے[۱]، ان میں سے ایک چیز حسن وجمال ہے چنانچہ کوئی چیز جب ظاہری حسن وخوبصورتی کا پیکر ہو تو انسان اس سے محبت کرتا ہے۔ دوسری چیز فضل وکمال ہے، باکمال افراد سے ہر کوئی محبت رکھتا ہے۔ جبکہ تیسری چیز اکرام واحسان ہے کیونکہ انسان فطری طور پر احسان مند پیدا ہوا ہے، اس کو اپنے محسن سے محبت بھی ہوتی ہے اور اس کے فرمان برداری کی فکر بھی۔ انسان جن چیزوں سے پیار ومحبت کا رشتہ قائم رکھتا ہے، اگر کھوج لگا کر کوئی ان کے بنیادی اسباب ومحرکات کو دریافت کرنا چاہے تو عموماً انہی چیزوں پر محبت کی عمارت استوار ہوتی ہے، یہی وہ بنیادی اور اہم عوامل وعناصر ہیں جن کی بنیاد پر انسان دوسرے انسان یا دیگر چیزوں سے دلی محبت رکھتا ہے۔

اب انصاف پسندی کے جذبے سے غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ ہی کی وہ ہستی ہے جس میں یہ سب خوبیاں اچھی طرح جمع ہیں وہی تنِ تنہا تمام خوبیوں اور کمالات

---

[۱] الشفا بتعريف حقوق المصطفى – وحاشية الشمني فصل في معني المحبة للنبي صلى الله عليه وسلم وحقيقتها ،ج۲ ص۲۹.

والا ہے، آنکھیں جس چیز کے حسن وجمال کے نظارے کرتی ہیں وہ سب اسی ذات کی پیدا کردہ ہے۔اس کے ذات کا جمال کا کون کہاں تصور کر سکتا ہے! انسانی دماغ سے اگر اس کی حقیقت یا تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کی حیثیت اس لوٹے سے کہیں زیادہ کم بلکہ ہیچ کے مانند ہے جو سمندر کے تمام پانی کو اپنے ہی اندر جذب کرنا چاہتا ہو۔ اس کے فضل وکمال کا بھی یہی حال ہے۔ جہاں تک اکرام وانعام کی بات ہے تو تمام انعامات واحسانات اسی کی مشیت اور اسی کی تدبیر پر موقوف ہوتی ہے اور یوں حقیقت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو ساری نعمتیں اور تمام احسان اسی کی طرف سے ملتے ہیں۔اس لئے اس سے بڑھ کر کون محبت کا مستحق ہوسکتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے مقابل کوئی چیز محبت تو کیا،توجہ کرنے کی بھی مستحق نہیں ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ بالکل درست فرماتے ہیں کہ:

العارف لا يُحبّ إلّا الله تعالى، فإنّ أحبّ غيره فيحبّه لله.[1]

ترجمہ:"عارف (اللہ کو پہچاننے والا) صرف اللہ ہی سے محبت کرتا ہے،اگر غیر سے محبت رکھے تو وہ بھی اللہ کے لئے ہوتا ہے"۔

معیارِ محبت

قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

---

[1] الأربعين في أصول الدين،ص۲۹۰.

{قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ}. ۱

ترجمہ: "کہہ دو اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو تاکہ تم سے اللہ محبت کرے اور تمہارے گناہ بخشے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

اس آیت کریمہ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنا چاہتا ہے تو اس کو حضور ﷺ کی اتباع کرلینی چاہئے، اس کے عوض اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبوبیت بھی نصیب ہو جائے گی اور مغفرت بھی۔ حضور نبی کریم ﷺ کی اتباع کرنا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کی علامت ونشانی بھی ہے اور اس کا معیار وترازو بھی، بلکہ غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور اس کی طرف سے محبوبیت حاصل ہو جانے کا کامیاب ذریعہ بھی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہاں حضور ﷺ کی اتباع سے صرف عام مشہور معنیٰ میں اتباع سنت ہی مراد نہیں ہے بلکہ علم اصول حدیث کی اصطلاح کے مطابق حضور ﷺ کی طرف منسوب ہر چیز مراد ہے اور یوں اس میں پورا دین شامل ہو جاتا ہے، حضور ﷺ کو دینی احکام کی تکمیل وتعمیل کے ساتھ جس درجے کا لگاؤ تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، اس کو اپنی قدرت واستطاعت کے مطابق بروئے کار لانا حضور ﷺ کی حقیقی اتباع ہے جس کو دوسرے الفاظ میں "کامل اتباع شریعت" بھی کہا جاسکتا ہے اور یہی چیز اللہ تعالیٰ کی محبت اور محبوبیت کا ذریعہ ہے۔

---

۱ سورة آل عمران، رقم الاية: ۳۱.

محبت پیدا کرنے کی ترکیب

جب محبت کے سارے عوامل اسی پاک ذات میں جمع ہیں تو محبت کا قبلہ وکعبہ بھی وہی ہے، لیکن عملی طور پر ایسا تب ہو سکتا ہے جب ان باتوں کا یقین اور استحضار حاصل ہو۔ جب یہ باتیں انسان کے یقین میں جگہ پا لیتی ہیں تو اس کے بعد محبت کا تعلق خود بخود استوار ہو جاتا ہے بلکہ انسان چاہے تو بھی محبت کے اس تعلق کو ختم کرنے پر آسانی سے قادر نہیں ہوتا۔ کوئی چیز کتنی ہی طبیعت کے موافق اور باعث فضل وکمال کیوں نہ ہو لیکن جب تک اس سے واقفیت نہیں ہوتی اور اس کے افادیت واہمیت کا شعور پیدا نہ ہو، تب تک اس کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں ہوتا، اور جب اسی چیز کے متعلق کچھ علم ہو جائے اور محبت کے عناصر کو اس میں تصور کئے جائیں تو دل اس کی محبت کا اسیر بن جاتا ہے، یہی حال اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے کا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی صحیح معرفت اور علم وشعور حاصل ہو جائے تو محبت الٰہی پیدا کرنے کے لئے مزید کسی دلیل وبرہان یا ترکیب وتصنع کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔

اس لئے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ:

۱: ان باتوں (یعنیٰ اللہ تعالیٰ کے حسن وجمال، فضل وکمال اور اکرام احسان) کا بار بار استحضار کیا جائے اور اس کا بہتر ومؤثر طریقہ مراقبہ کرنا ہے۔

۲: دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف جو ضرورتیں پیش آنے والی ہیں ان کا استحضار کیا جائے۔

۳: اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور گناہوں کو موقع بموقع یاد کرتا رہے۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہنا(رضا بالقضاء)

نیک صفات اور مطلوب اخلاق میں سے ایک اہم صفت "رضا بالقضاء "ہے۔یعنیٰ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر دل سے راضی اور مطمئن رہنا، چاہے وہ فیصلہ تکوینی نوعیت کا ہو یا تشریع سے متعلق ہو۔

اہمیت اور فوائد

۱: بندگی اور عبدیت جو مقصودِ زندگی ہے،اس کا اعلیٰ اور بلند تر مقام یہی رضا بالقضاء ہے کہ بندہ اپنی رضامندی مولیٰ کی رضامندی پر قربان کردے۔

۲:اس صفت کی بدولت زندگی اور صلاحیت واستعداد کا بڑا حصہ محفوظ رہ جاتا ہے اور خیال وتصور اور قیل وقال کی بہت سے بے فائدہ وادیوں میں بھٹکتے پھرنے سے نجات نصیب ہو جاتی ہے۔

۳:اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر معمولی محبت،اور قوی تر ربط و تعلق کا ذریعہ ہے جو ہر خیر وسعادت کی شاہراہ ہے۔

۴: دینی اعمال واحکام پر دلی اطمینان و تسلی کی روح پرور کیفیت نصیب ہو جاتی ہے جس پر استقامت سے شریعت طبیعت بن جاتی ہے۔

۵:اس کے ذریعے عبادات میں مقدار ومعیار،دونوں لحاظ سے خاطر خواہ ترقی ہوتی ہے،مقدار کے لحاظ سے تو ظاہر ہے کہ اس میں وقت اور صلاحیتوں کا تحفظ ہے اور یہی بچی بچائی صلاحیت اور اوقات عبادت کے کام میں لگ جاتے ہیں اور معیار کے لحاظ سے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر معمولی محبت و تعلق کی وجہ

سے اخلاص واحسان کے بلند تر درجات نصیب ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے عبادت کا معیار کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

نصوص وارروایات

"سننِ ابنِ ماجہ" میں ہے:

عن سعد بن سنان عن أنس بن مالك، عن رسول الله – صلى الله عليه وسلم – أنه قال: "عظم الجزاء مع عظم البلاء، وإن الله إذا أحب قوما ابتلاهم، فمن رضي فله الرضا، ومن سخط فله السخط".[١]

ترجمہ: "حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ثواب اتنا ہی زیادہ ہو گا جتنی آزمائش سخت ہو گی اور اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو پسند فرماتے ہیں تو اس کی آزمائش کرتے ہیں جو راضی ہو اس سے راضی ہو جاتے اور جو ناراض ہو اس سے ناراض"۔

"المعجم الکبیر" میں ہے:

عن أبي هند الداري قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: قال الله تبارك وتعالى: «من لم يرض بقضائي ويصبر على بلائي فليلتمس ربا سواي».[٢]

---

[١] سنن ابن ماجه ت الأرنؤوط:باب الصبر على البلاء، ج٥ص ١٥٩.

[٢] المعجم الكبير للطبراني،من يكنى أبا صعصعة أبو صعصعة الأنصاري،رقم الحديث:٨٠٧ ج٢٢ص ٣٢٠.

ترجمہ: "حضرت ابی ہند الداریؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ :اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:جو میرے فیصلہ پر راضی نہ ہواور میری آزمائش پر صابر نہ ہو وہ میرے علاوہ کوئی اور رب تلاش کرے"۔

رضاء بالقضاء عقل سلیم کی روشنی میں

عقلی لحاظ سے غور کیاجائے تو رضا بالقضاء کوئی فلسفیانہ مفروضہ، پرُ تکلف نظریہ یا کوئی اختراعی تصور نہیں ہے جیسا کہ بسا اوقات سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس کی کچھ تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ:

الف: کسی فیصلے سے ناراضگی اور برہمی کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ فیصلہ غلط ہے یا مفاد کے خلاف ہے۔

ب: اشخاص وافراد کے فیصلوں میں غلطی کے مختلف عناصر ہوتے ہیں ۔ بسا اوقات معلومات میں کمی اور حقیقت سے ناواقفیت کی وجہ سے فیصلہ غلط ہو جاتا ہے اور کبھی خوف ورعب یا امید ولالچ جیسے عوامل فیصلہ پر اثر انداز ہو جاتے ہیں اور کبھی فیصلے کرنے والے میں قوت ارادی نہ ہونے یا کمزور ہونے کی وجہ سے فیصلہ غلط رخ اختیار کرلیتا ہے۔غرض کسی نہ کسی علمی یا عملی کمزوری اور کوتاہی کے اوپر غلطیوں کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح بلا وجہ کسی کے مفاد کو ٹھیس پہنچانے کی بھی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں جن کا آخری سرا یہی علمی یا عملی نقص کے ساتھ جا کر ملتا ہے۔

ج: ان باتوں کے تناظر میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر غور کیاجائے اور لوح دل پر ان کو مستحضر کرلیاجائے کہ کیااس کی ذات میں علمی یا عملی کسی قسم کی کسی

کمزوری کا تصور تک ہو سکتا ہے! اس کی صفاتِ کمال میں کوئی ایسی تشنگی باقی ہو سکتی ہے جس کے نتیجے میں کوئی غلطی صادر ہو جاتی ہو!

اگر نہیں اور یقیناً نہیں ہے تو اس کے بعد انسان اگر اس کے فیصلوں پر کلی رضامندی اختیار نہ کرے تو آخر کرے کیا؟ انسانیت اور عقلِ سلیم کا یہی مقتضی ہے کہ ایسی باکمال ہستی کے ہر فیصلے پر غیر مشروط رضامندی اور کامل تسلی رکھی جائے۔

کچھ شبہات کا دفعیہ

جہاں نصوص میں رضاء بالقضاء کی تاکید و ترغیب وارد ہوئی ہے اور تصوف واخلاق کی کتابوں میں اس کو مطلوب اخلاق وصفات میں سے شمار فرمایا گیا ہے، اس کے متعلق دو باتیں پیشِ نظر رہنی چاہئے:

۱: یہاں رضامندی سے عقلی طور پر رضامندی مراد ہے اور وہی انسان کے اختیار میں ہے، اسی کا اس کو مکلف بنایا جاتا ہے۔

۲: نفسِ فیصلہ پر رضامندی ضروری ہے اور وہ بھی اس جہت سے کہ فیصلہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے۔ لہٰذا فیصلہ شدہ امر پر رضامندی بہر صورت لازم نہیں ہے، اسی کو کئی محقق اہل علم دوسری طرح تعبیر فرماتے ہیں کہ "رضا بالقضاء" تو ضروری ہے لیکن "رضاء بالمقضی" لازم نہیں۔

اس تفصیل سے یہ اشکال بھی دور ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض فیصلے تو انسانی مزاج وطبیعت کے خلاف ہوتے ہیں تو ان پر رضامندی کیونکر متصور ہو سکتی ہے! اسی طرح اس اعتراض کا بھی تصفیہ ہو جاتا ہے کہ بعض چیزں سے نفرت وبغض شرعاً مرخص بلکہ مطلوب ہوتی ہے، مثال کے طور پر کافر اور دین دشمن

عناصر سے نفرت وبے زاری شرعاً ضروری ہے مگر اس طرح کوئی واقع شدہ اقدام اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے فیصلے کے بغیر متصور نہیں۔

محاسبہ

روزہ مرہ کے اشغال واعمال کا جائزہ لینا، اپنے نفس کے ساتھ دن بھر کی مصروفیات کا حساب وکتاب کرنا، کہ ان میں کوئی ناجائز اقدام تو نہیں کیا گیا! جو اعمال نیکی کے قبیل سے تھے یا ان میں عبادت کا پہلو موجود تھا، ان میں اخلاص کی صفت موجود تھی یا نہیں؟ اگر تھی تو کس قدر؟۔ ان باتوں کے اہتمام کرنے کو محاسبہ کہا جاتا ہے۔ یہ محض ایک اچھی خصلت ہی نہیں ہے بلکہ تمام خصائل کو حاصل کرنے اور تمام رزائل سے نجات پانے کی ایک راہ ہے۔ یہ ایک منطقی اور تجرباتی طریقہ کار جس کی بدولت انسان اپنی صلاح واصلاح کی راہ میں ترقی اور استقامت پر گامزن رہ سکتا ہے۔

محاسبہ کی افادیت نصوص وفرمودات کی روشنی میں

سورۃ "الحشر" میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَّ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللهَّ إِنَّ اللهَّ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (١٨) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَّ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ}.[1]

---

[1] سورة الحشر، رقم الاية: ١٨، ١٩.

ترجمہ: "اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور ہر شخص کو دیکھنا چاہیئے کہ اس نے کل کے لئے کیا آگے بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرو کیونکہ اللہ تمہارے کاموں سے خبر دار ہے۔ اور ان کی طرح نہ ہوں جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا پھر اللہ نے بھی ان کو (ایسا کر دیا) کہ وہ اپنے آپ ہی کو بھول گئے یہی لوگ نافرمان ہیں"۔

امام حارث المحاسبیؒ فرماتے ہیں:

وحاسب نَفسك فِي كل خطرةوراقب الله فِي كل نفس قَالَ عمر رَضِي الله عَنهُ حاسبوا أَنفسكُم قبل أَن تحاسبوا وزنوها قبل أَن توزنوا وتزينوا للعرض الْأَكْبَر يَوْم لَا تخفىٰ مِنْكُم خافية وخف الله فِي دينك وارجه فِي جَمِيع أمورك واصبر علىٰ مَا أَصَابَك.[1]

ترجمہ: "ہر وقت اپنے نفس کا محاسبہ کرو اور ہر لمحہ اللہ کو یاد رکھو، حضرتِ عمرؓ نے فرمایا: خود ہی اپنا محاسبہ کر لیا کریں قبل اس کے کہ آپ کا محاسبہ کیا جائے اور خود ہی اپنے آپ کو تول لیا کرو، قبل اس کے کہ تم تولے جاؤ، اور جس دن کوئی بات چھپی نہیں رہے گی اس دن کی ہولناک پیشی کے لئے تیار رہو، اور دین کے معاملہ میں اللہ سے ڈرا کرو اور تمام کاموں میں اس سے خیر کی امید رکھو، اور اپنی مصیبتوں صبر کرو۔"

علامہ ابو سعید الخادمیؒ فرماتے ہیں:

قال المناوي عن ابن العربي كان مشايخنا يحاسبون أنفسهم علىٰ أفعالهم وأقوالهم ويقيدون في دفتر فإذا كان بعد العشاء حاسبوا نفوسهم وأحضروا دفترهم فإن استحق استغفارا استغفروا، وإن

---

[1] رسالة المسترشدين: ص ٤٦.

شكرا فشكروا ثم ينامون فزدنا عليهم في هذا الباب الخواطر فكنا نقيد ما تحدث به نفوسنا ونهتم به ونحاسبها عليه لقوله حاسبوا أنفسكم قبل أن تحاسبوا.[1]

ترجمہ: "علّامہ مناویؒ ابن العربیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ہمارے مشائخ اپنے افعال واقوال ایک دفتر میں لکھ لیتے تھے اور اپنا محاسبہ کرتے تھے، جب رات ہوتی، تو وہ دفتر حاضر کرتے اور دیکھتے تھے کہ اگر کوئی قول یا فعل قابلِ استغفار ہے اس پر استغفار کرتے اور اگر قابلِ شکر ہے تو اس پر شکر بجالاتے، اس کے بعد سو جاتے تھے۔ ہم نے اس میں یہ بھی اضافہ کیا کہ اپنے اوہام وخیالات کو بھی لکھنے لگے اور اس پر بھی اپنے احتساب کا اہتمام کرتے تھے، آپؐ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ: اپنا محاسبہ کر لیا کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے"۔

علامہ محمد بن احمد السفارینیؒ فرماتے ہیں:

فعلى العاقل أنْ يحاسبَ نفسَهُ قبلَ يوم الحِساب، ويعاتبها قبل أنْ لا ينفع العتاب ومِنْ ثَمَّ قال سيدنا عمر بن الخطاب رضوان الله عليه: حاسبوا أنفسَكم قبل أنْ تُحاسبوا، وزنوها قبل أنْ توزنوا. وحساب النفسِ هو التوبة النصوح، وتدارك ما فرط من تقصير في أداءِ الفرائض، ويرد المظالم إلى أهلها حبة حبة، ويستحل ما يمكنه استحلاله. والله الموفق.[2]

---

[1] بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية في سيرة أحمدية: ج٢ص ٧٤.

[2] البحور الزاخرة في علوم الآخرة: ج٢ص٨٨٦.

ترجمہ:"عاقل کے لئے ضروری ہے کہ روزِ جزا سے قبل اپنا احتساب کرلے،اور اس کو ملامت کرے قبل اس کے کہ ملامت کرنا کوئی فائدہ نہ دے،اسی وجہ سے حضرت عمر ابن الخطابؓ نے فرمایا:اپنا احتساب خود کرلو،اس سے پہلے کہ تمہارا احتساب کیا جائےاور اپنے آپ (اعمال)کوتولو،اس سے پہلے کہ تم تولے جاؤ(تمہارے اعمال)۔اور نفس کا احتساب سچّا توبہ اور فرائض کی ادائیگی میں تقصیر کاتدارک کرناہےاور یہ کہ حقوق سب کے سب اہلِ حقوق کوواپس کی جائیں،اور جن حقوق کی معافی تلافی ممکن ہوان کی معافی کرائی جائے"۔

علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں:

وذكر أيضًا عن الحسن، قال: "لا يُلفَى المؤمنُ إلا يُحاسِبُ نفسه: ما أردتُ بكلمتي؟ وماذا أردتُ بأكلتي؟ وماذا أردت بشَرْبتي؟ والفاجر يمضي قُدُمًا، لا يُحاسِب نفسَه".

وقال قتادة في قوله تعالى: {وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا} [الكهف: ٢٨]: "أضاع نفسَه وغُبِن، مع ذلك تراه حافظًا لمالِه مضيِّعًا لدينه".[١]

ترجمہ:"حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ مؤمن ہروقت اپنے نفس کے محاسبہ میں لگارہتاہے کہ میں نے یہ بات کس مقصد کے لئے کی؟کھانے،پینے سے میں نے کیا نیت کی؟جبکہ فاجر انسان آگے بڑھتاچلاجاتاہےاس کو کبھی اپنے محاسبہ کی توفیق نہیں ہوتی"۔

حضرت قتادہ نے اللہ تعالی کے اس ارشاد کے بارے میں فرمایا{وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا} [الكهف: ٢٨](اور اسکا معاملہ حد سے گزراہواہے)یعنی اپنے آپ کو ضائع کیااور

---

[١] إغاثة اللهفان في مصايد الشيطان ط عالم الفوائد :ج ١ص ١٣٢.

دھوکہ خوردہ ہوا،اس کے باوجود تم اس کومال کامحافظ اور دین کوبرباد کرنے والاپاؤگے"

عبد العزیز بن محمد "موارد الظمآن" میں فرماتے ہیں:

وقال الحسن: "إن العبد لا يزال بخير ما كان له واعظٌ من نفسه، وكانت المحاسبة من همَّته". وقال ميمون بن مِهران: "لا يكون العبد تقيًّا حتى يكون لنفسه أشدَّ محاسبةً من الشريك لشريكه"، ولهذا قيل: النفس كالشريك الخوّان، إن لم تحاسبه ذهب بمالك.

وقال ميمون بن مهران أيضًا: "إنّ المتقي أشدُّ محاسبةً لنفسه من سلطان عَاصٍ، ومن شريك شحيح"[1]

ترجمہ:"حسن بصریؒ نے فرمایا کہ :بندہ اس وقت تک خیر پر رہتاہے جب تک اس کاضمیراسے خبر دار کرتارہے اوراپنے محاسبہ کااہتمام کرتارہے۔حضرت میمون بن مہرانؒ نے فرمایا کہ:بندہ اس وقت متقی نہیں بن سکتاجب تک کہ وہ اپنے شریک سے زیادہ اپنے نفس کے ساتھ حساب کتاب کرنے والانہ بنے،اسی وجہ سے کہا گیا کہ:نفس خیانت دار شریک کی طرح ہے اگر تم اس کے ساتھ حساب کتاب نہ کرو،تووہ تمہارے مال کوہڑپ کرجائے گا۔

حضرت میمون بن مہرانؒ نے فرمایا کہ:متقی انسان،نافرمان سلطان اور بخیل شریکِ کار سے اپنے نفس کازیادہ سخت احتساب کرنے والاہوتاہے"

---

[1] موارد الظمآن لدروس الزمان: الفَصْلٌ الحادي عشرفي محاسبة النفس، ج١ص ١٩٠.

محاسبہ کی غیر اہمیت اور فوائد

۱: اصلاح نفس کا یہ بڑا خاموش اور مؤثر ذریعہ ہے، بہت سے سلف صالحین کا یہ معمول رہا ہے۔

۲: اس سے اپنی غلطیوں کا خود ہی احساس پیدا ہو جاتا ہے اور احساس ہی ترقی و کامیابی کی بنیاد ہے، غلطی کے احساس ہو جانے کے بعد ہی اس کی درستگی کرنے اور ترقی کرنے کی فکر پیدا ہوتی ہے۔

۳: خود احتسابی کے اس عمل میں انسان کو اپنی بعض ایسی کوتاہیاں بھی نظر آتی ہیں جن سے دوسرا آدمی واقف نہیں ہوتا۔ نیز دوسرے شخص کے بتانے کی صورت میں اکثر عدم تحمل، بے اعتمادی اور بدگمانی جیسے عوامل آڑے آجاتے ہیں جن کی وجہ سے یا تو اپنی غلطی کا یقین نہیں ہوتا اور یا معلوم ہو جانے کے بعد اصلاح کی توفیق میسر نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات بحث و مباحثہ اور اپنے دفاع کرنے کی بھی نوبت آجاتی ہے جس سے فائدے کی بجائے دوہرا نقصان ہو جاتا ہے، جبکہ خود احتسابی میں ان نقصانات کا تصور نہیں ہوتا۔

البتہ بعض کمزوریاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا خود احساس نہیں ہوتا، اس لئے محض اس پر اکتفاء کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ کسی خیر خواہ، صاف دل اور تجربہ کار شخصیت کے ساتھ خصوصی تعلق بنا کر استفادہ کر لینا از بس مفید ہے۔

محاسبہ کا مناسب طریقہ کار

اگر کسی شخص کو شراکتی کاروبار میں مجبوری کی وجہ سے کسی ایسے شریک کے ساتھ واسطہ پڑے جو حد درجہ نالائق اور خائن و کوتاہ ہو اور پہلے بھی وہ دسیوں

کے ساتھ خیانت کرکے ان کو دیوالیہ بناچکا ہو تو ایسے شخص کے ساتھ شراکت کرنے کی محتاط صورت یہی ہے اور اسی کو لوگ اختیار کرتے ہیں کہ اوّلاً اس کے ساتھ تمام تر باتیں طے کریں،اس کے بعد اس کی اچھی طرح نگرانی کرتے رہیں، مناسب مدت میں پورا پورا حساب بے باق کرتے رہیں، معمولی غلطی ہو جائے تو ڈانٹ ڈپٹ سے کام لے کر سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے اور بڑی جسارت کرے تو ساتھ جرمانہ یا سزا بھی تجویز کی جاتی ہے،اگر کوئی خیانت کر ہی ڈالے تو یوں اس کو نہیں چھوڑتے بلکہ اس کو کسی نہ کسی مشقت میں ڈالتے ہیں تا کہ آئندہ ایسی جرأت نہ کرسکے۔بس یہی حال نفس کا بھی ہے کہ عقل کی مثال راہ آخرت کے تاجر کی سی ہے اور نفس انسانی اس کا خواہی نخواہی شریک ہے جو حد درجہ نالائق اور کام چور واقع ہوا ہے،اب اس کے ساتھ کام کرنے کا طریقہ کار یہی ہے کہ کامیاب وہوشیار تاجر کی طرح درج بالا تمام باتوں کا اہتمام کیا جائے ورنہ اس سے غافل رہنا یا اسی پر اعتماد کرنا ہلاکت وخسارے ہی کا باعث ہے،لہٰذا محاسبہ کا طریقہ کار یہی ہے کہ:

الف:دن کے پہلے حصہ میں نفس کے ساتھ تمام باتیں طے کی جائیں کہ کونسے کام کرنے ہیں اور کن سے رکنا ہے؟ اور جن کاموں کو انجام دینا ہے،ان کے کرنے کا طریقہ کار کیا ہوگا؟اور کرنے کی نیت کیا ہوگی؟اس کو" مشارطہ" کہا جاتا ہے۔

ب:اس کے بعد کام کرتے وقت دھیان رکھے کہ معاہدے اور شرائط کے مطابق کام چل رہا ہے یا نہیں؟اس عمل کو بعض اوقات" مراقبہ" کہہ دیا جاتا ہے۔

ج:رات یا کوئی بھی مناسب وقت مقرر کرلے اوراس میں نفس کے ساتھ تمام اعمال کا حساب وکتاب کرلے کہ کتنی باتوں کی پابندی ہوئی اور کہاں کہاں طے شدہ شرائط کی خلاف ورزی کی گئی؟اس کو"محاسبہ"سے تعبیر کیاجاتاہے۔

د:غلطی اگر معمولی ہوئی تو نفس کو ندامت دینا بھی کافی ہو جاتاہے اور غلطی اگر زیادہ ہو تو اس کو اچھی طرح سزا دینی چاہئے،مثلاً بد نظری ہوتی ہے تو ایک آدھ رات سونے نہ دے، حرام مال کھانے کی بیماری ہو تو کچھ وقت بھوکا رہنے دے،حرام مال حاصل کرنے کی ہوس ہو تو تکلف کے ساتھ صدقہ کرتا رہے،وغیرہ۔اس کو"معاتبہ"اور"معاقبہ"بھی کہاجاتاہے۔

ر: اگر نفس پر اس طرح قابو پالینا مشکل ہو اور پابندی کے ساتھ محاسبہ کرنے کے باوجود بھی اس کے اقدام وکردار میں کوئی بہتری نہ آرہی ہو تو ایسی صورت میں مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہے جس کی مختلف صورتیں ہیں،ان میں نفس پر جو چیز زیادہ بھاری ہو،اس کو ریاضت وتکلف کے ساتھ کرتارہے اور کھانے پینے کو بھی کم کردے،اس سے رفتہ رفتہ سدھار آئے گی اور نفس کمزور ہو کر اصلاحات قبول کرنے پر مجبور ہوتارہے گا ان شاء اللہ۔اس کو"مجاہدہ"کہاجاتاہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

✓ باب پنجم: انکار تصوف اور اس کا پس منظر

✓ تصوف کے خلاف لکھی گئی کتابیں

✓ اشکالات واعتراضات

✓ چند تنقیحات

✓ اشکالات کے جوابات

✓ ناقدین کی کوتاہیاں

✓ موجودہ خانقاہی نظام کی تباہی کے اسباب

✓ راہ تصوف اور تطہیر کی ضرورت

✓ اصلاح تصوف کا تسلسل

✓ ائمہ تصوف کی اصلاحی کوششیں

باب پنجم:

انکارِ تصوف اور اس کا پس منظر

دیگر تمام علوم وفنون کی طرح تصوف بھی ایک علم ہے جو عہد رسالت اور دور صحابہ میں اپنے تمام تر اصول وفروع کے ساتھ رائج نہ تھا کہ اس دور میں اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے بعد جس طرح دیگر علوم وفنون کے دواعی واسباب پیدا ہوتے گئے، ان کے نتیجے میں علوم فنون کی ترتیب وتدوین ہونے لگی اور تدریج کے ساتھ باقاعدہ منضبط اور جامع شکل میں علوم ڈھلنے شروع ہوئے، یوں ہی تصوف وسلوک بھی ان ارتقائی منازل سے طے ہوتا ہوا ایک کامل اور جامع علم کی شکل اختیار کرتا رہا، البتہ تصوف میں چونکہ زیادہ تر کام عملی ہوتا ہے اور صحیح معنٰی میں جو افراد اس سے وابستہ ہو جاتے ہیں، ان پر فنائیت اور خمول کا عنصر غالب ہوتا ہے، اس لئے دیگر فنون کی بنسبت تصوف میں تالیفی کام نے کچھ زیادہ تیزی نہیں دکھائی، اس باب میں کچھ زیادہ تالیف وتصنیف کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی، تاہم وقتی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے مختلف ادوار میں کچھ کتابیں تیار ہوتی گئیں۔

صدیوں کی تاریخ کا عبوری جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ علم کلام وفقہ کی طرح علم تصوف کے عنوان کے تحت بھی مختلف ادوار میں ایسے افراد میدان میں آئے جنہوں نے اس جھنڈے تلے بہت سے ایسے کام کئے جو قرآن وسنت سے متصادم تھے لیکن عہد بہ عہد مختلف طریقوں سے اس کی تردید وتنقید بھی ہوتی رہی

، تاہم ناقد صوفیاء کی خمول وگمنامی کی وجہ سے یہ تنقیدی اور اصلاحی کوششیں زیادہ ابھر کر سامنے نہیں آسکیں اوراس کی بنسبت گمراہ اعمال وافکار کو مختلف حلقوں کی جانب سے اپنے اپنے اہداف کے لئے کچھ زیادہ ہی ہوا دیا جانے لگا جس کے نتیجے میں امت کے ایک بڑے طبقے میں اس علم کے حوالہ سے شکوک وشبہات پیدا ہو گئے، پھر عملی طور پر دوری ہو جانے کی وجہ سے ان شکوک نے ترقی کر کے بدگمانیوں کی صورت اختیار کر لی اور پھر ان بدگمانیوں نے آگے بڑھتے ہوئے انکار اور ردود ونقود کی صورت روپ لی۔

یہ اس کائنات کی فطری اور انسان کا نفسیاتی سفر ہے کہ پہلے کسی چیز کے بارے میں شبہات جنم لیتے ہیں، اگر بروقت اس کی صفائی ستھرائی نہ کی جائے تو بدگمانیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے مقابلے میں انسان غرق یاب ہو جاتا ہے اور بہت سی دوریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر اسی حالت پر رہا جائے تو یہی چیز پھر فکر و نظریے کی صورت میں رونما ہو جاتی ہے۔

علم تصوف کے حوالہ سے بھی یہی کچھ ہوا۔ دوسری طرف بعض صوفیاء کرام کے شطحیات وغیرہ عناصر نے اس پر تیل چھڑکنے کا کام کیا اور یہی سے ناقدین کے انکار ونقد میں مزید قوت واستحکام پیدا ہوتا رہا۔ اسی کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دی رہی ہے بلکہ موجودہ دور میں سطحیت وجذباتیت کے غلبہ، خود پسندی اور بدگمانی کے بڑھنے ہوئے رجحانات نے اس میں کہیں زیادہ اضافہ کیا ہے۔

تصوف کے خلاف لکھی گئی چند کتابیں

ان حضرات کی ایک طویل فہرست ہے جو مختلف ادوار میں اخلاص واصلاح کے جذبے عنوان سے لیکن گہرے غلط فہمیوں کی وجہ سے تصوف پر انکار وتنقید کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں ، اس وقت اس ناکارہ کے سامنے درج ذیل کتابیں موجود ہیں:

ا: درسات فی التصوف ۔ یہ حضرت مولانا احسان الہی ظہیر رحمہ اللہ کی کتاب ہے۔

۲: التصوف: المنشا والمصدر۔ یہ بھی حضرت مولانا احسان الہی ظہیر رحمہ اللہ کی کتاب ہے۔

۳: شریعت وطریقت۔ مولانا عبد الرحمن کیلانی صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ہے۔

۴: بدع الاعتقاد واخطارہا علی المجتمعات المعاصرۃ۔ شیخ محمد حامد الناصر کی کتاب ہے۔

۵: فضائح الصوفیہ۔ شیخ عبد الرحمن بن عبد الخالق الیوسف کی کتاب ہے۔

۶: الفکر الصوفی فی ضوء الکتاب والسنۃ۔ یہ بھی شیخ عبد الرحمن بن عبد الخالق الیوسف کی کتاب ہے۔

۷: دینِ تصوف۔ یہ جناب محمد فہد حارث کی تدوین کردہ کتاب ہے جس میں مولانا عبد الرحمن کیلانی، مولانا احسان الہی ظہیر، جناب مسعود الدین عثمانی، پروفیسر سلیم چشتی صاحب اور جناب عزیر سلفی مبارکپوری صاحبان کی وہ تحریرات درج ہیں جس میں تصوف پر نقد اوراس کی تردید کی گئی ہے۔

اشکالات واعتراضات کی تنقیح

بظاہر یہ تمام کتابیں، اس ناکارہ کا حسن ظن یہی ہے، خلوص اور تدین کے جذبے سے لکھی گئی ہیں اور لکھنے والوں کو دینِ اسلام میں ایک مذموم چیز کا اضافہ محسوس ہونے لگا تو دینی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس چیز کو دفع کرنے کی کوشش فرمائی ہیں، اس حد تک تو بات درست اور قابلِ تعریف ہے۔ ملت کے بہی خواہوں کا یہی کردار ہونا چاہئے کہ وہ چوکنا اور ہوشیار چوکیدار کی طرح دین کی عمارت کو ہر آنے والے فتنے کی ضد سے محفوظ رکھیں اور کسی بھی راستے سے آنے والے چور سے بھرپور مزاحمت کریں۔

لیکن یہاں یہ چیز مقصود نہیں ہے، یہاں تو ان حضرات کی تحریرات وتنقیدات کا جائزہ لینا مقصود ہے کہ تصوف کے حوالے سے ان حضرات کے اشکالات کس حد تک درست ہیں؟ اور کیا تصوف واقعۃً ایک مذموم وممنوع چیز ہے! ان تمام تحریرات کو اگر چھان بین کر کے منقح کیا جائے تو درجِ ذیل اشکالات سامنے آتے ہیں:

۱: تصوف بدعت ہے، کیونکہ دور سلف میں اس کا اہتمام نہیں تھا۔

۲: تصوف، یہودیت، نصرانیت، شیعیت یا یونانی فلسفہ کا ملغوبہ ہے جس کا اسلام اور قرآن وسنت سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت اسلام کی سرزمین پر ایک بیرونی پودے کی ہے۔

۳: یہ دینی اور اسلامی عقائد ونظریات بلکہ پورے ہی دین اسلام کے خلاف ایک یلغار ہے۔ اس میں باطنی تاویل، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود وغیرہ مباحث

ومسائل سے استدلال کیا جاتا ہے، چنانچہ سطور بالا میں تصوف کی تردید میں لکھی گئی جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں نمبر ۵ پر جو کتاب ذکر کی گئی ہے، اس کی ایک عبارت درج ذیل ہے:

أول ما يستهدف الفكر الصوفي إتلافه وتبديله هو العقيدة الإسلامية النقية عقيدة الكتاب والسنة، وذلك أن: الفكر الصوفي خليط كامل لكل الفلسفات والخزعبلات والخرافات التي انتشرت في العالم قديماً وحديثاً. فليس هناك من كفر وزندقة وإلحاد إلا دخل الى الفكر الصوفي وتلبس بالعقيدة الصوفية. فمن القول بوحدة الوجود وأن كل موجود هو الله، إلى القول بحلول ذات الله أو صفاته في المخلوقين، إلى القول بالعصمة، إلى الزعم بالتلقي من الغيب، إلى القول بأن محمداً صلى الله عليه وسلم هو قبة العالم وهو المستوي على عرش الله، إلى القول بأن الأولياء يديرون العالم ويتحكمون في الكون.[1]

ترجمہ: "تصوّف دنیا بھر میں پھیلی قدیم وجدید بے ہودہ فلسفی خیالات وخرافات کا مربع اور اچار ہے اس لئے تصوّف سب سے پہلے جس چیز کو ہدف بناتا ہے وہ کتاب وسنت کا پاکیزہ اسلامی عقیدہ ہے کہ اس کو برباد اور تبدیل کردے، پس کفروزندقہ اور الحاد کی کوئی شکل ایسی نہیں، جو تصوّف میں داخل نہ ہوئی ہو اور صوفیانہ خیالات کا لبادہ نہ اوڑھا ہو۔ وحدۃ الوجود اور یہ کہ ہر موجود ہی اللہ ہے، سے لے کر یہاں تک کہہ

---

[1] فضائح الصوفية،الباب الاول مخاطر الفكر الصوفي، ج١ص٢٢.

جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات مخلوق میں حلول کرتی ہیں، اولیاء معصوم ہوتے ہیں، ان کو غیب کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، محمد ﷺ کائنات کا مرکز ہے اور وہ اللہ کے عرش پر مستوی ہے اور یہاں تک کہتے ہیں کہ اولیاء اس عالم کو چلاتے ہیں اور کائنات میں فیصلے کرتے ہیں"۔

اس کے بعد پھر اپنی ہی ان باتوں کا خلاصہ نکال کر صوفیاء کو میدان مبارزت میں قدم رکھنے کی دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وأستطيع أن أقول أنه لا توجد عقيدة شركية في الأرض إلا وقد نقلت إلى الفكر الصوفي، وأُلبست الآيات والأحاديث. بل أنني أتحدىٰ أي صوفي يعلم ما هو التصوف أن يثبت لي حسب عقيدته، أن إبليس كافر وأنه من أهل النار، وأن فرعون كافر وأنه من أهل النار!! وأن الذين عبدوا العجل من بني إسرائيل أخطئوا، وأن الذين يعبدون البقر الآن كفار، أتحدىٰ أي صوفي يعلم حقيقة التصوف أن يثبت ذلك.[1]

ترجمہ: "میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ روئے زمین پر کوئی شرکیہ عقیدہ ایسا نہیں ہے جو تصوّف میں ضم نہ ہوا ہو اور اسے آیات و احادیث سے چھپایا نہ گیا ہو، بلکہ میں ہر اس صوفی کو چیلنج کرتا ہوں جو تصوّف کی حقیقت سے واقف ہو کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق یہ ثابت کرے کہ ابلیس کافر ہے اور وہ اہل النار میں سے ہے، اور فرعون کافر ہے اور اہل النار میں سے ہے، بنی اسرائیل میں سے جن نے بچھڑے کی پوجا کی

[1] فضائح الصوفية،إتلاف العقيدة الإسلامية،ص: ٢١.

انہوں نے غلطی کی، جو آج گائے کو پوجتے ہیں وہ کافر ہیں، میں چیلنج کرتا ہو جو بھی تصوّف کی حقیقت سے واقف ہو کہ وہ یہ باتیں ثابت کردے"۔

۴: تصوف عملی اور تحریکی زندگی میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے جو مسلمانوں کو راہ عمل سے کاٹ کر تنہائی پر اکساتی ہے۔

۵: تصوف، مذموم رہبانیت کی ایک شکل ہے۔

اشکالات کے جوابات

یہاں ان تمام اشکالات کا ایک اصولی جائزہ لیا جاتا ہے تا کہ اصل حقیقت تک رسائی ہو سکے۔

پہلا اشکال: تصوف بدعت ہے؟

بنیادی اور اساسی اشکال یہی ہے اور بدعت کی تردید و تنقید میں عام طور پر اسی کو دہرایا جاتا ہے۔ اس اشکال کا بہت مختصر جواب یہ ہے کہ تصوف تو دیگر علوم وفنون کی طرح ایک علم وفن ہے، اس کو اگر بدعت قرار دیا جاتا ہے تو اس میں دو باتوں کی تنقیح ضروری ہے:

الف: اس میں آخر وہ کونسی چیز ہے جس کو بدعت ٹھہرایا جارہا ہے؟

ب: بدعت ہونے کی بنیاد واساس کیا ہے؟ کس بناء پر بدعت ہونے کا حکم لگایا جارہا ہے؟

تصوف کے بدعت ہونے کی بنیاد کیا ہے؟ اس میں درج ذیل احتمال ہیں:

۱: تصوف کا نام اور اصطلاحات بدعت ہے۔ یہ بنیاد اس لئے درست نہیں ہو سکتا کہ:

الف: بدعت کا تعلق تو دینی احکام ومسائل کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس میں کسی دلیل شرعی کے بغیر اضافہ کیا جائے، جبکہ نام اور مصطلحات کوئی دینی احکام نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام اہل فن کے ہاں یہ مسلم ہے کہ: "لامشاحۃ فی الاصطلاح"۔

ب: اگر اس کو درست تسلیم کرلیا جائے تو یہ اشکال صرف بے چارے تصوف ہی پر نہیں ہوتا بلکہ تمام علوم وفنون پر یہی اشکال ہوتا ہے۔

۲: تصوف کے مبادی: مثلاً بیعت اور مجاہدات وغیرہ۔ یہ بنیاد بھی غلط ہے کیونکہ:

الف: بیعت خود متعدد روایات سے ثابت ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے رسالہ "القول الجمیل" میں بعض وہ روایات مذکور ہیں، اس کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔اسی طرح خود حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بعض مجاہدات ثابت ہیں۔ ثبوت کے بعد کسی چیز کو کیونکر بدعت قرار دیا جاسکتا ہے؟

ب: اگر تسلیم کرلیا جائے کہ یہ چیزیں روایات سے ثابت نہیں ہیں اور دورِ سلف میں بھی ان کا وجود نہ تھا تو بھی صرف اتنی بات کسی چیز کے بدعت قرار دینے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسی غیر ثابت چیز کو دینی حکم کا درجہ دیا جائے جبکہ یہ چیز تصوف میں مقصود نہیں ہیں بلکہ مبادی ہیں جن کو اصل مقصود کے حاصل کرنے لئے ایک ذریعے اور وسیلے کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔

۳: تصوف کے مقاصد واہداف:

تصوف کا مقصود یہ ہے کہ ظاہری اعمال پر اچھی طرح استقامت نصیب ہو جائے ،اخلاق حمیدہ سے اپنے آپ کو مزین کیا جائے اور رذیل وممنوع اخلاق وصفات سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔اس ناکارہ کا خیال یہ ہے کہ کوئی ہوش مند انسان اس کو بدعت کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

۴: تصوف کے زوائد ونتائج: مثال کے طور پر کشف صدور، کشف قبور، کشف کونی، اچھے اچھے خواب دیکھنا، کرامات کا صادر ہونا، وغیرہ۔

ان باتوں کو بھی بدعت کی بنیاد بنانا درست نہیں ہے کیونکہ:

الف: یہ چیزیں تصوف کے مقاصد میں سے ہیں نہ ہی تصوف اس پر موقوف ہے بلکہ اکثر چیزیں تو ایسی ہیں جو خود بخود صفائی نفس پر متفرع ہوتی ہیں جن میں انسان کا کوئی خاص عمل ودخل بھی نہیں ہوتا۔

ب: ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو خود نصوص سے ثابت ہیں، چنانچہ نیک لوگوں سے کرامات کا صادر ہوسکنے پر اہل سنت کا اتفاق ہے، قرآن وحدیث کی مختلف نصوص سے یہ ثابت ہے، اس کے تحت کشف بھی داخل ہو جاتا ہے کہ وہ بھی ایک خرقِ عادت چیز ہے۔ اور جو چیزیں صراحت کے ساتھ مذکور نہ بھی ہیں وہ بھی اس لئے بدعت نہیں قرار دی جاسکتیں کہ ان کو کوئی دین کا حصہ نہیں خیال کرتا۔ بعض غالی صوفیوں میں جو اس کے خلاف باتیں رائج ہوتی ہیں، موقع بہ موقع ان کی تردید وتنقید بھی ہوتی رہتی ہیں۔

۵: بعض صوفیاء کرام کے اقوال واعمال۔

بہت سے حضرات کے لئے تصوف پر نقد کرنے کی وجہ یہ بنی کہ انہوں نے تصوف کی کتابوں میں خصوصاً صوفیاء کی طبقات سے متعلق کتابوں میں بہت سے اقوال واعمال دیکھے جو بظاہر قرآن وسنت سے متصادم ہیں اور بعض واقعات ایسے ہیں جن کو عقلِ سلیم بھی درست تسلیم نہیں کر سکتی۔ یہ واقعات چونکہ تصوف کی کتابوں میں مذکور ہوتے ہیں اور جن لوگوں سے متعلق یہ واقعات یا اقوال ذکر کئے جاتے ہیں، ان کی تصوف سے وابستگی بھی معروف ومشہور ہوتی ہے، اس لئے ایک عام قاری یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ تصوف نام ہی ان جیسے امور کا ہے اور پھر پوری خیر خواہی اور نصیحت کے ارادے سے اس پر تنقید کرنا شروع فرما لیتے ہیں۔

اس کے متعلق یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ ان جیسی باتوں کو "شطحیات" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسی باتیں پیش کیوں آتی ہیں؟ تصوف کی کتابوں میں ان کو ذکر کیوں کیا جاتا ہے؟ ان جیسے امور کے متعلق ایک عام مسلمان کو کیا طرزِ عمل اپنا لینی چاہئے؟ کیا فوراً رد وقدح کا رویہ اختیار کرنا بہتر ہے یا تاویل وتوجیہ سے بھی اس سلسلے میں کچھ کام لے لینا چاہئے؟ اکابر امت کا اس حوالہ سے کیا طرزِ عمل رہا ہے؟ ان تمام باتوں سے صرفِ نظر کر کے جو بات یہاں قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ اس چیز کو بھی تصوف کے بدعت یا ممنوع ہونے کی بنیاد بنانا قطعاً غلط ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ:

الف: اگر ان چیزوں کو تصوف کے ممنوع ہونے کی بنیاد بنایا جائے تو پہلے تو اسی نکتے پر غور کرنا ضروری ہے کہ ان چیزوں کا تصوف سے تعلق کس نوعیت کا ہے؟ اگر یہ چیزیں تصوف کے لئے رکن وشرط اور موقوف علیہ کی حیثیت رکھتی ہیں یا

تصوف کے ساتھ ان چیزوں کے لزوم کا رشتہ ہو تب تو بلا شبہ "علم تصوف" پر بھی اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن ہم پوری ذمہ داری سے کہتے ہیں کہ ایسا بالکل نہیں ہے، یہ اشیاء تصوف کے ساتھ کوئی لازم نہیں ہیں اور بہت سے محقق صوفیاء کرام کے ہاں ان چیزوں کا بالکل رواج نہیں ہوتا۔ یہ صرف خوش فہمی نہیں ہے بلکہ آج بھی بہت سے ایسے حضرات ہیں جن کا مشغلہ ہی یہی "علم تصوف" کی خدمت اور لوگوں کے قلوب کا اصلاح وتزکیہ ہے لیکن ان کے ہاں دور دور تک یہ باتیں نہیں دیکھی جاسکتیں۔

ب: تاریخی ذخیرے میں دیگر علوم وفنون سے وابستہ افراد کی بھی بعض باتیں ایسی مل جاتی ہیں جو اپنے ظاہر کے لحاظ سے قطعاً خلاف شریعت ہوتی ہیں لیکن ان کی ذمہ داری متعلقہ علم وفن پر اس لئے عائد نہیں ہو سکتی کہ خود اس فن نے یہ باتیں سکھائی نہ ان کی طرف کوئی ترغیب وہدایت کی ہے۔ تصوف میں دیگر علوم کی بنسبت ایسی چیزیں کچھ زیادہ اس لئے دستیاب ہوتی ہیں کہ یہاں بہت سے حالات میں مختلف عناصر کی وجہ سے انسانی عقل وشعور ہی مغلوب ہو جاتا ہے جس کے بعد وہ مکلف ہی نہیں رہتا۔[1]

---

[1] اس اشکال سے متعلق کچھ مزید تفصیل ناکارہ کی کتاب "فقہ البدعۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ" میں مذکور ہے، اس کی طرف مراجعت کی جائے۔

علامہ شاطبی رحمہ اللہ کی تحقیق

علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے بدعت کی موضوع پر اپنی مفید ومشہور کتاب "اعتصام" میں یہ بحث ذکر فرمائی ہے کہ کیا تصوف کو بدعت کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ بحث کی شروع میں فرماتے ہیں کہ:

وَأَمَّا الْكَلَامُ فِي دَقَائِقِ التَّصَـوُّفِ؛ فَلَيْسَ بِبِدْعَةٍ بِإِطْلَاقٍ، وَلَا هُوَ مِمَّا صَحَّ بِالدَّلِيلِ بِإِطْلَاقٍ.[١]

ترجمہ: "تصوف کی باریکات میں کلام کرنا مطلقا بدعت ہے اور نہ ہی مطلقا صحیح ہے"۔

اس کے بعد تصوف کا مفہوم لکھا ہے کہ ہر اچھے خلق کا حاصل کرنا، ہر بری صفت وخلق سے بچتے رہنا، اور اپنے نفس سے فناء اور رب کے ساتھ بقاء کا مقام حاصل کرنے کا مجموعہ تصوف کہلاتا ہے اور اس میں لحاظ سے اس پر بدعت کا اطلاق کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا، اس کے بعد بڑے کام کی بات ذکر فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

وَلَيْسَ مِنْ شَـأْنِ الْعُلَمَاءِ إِطْلَاقُ لَفْظِ الْبِدْعَةِ عَلَى الْفُرُوعِ الْمُسْـتَنْبَطَةِ الَّتِي لَمْ تَكُنْ فِيمَا سَـلَفَ، وَإِنْ دَقَّتْ مَسَـائِلُهَا، فَكَذَلِكَ لَا يُطْلَقُ عَلَى

---

[١] الاعتصـــام للشـــاطبي ت الهلالي، الْبَابُ الثَّالِثُ ذَمُّ الْبِدَعِ وَالْمُحْدَثَاتِ وَالرَّدُّ عَلَى شُـــبَهِ الْمُبْتَدِعَةِ، ج١ص٣٥٢.

دَقَائِقَ فُرُوعِ الْأَخْلَاقِ الظَّاهِرَةِ وَالْبَاطِنَةِ: أَنَّهَا بِدْعَةٌ؛ لِأَنَّ الْجَمِيعَ يَرْجِعُ إِلَى أُصُولٍ شَرْعِيَّةٍ.[1]

ترجمہ:"وہ مسائل جو بعد میں مستنبط کئے گئے اور پہلے نہیں تھے ان کو بدعت کہنا علماء کے شایانِ شان نہیں، اگرچہ دقیق مسائل ہوں، اسی طرح ظاہری اور باطنی اخلاق سے متعلق باریک مسائل پر بھی بدعت کا اطلاق درست نہیں، اس لئے کہ ان سب کا مرجع اصولِ شریعت ہی ہے"۔

بدعت اور ائمہ تصوف

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اہل سنت وجماعت جس تصوف وسلوک کے قائل اور اس کے حامل وعامل ہیں، وہ بدعات ومنکرات کے ساتھ لمحہ بھر سفر نہیں کر سکتا، اس تصوف اور بدعات کے درمیان کوسوں فاصلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ تصوف وسلوک کے مستند ائمہ کے ہاں بدعت نہایت مذموم اور بہت ہی مکروہ وناپسندیدہ چیز شمار کی جاتی ہے جس کے ہوتے ہوئے تصوف کے تقاضے پایہ تکمیل نہیں پہنچ سکتے۔امام ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اعلموا رحمكم اللهّٰ أن شيوخ هذه الطائفة بنوا قواعد أمرهم عَلَى أصول صحيحة فِي التوحيد صانوا بِهَا عقائدهم عَنِ البدع ودانوا

[1] الاعتصام للشاطبي ت الهلالي، الْبَابُ الثَّالِثُ ذَمُّ الْبِدَعِ وَالْمُحْدَثَاتِ وَالرَّدُّ عَلَى شُبَهِ الْمُبْتَدِعَةِ-ج۱ص۲٦٥.

بِمَا وجدوا عَلَيْهِ السلف وأهل السنة من توحيد لَيْسَ فِيهِ تمثيل ولا تعطيل وعرفوا مَا هُوَ حق القدم-[1]

ترجمہ: "جان لو! کہ اس گروہ کے مشائخ نے اپنے قواعد کو توحید کے صحیح اصول پر بنائے ہیں، جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے عقائد کو بدعات سے محفوظ کئے، اہل سنت والجماعت اور سلف صالحین کی تعلیمات کو اپنا دین بنایا یعنی ایسی توحید جس میں تمثیل وتعطیل نہیں اور وہ جان گئے کہ حق قدم کیا ہے"۔

دوسرے اشکال کا جواب

کیا تصوف کا پوداد یگر ادیان سے بر آمد ہوا؟

تصوف کے حوالے سے ناقدین حضرات کا دوسرا اشکال یہ ہے کہ تصوف، یہودیت، نصرانیت، شیعیت یا یونانی فلسفہ کا ملغوبہ ہے جس کا اسلام اور قرآن وسنت سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت سرزمین اسلام پر ایک بیرونی پودے کی ہے۔

در حقیقت اس اشکال کی بنیاد بھی وہی بات ہے جو سابقہ اشکال کے تحت ذکر کی گئی ہے کہ تصوف دور سلف میں رائج نہیں تھا بلکہ بعد کے زمانے کی پیدوار ہے، یہودی وشیعہ وغیرہ گمراہ لوگوں ہی کے ہاتھوں اس کی تخم ریزی کی گئی اور انہی کی بدولت یہ فن پروان چڑھاہے۔ اس سلسلہ میں دور اول کے مختلف صوفیاء کرام کے نام بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں کہ وہ بعض الحادی نظریات کے حامل تھے، کسی میں تشیع کے اثرات تھے اور کسی میں ہندومت وغیرہ کے نشانات بتائے جاتے ہیں،

---

[1] الرسالة القشيرية، فصل: فِي بيان اعتقاد هذه الطائفة فِي مسائل الأصول ،ج١ص ١٩.

مولانا احسان الٰہی ظہیر صاحب مرحوم نے تصوف اپنے نقد میں اس طرح مختلف صوفیاء کرام کا نام لے کر یہ نتیجہ نکالا ہے۔

لیکن یہ اشکال بھی چنداں مفید نہیں ہے کیونکہ:

الف: اس دعویٰ کے ثبوت کے لئے جو استدلالات کئے جاتے ہیں، وہ کسی طرح تسلی بخش نہیں ہوتے۔ دور دور کے قرائن کو لے کر ان کو اپنے دعویٰ پر منطبق کرنے کی ضرورت عموماً اسی وقت پیش آتی ہے جہاں پہلے سے کسی غلط فہمی وغیرہ کے ماحول میں دعویٰ قائم کیا جاتا ہے اور ایک موقف اپنایا جاتا ہے، اس کے بعد اس کے لئے دلائل و قرائن کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ طرز عمل اصولی لحاظ سے قطعاً غلط اور سخت مضر ہے۔ اس کے نتیجے میں جو نقصانات اور غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ اپنی جگہ، لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اس موڑ پر پہنچ کر دلائل بھی اپنی حیثیت کھو جاتے ہیں اور وہ "دلیل" کی بجائے "مدلول" کی روپ اختیار کر لیتے ہیں، اس لئے ایسے ماحول میں اگر قرآن و سنت کے نصوص سے بھی استدلال کیا جائے تو بھی وہ اس حیثیت سے نہیں کہ یہ حجت اور دلیل راہ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ دعویٰ سے موافقت رکھتے ہیں۔

ب: علم تصوف دیگر علوم وفنون کی طرح کسی خاص شخص یا طبقے اور ان کے اقوال واعمال کا نام نہیں ہے بلکہ باقاعدہ ایک فن ہے اور تمام فنون کی طرح اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: مبادی۔ مقاصد اور زوائد وتوابع۔ اگر ان تین حصوں میں سے کہیں کوئی چیز خلاف شریعت ہو تو وہ ضرور قابلِ اشکال ہونی چاہئے اور اس کی اصلاح ودرستگی اور (اگر نہ ہوسکے تو) تردید وتنقید اہلِ علم کی ذمہ داری

اور ان کا فرض منصبی ہے۔ لیکن اگر ان تین چیزوں میں کوئی واقعی شرعی خامی موجود نہ ہو تو محض وابستہ افراد کی باتوں یا کردار کو اگر غلط تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی وہ افراد خود اپنے عمل کے ذمہ دار ہیں، متعلقہ فن پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ چنانچہ اگر متکلم، فقیہ و مفتی یا محدث و مؤرخ ایسا گفتار و کردار اختیار کرتا ہے جس کی شرعاً اجازت نہ ہو تو اس کی وجہ سے علم کلام وفقہ پر کوئی حرف آسکتا ہے اور نہ ہی علم حدیث و تاریخ کو ہدف تنقید وملامت ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ بس کچھ یہی صورت حال علم تصوف کی بھی ہے۔

ج: اگر بعض انتظامی نوعیت کی باتوں میں گمراہ لوگوں یا ان کے طریقہ کار کی مماثلت لازم آئے تو ان کی وجہ سے پورے فن کو ناجائز یا ممنوع قرار دینا بالکل درست نہیں، مثال کے طور پر یکسوئی حاصل کرنے کے لئے خلوت کا اختیار کرنا مفید ہے۔ یہ ایک معقول اور تجربہ کی بات ہے، اب یہ چیز اگر شیعوں یا ہندو کے ہاں رائج ہو اور تصوف میں بھی اس کو اختیار کیا جاتا ہو تو اس کو ناجائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس کو اگر ناجائز کہا جائے تو "کفار وفساق کے ساتھ تشبہ" کا مسئلہ ہی اس کی بنیاد ہو گا، لیکن وہاں منع و حرمت کے لئے جن شرائط کا ہونا ضروری ہے، وہ ان جیسے امور میں مفقود ہیں، اس لئے محض اتنی سی بات کو لے کر پورے علم و فن کو شیعہ یا ہندو بنانا کسی طرح قرینِ انصاف نہیں ہے۔

د: بعض اہل نظر کی تحقیق یہ ہے کہ یہ دنیائے اسلام میں سلوک و تصوف سے جیسے اہم شعبہ کے خلاف یہ پروپیگنڈہ مغرب یا وہاں کے افکار و تعلیمات سے بر آمد ہوا ہے، مغرب کے شاطر دماغ نے مسلمانوں کے درمیان اس کو فروغ

دیاہے،جناب حسن عسکری مرحوم اپنی مفید کتاب" جدیدیت "میں مغربی گمراہیوں کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"ہر دین کے ہر پہلو میں دوسرے ملکوں، قوموں اور مذاہب کے اثرات تلاش کرنا، مثلا یہ کہنا کہ مسلمانوں میں تصوف ایرانیوں یا ہندوؤں کے اثر سے آیا۔"[1]

تیسرے اشکال کا جواب

کیا تصوف دین اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے؟

تیسرا اشکال یہ ذکر کیا گیا تھا کہ یہ تصوف دینی اور اسلامی عقائد و نظریات بلکہ پورے ہی دین اسلام کے خلاف ایک یلغار ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ:

الف: یہ اٹکل کی بات ہے جس کی بنیاد کسی واقعی علمی حقیقت پر نہیں ہے بلکہ ساری ہی عمارت بدگمانی اور سطحیت پر کھڑی ہے۔ چنانچہ بعض صوفیوں کے مشتبہ افعال و حرکات دیکھ سن کر، یا تصوف کی کتابوں میں اس نوعیت کی روایات دیکھ یہ قیاس آرائی کی جاتی ہے جن میں ائمہ اہل بیت، یا حضرت سید علی مرتضی رضی اللہ عنہم کے فضائل و مناقب ذکر کئے جاتے ہیں، اسی طرح تصوف کے بعض سلاسل کا ان حضرات کی وساطت سے چل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ختم ہونا بھی ان قرائن میں سے گنا جاتا ہے جن کی ناتواں پشت پر اتنی بڑی عمارت استوار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

---

[1] جدیدیت، ص۱۱۹.

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اگر خود علم تصوف کی تردید و تنقید مقصود ہو اور اسی میں یہ خامی ہو جو اوپر اشکال کے طور پر ذکر کی گئی ہے تو خود تصوف کے اجزء وارکان اور اسی کے بنیادی ڈھانچے میں کسی ایسے جزء کی نشاندہی کی جائے جو قرآن و سنت کی تعلیمات سے واضح طور پر متصادم ہو اور اس سے شیعیت یا کسی بھی گمراہانہ نظریہ ومذہب کو تقویت ملتی ہو۔

جن روایات یا واقعات کی بنیاد پر اتنا بڑا اور بے رحم فیصلہ کیا جاتا ہے، وہ صحیح اور ثابت ہیں یا نہیں؟ ان کا تصوف سے کس درجے اور کس نوعیت کا تعلق ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر علماء اہل بیت کے حوالے سے اہل سنت کا موقف کیا ہے؟ کیا ان سے اگر رشد وہدایت کا کوئی سلسلہ جاری ہو جائے تو اس میں کچھ مضائقہ ہے؟ کیا اس سے بہر حال دیگر حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں کوئی نقص وعیب لازم آتا ہے؟ ان تمام باتوں سے نظر بچا بچا کر بھی اگر اوپر درج کی گئی بات کو بنظر انصاف دیکھا جائے تو ان شاء اللہ بات صاف ہو جائے گی۔

ہندوستان کی تاریخ سے جو حضرات واقف ہیں، وہ اگر ایسی بات کریں تو سخت حیرت واستعجاب ہوتا ہے کیونکہ ہندوستان کی سطح پر جب بھی تشیع کے فتنے کو غالب کرنے کی کوشش کی گئی تو نمایاں طور پر میدان مبارزہ میں وہی لوگ اترے ہیں جو تصوف وسلوک کے گلی کوچے صرف قائل اور مدح خواں ہی نہیں، بلکہ اس کے قائد ورہبر اور اس کے پُر جوش داعی تھے، حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتّی، حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے

اولاد واحفاد اور تلامذہ ومتعلقین وغیرہ کی تاریخ اور علمی و عملی سطح پر ان کے کار ناموں کو دیکھ کر اس بات کی پوری پوری تصدیق ہو سکتی ہے۔

ب: غور کیا جائے تو یہ کوئی مستقل اشکال نہیں ہے اور سابقہ دونوں اشکالات کے جواب میں جو باتیں ذکر کی گئیں ہیں، ان کو یہاں بھی مستحضر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بات بھی بے دلیل ہونے کی وجہ سے مفید دعویٰ اور مثبتِ مدّعیٰ نہیں ہے۔ اس میں مزید جو غلطی جھلک کر دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ تصوف کی حیثیت اور اس کا دائرہ کار نظروں سے اوجھل ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ تصوف کا عقائد کے ساتھ تعلق نہیں ہے بلکہ اس کے لئے تو مستقل علم "علم الکلام والعقائد" موجود ہے اور صحیح یا غلط عقائد کے فرق وامتیاز کا میدان وہی ہے۔ تصوف کی راہ طے کرنے کے لئے نئے عقائد اختیار کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی پہلے سے چلے آئے عقائد میں کسی ایسی ترمیم کی حاجت ہے جو قرآن وسنت اور ان کے نصوص سے مستفاد علم کلام کے تقاضا واصول سے متصادم ہو۔

لہٰذا اب اگر کوئی شخص اعتقادی بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ اس کی اپنی غلطی، کمزوری اور محرومی ہے جو کبھی تو بدنیتی سے پیدا ہوتا ہے اور کبھی صحیح عقائد میں ناپختگی وغیرہ عناصر اس کا سبب بن جاتے ہیں۔ لیکن بہر حال جب علم تصوف نے اس کو اس اعتقادی گمراہی کا راستہ نہیں دکھلایا تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ فقہائے حنفیہ وشافعیہ میں بہت سے حضرات مختلف مسائل میں مسلک اعتزال کا موقف رکھتے ہیں، یا فقہائے حنابلہ میں بہت سے حضرات "عقیدہ

تشبیہ و تجسیم" کی طرف گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی اس اقدام کی وجہ سے فقہ حنفی وغیرہ پر کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔

ج: یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ شاہراہ تصوف پر چلنے والے کچھ لوگ ایسی گمراہیوں کے شکار ہوئے ہیں تو بھی خود علم تصوف اس گمراہی کے لئے علت یا سبب کا درجہ نہیں رکھتی جو اس کو مدار گمراہی قرار دیکر قصور وار ٹھہرایا جائے، ورنہ تو ضروری تھا کہ اس راہ پر چلنے والے تمام یا کم از کم اکثر افراد ایسے ہی گمراہی کے دلدل میں پھنس جائیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں ایسے افراد کی تعداد بہت کم ہے جو تصوف سے واقعی اور قابل ذکر حد تک اشتغال کے باوجود گمراہانہ عقائد میں مبتلا ہوئے ہوں اور اکثریت ایسے ہی افراد کی نظر آتی ہے جو یا تو پہلے کی طرح درست اور صحیح عقائد کے ساتھ ساتھ راہ سلوک پر گامزن رہے اور یا خود تصوف کے ساتھ اشتغال کی وجہ سے ان کے فاسد عقائد میں تبدیلی پیدا ہوئی اور سابقہ نظریات وافکار سے توبہ تائب ہوئے۔

ائمہ تصوف اور اتباع سنت

د: اس سلسلہ میں انصاف واعتدال کی بات یہ ہے کہ ائمہ تصوف کی تعلیمات وہدایات کو دیکھا جائے، ان کے کردار وگفتار کی جانچ پڑتال کی جائے اور اسی کے نتیجہ میں کوئی دیانت دارانہ فیصلہ کیا جائے۔ سلوک وتصوف کے تمام مستند ائمہ کی مستند تعلیمات کو دیکھا جائے تو وہ قرآن وسنت کے اتباع کرنے اور ہر قیمت پر اس کی پیروی کرتے رہنے کی خوب تاکید کرتے رہتے ہیں، یہاں مثال کے طور پر چند

مشاہیر تصوف کے اقوال ذکر کئے جاتے ہیں۔ امام قشیری رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ حضرت ابویزید رحمہ اللہ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ:

لو نظرتہم إِلَىٰ رجل أعطي من الكرامات حَتَّىٰ يرتقىٰ فِي الهواء فلا تغتروا بِهِ حتي تنظروا كَيْفَ تجدونه عِنْدَ الأمر والنهىٰ وحفظ الحدود وأداء الشريعة.[1]

ترجمہ: اگر تم کسی آدمی کو دیکھو کہ اس کو ایسی کرامتیں دی گئی ہیں کہ ہواء میں اُڑتا ہے تو اس سے دھوکہ نہ کھاؤ یہاں تک کہ تم اس کو اوامر اور نواہی شریعت کے حدود اور شریعت پر عمل کے وقت نہ دیکھو کہ ان اوقات میں تم اس کو کیسا پاتے ہو"۔

اس کے بعد اپنے سند کے ساتھ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

قَالَ أَبُو سُلَيْمَان الداراني: رُبَّمَا يقع فِي قلبي النكتة من نكت الْقَوْم أياما فلا أقبل منه إلا بشاهدين عدلين الكتاب والسنة[2]

ترجمہ: "ابو سلیمان دارانیؒ نے فرمایا: بعض اوقات میرے دل میں صوفیاء کی باریک باتوں میں سے کوئی بات کئی دن تک کھٹکتی ہے تو میں اس کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک کہ دو گواہوں کی گواہی نہ لوں یعنی قرآن اور حدیث"۔

---

[1] الرسالة القشيرية، بَاب فِي ذكر مشايخ هذه الطريقة وَمَا يدل من سيرهم وأقوالهم عَلَى تعظيم الشريعة، ج ١ص ٥٨.

[2] الرسالة القشيرية ، بَاب فِي ذكر مشايخ هذه الطريقة وَمَا يدل من سيرهم وأقوالهم عَلَى تعظيم الشريعة ،ج١ص ٦١.

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ، حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے حالات میں لکھتے ہیں:

وعن حامد بن إبراهيم قال قال الجنيد بن محمد الطريق إلى الله مسدود على خلق الله عز وجل إلا على المقتفين آثار رسول الله صلى الله عليه وسلم والتابعين لسنته كما قال الله عز وجل: {لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ}.[1]

ترجمہ: "حامد بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ جنید بن محمد نے فرمایا اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ مخلوق پر بند ہے سوائے ان لوگوں کے جو رسول اللہ ﷺ اور ان کی سنتوں کے متبعین کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ:" تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے"۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس حوالہ سے مختلف ائمہ تصوف، مثلا حضرت ابویزید بسطامی، سری سقطی، جنید بغدادی، ابو بکر دقّاق، ابو الحسین نوری اور ابو سعید خراز وغیرہ (رحمہم اللہ) کے اقوال جمع فرمائے ہیں، ان سب کا حاصل یہ ہے کہ تصوف قرآن وسنت کے احکام کی خلاف ورزی یا اس سے دوری کا نام نہیں ہے بلکہ اس راستے کی تو شرط اول ہی یہی ہے کہ قرآن وسنت کے احکام وہدایات کی پوری طرح پابندی کی جائے، شرعی احکام کے خلاف ورزی کرنے والے شخص کا تصوف وسلوک سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ علامہ نقل فرماتے ہیں:

---

[1] صفة الصفوة، ذكر المصطفين من أهل بغداد، الجنيد بن محمد بن الجنيد ،ج١ص ٥١٩.

وقال (البسطامي) أيضًا: "من ترك قراءة القرآن، ولزوم الجماعات، وحضور الجنائز، وعيادة المرضى، وادّعى بهذا الشأن؛ فهو مُدّعٍ"
.وقال سَرِيٌّ السَّقطيُّ: "من ادعى باطن علمٍ ينقضه ظاهرُ حكيمٍ فهو غالط".

وقال الجنيد: "مذهبنا هذا مقيَّد بالأصول بالكتاب والسنة، فمن لم يحفظ الكتاب ويكتب الحديث ويتفقه لا يُقتدى به". وقال أبو بكر الدّقاق: "من ضيّع حدود الأمر والنهي في الظاهر حُرِم مشاهدةَ القلب في الباطن". وقال أبو الحسين النوري: "من رأيتَهُ يدّعي مع الله حالةً تُخرجه عن حد العلم الشرعي فلا تَقْرَبْه، ومن رأيته يَدّعي حالة لا يشهد لها حفظُ ظاهر فاتهِمْه على دينه". وقال أبو سعيد الخراز: "كل باطن يخالفه ظاهر فهو باطل". [1]

ترجمہ: "حضرت بسطامیؒ نے فرمایا: جس نے قرآن کی تلاوت، نماز باجماعت کا التزام، جنازوں میں شرکت، بیمار پرسی کو چھوڑ دیا اور تصوف کا دعویٰ کیا تو وہ خشک دعویدار ہے۔ حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا: کہ جو ایسے باطنی علم کا دعویٰ کرتا ہو کہ اس کا ظاہر اس کے دعوے کو جھٹلائے، تو وہ غلطی میں مبتلا ہے۔

حضرت جنیدؒ نے فرمایا: کہ ہمارا تصوّف کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے پس جس نے قرآنی تعلیمات کی حفاظت نہیں کی، احادیث لکھتا ہے اور مسائل سیکھتا ہے اس کی پیروی نہیں کی جائے گی۔ حضرت ابوبکر دقاقؒ فرماتے ہیں: جس نے اپنے

---

[1] إغاثة اللهفان في مصايد الشيطان ط عالم الفوائد، الباب الثالث عشر في مكايد الشيطان التي يكيد بها ابن آدم، فصل،ومن كيده: أنه يُغرِي الناس بتقبيل يده ------ج ١ص ٢١٦.

ظاہر پر شریعت کے اوامر ونواہی کے حدود کو ضائع کیا تو وہ دل کی باطنی آنکھوں سے محروم کر دیا جائے گا۔ حضرت ابوالحسین نوریؒ فرماتے ہیں: کہ جس کو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی حالت کا دعویٰ کر رہا ہے جو اس کو شرعی علم کے حدود خارج کرتا ہو تو اس کے قریب نہ جا، اور جو کسی ایسی حالت کا دعویٰ کرے کہ اس کا ظاہر اس کی اس حال کی گواہی نہ دے تو دین کے بارے میں اس کو جھوٹا سمجھو، حضر ابوسعید خرازؒ فرماتے ہیں کہ ہر وہ باطنی حالت جس کا ظاہر مخالف ہو، وہ حالت باطل ہے"۔

حضرت مجدّد صاحب اور اتباع شریعت کی اہمیت

حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ، باوجودیکہ ائمہ تصوف میں سے تھے اور یہی ان کی زندگی کا نمایاں وصف سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ان، کے ہاں اتباع شریعت اور اتباع سنت ہر چیز پر مقدم تھا، تصوف کے ظاہری اعمال واشغال اگر اس کے خلاف ثابت ہو جاتے تو ان کے ہاں ان اشغال کی کوئی قدر وقیمت نہیں تھی بلکہ سختی کے ساتھ اس کی تردید وممانعت کرتے تھے۔ ذیل کے ملفوظ سے اس کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

اعلم أنّ رعاية أدب مِن الأداب والاجتناب عن كراهة ولو تنزيها أفضل مِن الذّكر والفكر والمراقبة والتوجّه بمراتب. نعمٌ إذا جمع هذه الأمور مع تلك الرّعاية فقد فاز فوزا عظيما.[١]

---

[١] البهجة السنّية في أداب الطّريقة العليّة الخالدية النّقشبندية، ص٤.

ترجمہ: "جان لو! کہ آداب کی رعایت رکھنا اور مکروہات سے بچنا اگر چہ تنزیہی ہوں، ذکر، فکر، مراقبہ اور توجہ سے بدرجہا بہتر ہے۔ جی ہاں! جب ان امور کو اس رعایت کے ساتھ جمع کرے، تو یہ بڑی سعادت ہے"۔

چوتھا اشکال اور اس کا جواب

کیا تصوف عملی زندگی کے لئے رکاوٹ ہے؟

چوتھے نمبر پر یہ اشکال ذکر کیا گیا تھا کہ تصوف عملی اور تحریکی زندگی میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے جو مسلمانوں کو راہ عمل سے کاٹ کر تنہائی پر اکساتی ہے۔

اس اشکال کی حیثیت ایک بے بنیاد مفروضے سے کم نہیں ہے، انصاف کے ساتھ دیکھا جائے تو:

الف: تصوف کی تعلیمات وہدایات اس مفروضے کی کلی تردید کرتے ہیں ۔ سستی اور غفلت وکاہلی کے جتنے اسباب اور وجوہات ہیں، تصوف کی تعلیمات کو پختگی کے ساتھ اگر اختیار کر لیا جائے تو ان میں سے اکثر اسباب وعناصر کے ختم ہونے کا کامیاب اور مؤثر ومجرب علاج یہی ہے۔ چنانچہ عموماً کوئی سستی اور کاہلی کا شکار اس لئے ہو جاتا ہے کہ اس کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا، دنیا کے اس راہِ سفر میں اپنی حیثیت ومقام اور آخرت میں اپنے انجام وعاقبت کی فکر نہیں ہوتی ، یا ان سب کچھ کے باوجود دل پر پردے پڑ جاتے ہیں اور یوں انسان غفلت کی راہ کا راہی بن جاتا ہے۔ اور تصوف کے اعمال واشغال میں استحکام پیدا کرنے سے ان جیسی سب باتوں کی اچھی طرح اصلاح ہو جاتی ہے۔

ب: تصوف کی تعلیمات میں اور بے عملی و تحریکی زندگی کے درمیان کوئی عقلی یا منطقی ربط نہیں ہے بلکہ دونوں باتوں میں اگر کچھ علاقہ ہے تو تضاد ومنافرت کا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تصوف کے کام میں جو افراد داخل ہوتے ہیں وہ مختلف مزاج ومذاق کے لوگ ہوتے ہیں، یہاں آکر ان کی اصلاح باطن اور تزکیہ نفس کا کام ہو جاتا ہے تو بھی ان کے جبلی صفات وفطری عادات ند رہتے ہیں، ان میں سے اگر کسی میں سستی کی عادت پہلے سے موجود تھی تو تصوف کی وجہ سے احساس تو پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس عادت کو کلی طور پر کھرچ کر نکالنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا ،اس لئے بعض اوقات وہ اسی عادت کے تحت کہیں سستی کا بھی شکار ہو سکتا ہے لیکن چونکہ خود تصوف نے اس کے اندر اس عادت کی تخم ریزی کی اور نہ ہی اس کی آبیاری میں کوئی حصہ لیا، اس لئے اس کو قصوووار ٹھہرانا بالکل بے جا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه، عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: «تجدون الناس معادن، خيارهم في الجاهلية خيارهم في الإسلام، إذا فقهوا، وتجدون خير الناس في هذا الشأن أشدهم له كراهية.[1]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم آدمیوں کو کان کی مانند (مختلف الطبائع) پاؤ گے ان میں سے جو جاہلیت کے زمانہ میں

[1] صحيح البخاري: باب قول الله تعالى: يا أيها الناس إنا خلقناكم من ذكر وأنثى، ج٤ص ١٧٨.

اچھے تھے وہ اسلام (کے زمانہ) میں بھی اچھے ہیں بشرطیکہ وہ دین کا علم حاصل کریں اور تم سب سے زیادہ اچھا اسلام میں اس کو پاؤ گے جو سب سے زیادہ اس کا دشمن تھا"۔

اب اگر سست طبیعت کا حامل شخص مسلمان ہوتا ہے اور دائرہ اسلام میں داخل ہوجانے کے بعد اس سے اپنی سابقہ عادت کی بناء پر کوئی سستی کا کام ہوجاتا ہے تو کیا اس سے دین اسلام کو ہدفِ ملامت بنایا جاسکتا ہے!

ج: تصوف سے وابستہ افراد کی کارکردگی دیکھی جائے اور تاریخ کے دریچوں میں ان حضرات کی خدمات وتحریکات کو ٹٹولا جائے تو بھی اس نتیجہ کے اخذ کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ مفروضہ سراسر خلافِ حقیقت ہے۔ تصوف میں نفس کے جن عیوب وامراض کا علاج کیا جاتا ہے، ان میں ایک یہی "بے کاری" اور "ضیاعِ وقت" بھی ہے۔

مشہور صوفی علامہ ابو عبد الرحمن السلمی اپنی کتاب "عیوب النفس" نفس کے عیوب ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تَضْيِيع الْأَوْقَات فِيمَا لَا يعنيه: وَمن عيوبها تَضْيِيع أوقاته بالاشتغال بِمَا لَا يعنيه من أُمُور الدُّنْيَا والخوض فِيهَا مَعَ أَهلهَا. ومداواتها أَن يعلم أَن وقته أعز الْأَشْيَاء عَلَيْهِ فيشغله بِأَعَز الْأَشْيَاء وَهُوَ ذكر الله والمداومة على طَاعَته ومطالبته الْإِخْلَاص من نَفسه فَإِنَّهُ روى عَن النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم أَنه قَالَ (من حسن إِسْلَام الْمَرْء تَركه مَالا

يعنيه) وَمن ترك مَا لَا يعنيه اشْــتغل بِمَا يعنيه وَقَالَ الْحسَــن عَلَيْك بِنَفْسِك إِن لم تشغلها أشغلتك.[1]

ترجمہ:"لایعنی میں اوقات ضایع کرنا:اور اس کے عیوب میں سے بے فائدہ دنیوی امور میں مشغولیت اور اہل وعیال میں منہمک ہو کر اوقات ضائع کرنا ہے۔اس کا علاج یہ ہے کہ وقت کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی اور معزّز جانا جائے اور اس کو سب سے زیادہ قیمتی چیز میں صرف کیا جائے اور وہ اللہ کا ذکر اور اس کی اطاعت پر دوام اور نفس سے اخلاص کا مطالبہ ہے۔نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ:"انسان کے اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ لایعنی چھوڑے"اور جو لایعنی کو چھوڑے گا وہ مفید کاموں میں مشغول ہو جائے گا، حسن بصریؒ نے فرمایا:اپنے نفس کی نگرانی کرو اگر تم نے اس کو(مفید)کام میں نہ لگایا تو وہ تمہیں(لایعنی میں)مشغول کردے گا"۔

علامہ ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ ،حضرت سہروردی کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں کہ:

وَأما الصُّــوفِي فَهُوَ الَّذِي يضــع كـل شَيْء مَوْضِــعه وَيُدبر أوقاته وأحواله كلهَا بِالْعلمِ يُقيم الْخلق مقَامه وَيُقِيم أَمر الْحق مقَامه وَيسْتر مَا يَنْبَغِي ســتره وَيظْهر مَا يَنْبَغِي إِظْهَاره كل ذَلِك مَعَ حُضُــور عقل وَصِحَّة تَوْحِيد وَكَمَال معرفَة ورعاية صدق وأخلاق.[2]

ترجمہ:" صوفی وہ ہے جو ہر چیز کو اپنی جگہ میں رکھ کر اپنے تمام اوقات واحوال کو علم کے ذریعے منظّم کرتا ہے، مخلوق کو اپنا مقام دیتا ہے اور خالق کو اپنا، جس چیز کا

---

[1] عيوب النفس،ص: ٢٨.

[2] الفتاوى الحديثية لابن حجر الهيتمي،ص: ٢٣٤.

چھپانا مناسب ہو اسے چھپاتا ہے اور جس کا ظاہر کرنا مناسب ہو اسے ظاہر کرتا ہے، یہ سب کچھ بیدار مغزی، صحیح مؤحد اور کامل عارف بن کر سچائی اور اخلاق کی رعایت کے ساتھ کرتا ہے"۔

علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ، حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے حالات میں ان کا ایک نفیس ملفوظ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

علامة اعراض الله عن العبد ان يشغله بما لا يعنيه.[1]

ترجمہ: "بندے کا بے فائدہ کام میں مشغول ہونا، اللہ تعالی کے اعراض کی علامت ہے"۔

حقوق و فرائض میں سستی اور اپنے ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں غفلت و کاہلی تو ایسی چیز ہے جس کو صوفیاء کرام ناکام صوفی کے علامات میں سے گرادانتے ہیں پھر کیونکر یہ چیز خود تصوف ہی کے سر تھوپ دی جائے! علامہ زرّوق رحمہ اللہ تصوف کی مشہور کتاب "الحکم العطائیۃ" سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال في الحكم: من علامة اتباع الهوىٰ المسارعة إلى نوافل الخيرات، والتكاسل عن القيام بحقوق الواجبات-[2]

ترجمہ: "حکم میں فرمایا ہے کہ: نفلی اعمال میں جلدی کرنا اور لازمی عبادات میں سستی کرنا اتّباعِ ہوی کی علامت ہے"۔

---

[1] صفة الصفوة، الجنيد بن محمد بن الجنيد، ج١ص٥١٩.

٢ عدة المريد الصادق، فصل،في تتبع الفضائل وأنواع المندوبات ،ص: ٢٣٩.

کاش کوئی باہمت عالم دین تصوف وسلوک سے وابستہ افراد وشخصیات کے سیرت وسوانح کا پوری گیرائی کے ساتھ مطالعہ کرے اور ان حضرات کی متنوع قربانیوں اور جہادی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، تصنیفی وتدریسی اور معاشی وغیرہ ہر سطح پر ان حضرات کی خدمات وقربانیوں کو جمع کر کے معاشرے کے سامنے لائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ ان جیسے شبہات دور ہوں گے، بلکہ ساتھ یہ حقیقت بھی صاف ہو جائے گی کہ ماضی میں جن لوگوں نے بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں ان میں اکثریت انہی لوگوں کی ہے جو مرتبہ احسان پر فائز تھے جس کا عام متبادر راستہ یہی تصوف وسلوک ہے۔

پانچواں اشکال:

تصوف اور رہبانیت

تصوف کی مخالفت اور اس کے انکار کی فضاء میں پانچواں اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ یہ وہی رہبانیت کی شکل ہے جو دین نصاریٰ میں تھی اور اسلام کا دامن اس سے پاک وصاف ہے، وہاں بھی لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر رہنا تھا اور یہاں بھی یہی کچھ کرتا دھرتا ہے۔

لیکن یہ اشکال بھی پہلے اشکالات کی طرح بے ہودہ اور لا فائدہ ہی ہے۔ تصوف اور رہبانیت میں ایک واضح فرق یہی ہے کہ وہاں دین منسوخ میں رہبانیت کو مقصود کا درجہ دیا جاتا تھا اور لوگوں سے میل جول اور خلط ومخالطت کو مذموم یا ممنوع ٹھہرایا جاتا تھا جبکہ تصوف میں خود عزلت مقصود ہوتی ہے نہ ہی لوگوں کے ساتھ میل جول کو فی نفسہ ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک

عرصہ تک لوگوں کے ساتھ تعلقات کی کمی لائی جاتی ہے اور اس کے بعد جب نفس وشیطان کی کدورتوں اور ان کی رعنائیوں سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے ، اس پر قابو پانے کی ترکیب وترتیب ہاتھ آجاتی ہے تو اس وقت اس کو میدان عمل میں لایا جاتا ہے ۔فائدہ کی بات اس میں یہی ہے کہ اس دوران اس کی صلاحیتوں اور عزائم ونیتوں کو چار چاند لگتے ہیں اور اس کے بعد وہ میدان عمل میں وہ خدمات اور کارنامہائے روزگار انجام دیتا ہے کہ اگر اس راہ کی صحرانوری نہ کرتا تو کبھی اس سے ان جیسے اقدام کی توقع نہ ہو سکتی تھی۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے معاشرہ کے بعض افراد کو جب ملکی سرحد کی دفاع وحفاظت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے تو پہلے ایک خاص مدت تک اس کو فوجی تربیت دی جاتی ہے، جب دشمن کے حملہ کرنے کے طریقے اوراس کو دفع کرنے کے سلیقے اچھی طرح سمجھ میں آجاتے ہیں، مختلف مراحل سے اس کو گزار گزار کر اس کے ساتھ نیک توقع قائم ہو جاتی ہے ، تب کہیں جاکر اس کو سرحد پر تعینات کیا جاتا ہے ۔ فوجی تربیت کے زمانے میں لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر رہنا اور اس مگن میں مصروف رہنا ملک ومعاشرت کی حفاظت سے منہ موڑنا نہیں ہے بلکہ اس باب میں مزید جانکاری، ہمت مردانہ اور عزم وشجاعت کی آئینہ دار ہے۔

بس یہی صورت حال بیچارے سالک وصوفی کی بھی ہے کہ وہ عزلت برائے عزلت نہیں کرتا بلکہ مستقبل کے لئے پیش قدمی ہوتی ہے۔اور جس طرح کوئی شخص خواہ کتنا ہی مخلص اور محب وطن کیوں نہ ہو لیکن ضروری فوجی تربیت حاصل کئے بغیر اگر آگے بڑھے گا اور سرحد پر کھڑا ہو دشمن کے مقابل صف میں داد

شجاعت دینے لگ جائے گا تو خطرہ ہے کہ اس کی گولی اور اس کی قوت مقابل کی بجائے اپنے یا اپنے ہی صف کے فوجی کو لگے اور یا مہارت نہ ہونے کی وجہ سے وہ دشمن کے ہاتھ اسیر بن جائے، بس یہی صورت حال انسان کی بھی ہے کہ اگر باطنی تربیت حاصل کئے بغیر وہ شیطان کا مقابلہ کرنے کھڑا ہونا چاہتا ہے یا اس سے امت کے افراد کی حفاظت کرنے کی نیک تمنا رکھتا ہے تو خطرہ اور غالب خطرہ ہے کہ خود ہی اس کے جال میں پھنس جائے گا۔

تصوف وسلوک کی دنیا میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کا نامِ نامی محتاج تعارف نہیں ہے، آپ کی پوری زندگی اس کی خدمت میں اور اس مناسبت سے لوگوں کی تربیت کرتے کرتے گزری، آپ اپنی ایک مفیدِ عام کتاب میں، جو در اصل ان مجالس کا مجموعہ ہے جو آپ نے اپنے ارادت مندوں کی تعلیم وتربیت منعقد فرمائے تھے، فرماتے ہیں:

> يا غلام: لِيكن الخرس دأبك والخمول لباسل والهرب مِن الخلق كلّ مقصودك، وإنّ قدرتَ أنْ تنقبَ في الأرض سربا تخفي فيه فافعلْ. يكون هذا دأبَك إلى أن يترعرع إيمانك ويقوي قدم إيقانك ويتريّش جناح صدقك وتنفتح عينا قلبك... فحينئذ أطلقْ لسانَك في الكلام واخلعْ لِباس الخمول واترك الهربَ مِن الخلق واخرجْ مِن سربك إليهم فإنّك دواء لهم غير مستضرّ في نفسك، لا تبال بقلّتهم

وكثرتهم وإقبالهم وإدبارهم وحدّهم وذمّهم، لا تبال أين سقطتَّ لقطتَّ وأنت مع ربّك عزّ وجلّ.[١]

ترجمہ:"اے بیٹا!کم گوئی تیری عادت اور گم نامی تیرا لباس ہونا چاہئے،اور مخلوق سے دور رہنا تیرا مقصود ہونا چاہئے،اگر ہو سکے تو زمین میں سرنگ نکال کر اس میں چھپ جا ،چھپے رہنا تیری عادت ہو جائے،یہاں تک کہ ایمان بڑھ جائے اور تیرے ایقان کے پاوں جم جائیں،تیرے صدق وسچائی کے بازوں کے پر نکل آئیں،اور تیرے دل کی آنکھیں کھل جائیں... تو اس وقت تیری زبان کو قوت گویائی عنایت ہو گی،گم نامی کا لباس اتار دینا،مخلوق سے بھاگنا چھوڑ دینا،خلوت خانہ کی سرنگ سے نکل آنا یقینی طور پر تو مخلوق کے لئے دوا ہے،ان کے ملنے ملانے سے تیرے نفس کا کچھ نقصان نہیں،ان کی کمی اور زیادتی ،ان کی تعریف اور برائی،آنے اور نہ آنے کی پرواہ نہ کرنا،کہاں گرے،کہاں پڑے،یہ دل سے نکال ڈال،کیونکہ تو اپنے رب اللہ تعالی کے حضوری میں ہے"۔

عزلت نشینی کا حکم اور بنیاد

میدانِ تصوف وسلوک کی اس وقتی عزلت وخلوت نشینی کی حیثیت اگرچہ ایک تدبیر کی ہے جس کے لئے صریح نصوص سے ثابت ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ممانعت کے عناصر سے خالی ہونا ہی جواز کے لئے کافی ہے۔ تاہم غور کیا جائے تو سلف صالحین کی زندگیوں میں اس کی بیسیوں مثالیں مل جاتی ہیں۔ خود حضور نبی اکرم ﷺ کا مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران غارِ حراء کے اندر جانا اور وہاں لوگوں

---

[١] الفتح الربّاني،ص٤٨.

سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت وبندگی میں مصروف رہنا اس کی کافی دلیل ہے۔

علاوہ ازیں مذموم رہبانیت اور صوفیاء کرام کی عزلت وخلوت نشینی کے حکم میں فرق ہے، یہ عزلت وخلوت بذات خود مذموم یا ممنوع نہیں ہے بلکہ بعض اوقات مرجوح ومفضول اور بسا اوقات راجح وافضل بن جاتی ہے جس کی تفصیل امام غزالی رحمہ اللہ کی کتاب "احیاء علوم الدین" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ایک عمومی اشکال اور اس کا جواب

تصوف اور عہدِ سلف

دین دار افراد کا جو طبقہ تصوف سے بے زاری اختیار کئے ہوے ہیں اور بڑے خلوص وجذبے سے اس کی مخالفت فرماتے ہیں، ان کا ایک عمومی اشکال یہ ہوتا ہے کہ تصوف کی یہ شکل اور یہ تمام تر تفصیلات دورِ سلف میں رائج نہ تھیں بلکہ اس کے بعد ہی اس کی داغ ڈالی گئی، پھر کیونکر اس کو بدعت نہ قرار دیا جائے؟ تصوف کی شرعی حیثیت اور دینی مقام کے حوالہ سے یہ اشکال بڑا اہم اور بنیادی سمجھا جاتا ہے اور تصوف وسلوک کی تردید وتنقید سے متعلق جن کتابوں کا پہلے ذکر کیا گیا ہے، ان میں بھی جگہ جگہ اس اعتراض کی طرف تصریحات واشارات ملتے ہیں۔

لیکن یہ اشکال درست نہیں ہے، اس حوالہ سے درج ذیل باتوں کو پیشِ رکھنا ضروری ہے:

الف: محض کسی چیز کا دورِ سلف میں نہ ہونا اس کے بدعت یا ممنوع ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ ساتھ یہ شرط بھی ہے کہ دورِ سلف میں اس کی ضرورت درپیش تھی اوراس کے کرنے سے کوئی مانع موجود نہ تھا مگر اس کے باوجود وہ کام اس دور میں وجود پذیر نہ ہوا یا وجود تو ملا ہو لیکن اس دور کے مسلم اہل علم نے اس کی تردید ومذمت فرمائی ہوں اور کام بھی دینی ہو کہ لوگ اس کو دین کا حصہ باور کرتے ہوں۔ اصطلاحی الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ دورِ سلف میں مطلقا کسی کام کا ترک ہونا موجب بدعت نہیں ہے بلکہ "ترک خاص "ہی سے کراہت ومذمت یا بدعت کا پہلو ثابت ہو سکتا ہے اور "ترک خاص" کی تفصیل وہی ہے جو ابھی ذکر کی گئی کہ مقتضی موجود ہو اور مانع متحقق نہ ہو۔

ب: اس معیار کو دیکھا جائے تو تصوف کو اس بنیاد پر بدعت یا ممنوع سمجھنا درست نہیں ہے کیونکہ جس زمانے میں تصوف کی اس رائج ترتیب کا رواج نہ تھا، اس زمانے میں اس کی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ تصوف کا اصل مقصود تزکیہ نفس اور تصفیہ اخلاق ہے، یہ مقصود صحبت وغیرہ ذرائع سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے اور حضور کی صحبت کی یہ تاثیر یقینی طور پر ثابت ہے کہ وہاں دل کا کایاپلٹ جاتا تھا، دل کی دنیا یکسر تبدیل ہو جاتی تھی، اخلاق وتصورات کا قبلہ بالکل درست ہو جاتا تھا۔

ایک غیر مقلد عالم کا ادیبانہ معروض

ایک غیر مقلد عالم دین حضرت مولانا محمد حنیف ندوی صاحب رحمہ اللہ نے اس بات کا بڑا ادیبانہ جواب لکھا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

"ایک آخری کھٹک یہ رہ جاتی ہے کہ اگر خلوت وانزوا کی یہ برکات ہیں، تو صحابہ اس سے کیوں آشنا نہیں تھے اور ان کی زندگی میں کیوں ایسی کیفیات کا پتہ نہیں چلتا؟

جواب واضح ہے۔ انجیل کے مثالی پیرایہ بیان میں یوں سمجھئے: جس براءت میں دولہا موجود ہے، اس کو مجاہدہ وریاضت کی کیا ضرورت ہے؟ جب آنحضرت ﷺ کے عملِ تزکیہ نے، جلوت ہی میں ان لطائف سے ان کو بہرہ مندہ کرر کھا تھا، جو انبیاء علیہم السلام کے بعد عموماً خلوت سے حاصل ہوتے ہیں تو ان کو اس تدبیر کی حاجت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ تصوف کا نصب العین، دراصل اسی خلاء کو پُر کرنا تو ہے۔"[۱]

ج: یاد رہے کہ تصوف کی جو عام رائج ترتیب ہے جس میں اوّلاً کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہوتی ہے، پھر مجاہدات واذکار کرائے جاتے ہیں، باطنی اخلاق وعادات سے شیخ کو مطلع کیا جاتا ہے اور ان کی ہدایات وتعلیمات پر عمل کیا جاتا ہے، وغیرہ۔ یہ ترتیب اس زمانے میں رائج تھی نہ ہی یہ چیزیں بذات خود مقصود ہیں۔ بلکہ جیسا کہ پہلے متعدد بار ذکر کیا جاچکا ہے کہ مقصود تزکیہ نفس ہے اور یہ ظاہری ترکیب وترتیب اس مقصود کو حاصل کرنے کے مختلف وسائل اور ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں، اب اگر کسی خوش نصیب کو آج بھی یہ مقصود ان مجاہدات اور اس ترتیب

---

[۱] تصوف سلف وخلف کی نظر میں۔ از جناب حافظ محمد موسی بھٹو صاحب زید مجدہم، مضمون مولانا محمد حنیف ندوی، ص ۲۳۰.

پر چلے بغیر حاصل ہو جاتا ہے تو اس کے لئے مزید ان ذرائع کو اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لہٰذا حضرات سلف کے جس دور میں یہ مقصود دیگر وسائل سے حاصل ہو جاتا تھا، وہاں ان ذرائع کو اختیار کرنا ضروری نہ تھا۔ اس صورت میں یہی کہا جائے گا کہ اپنے مقصود اور فی الجملہ کچھ ذرائع کے موجود ہونے کی وجہ سے تصوف اس زمانے میں بھی رائج تھا۔

د: پہلے اشکال کے جواب میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاچکا ہے کہ تصوف کے غرض ومقصود کو تو کوئی بھی بدعت کہنے کی جسارت نہیں کرسکتا، زیادہ سے زیادہ اس کے وسائل ومبادی ہی کو بدعت کہا جاسکتا ہے لیکن جب یہ ذرائع بذات خود مقصود نہیں سمجھتے جاتے اور مستقل دینی حکم کے طور پر ان کو اختیار نہیں کیا جاتا، بلکہ ایک منصوص وضروری مقصود کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ خیال کیا جاتا تھا اور اسی تصور کے تحت اس پر عمل کیا جاتا ہے تو اس کے بعد اس کو بدعت یا ناجائز کہنے کا کیا امکان رہ جاتا ہے؟ اور ایسی چیز اگر دورِ سلف میں متروک بھی ہو تو بھی محض اس کی وجہ سے اس کو کیونکر ناجائز قرار دیا جاسکتا ہے؟

غلط فہمیاں اور ان کی وجوہات واسباب

علم تصوف کی دینی حیثیت سے متعلق جو اختلاف ذکر کیا گیا ہے، ایسے اختلافات عموماً دو طرفہ غلطیوں ہی کے نتیجے میں میں پیدا ہو جاتے ہیں جس میں دونوں ہی طرف سے شعوری یا لاشعوری طور پر کچھ کوتاہیاں پائی جاتی ہیں اور یہی کوتاہیاں اختلاف کی طویل عمارت کا سنگ بنیاد ثابت ہو جاتی ہیں، پھر ایک بار جب تردید وتنقید کا تبادلہ شروع ہو جاتا ہے تو اس کے بعد بڑی مشکل سے اس پر قابو

پایا جاسکتا ہے، عموماً ہوتا یوں ہے کہ ایسے اختلافات کی لہریں موجزن ہی رہتی ہیں۔ تصوف کے حوالہ سے امت میں جو کچھ اختلاف وافتراق کی فضاء پیدا ہوئی ہے، اس کے پسِ منظر میں اگر جھانک کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی جانبین کی طرف سے کوتاہیاں ہوئی ہیں گو لاشعوری طور پر ہی ہوں، لیکن انہی کوتاہیوں کی وجہ سے دونوں کے درمیان دوری کا ایک خلیج قائم ہوا اور بدگمانیوں سے بڑھتے بڑھتے وہی چیز ایک موقف کی شکل اختیار کرگئی۔

یہاں اپنی محدود سوچ وبساط کے مطابق کوشش کی جاتی ہے کہ انہی جیسی بعض کوتاہیوں کو سامنے لایا جائے اس کے نتیجے میں امید ہے کہ ماضی سے سبق وعبرت بھی حاصل ہوجائے گا اور آئندہ وحال میں محتاط رہنے کا سلیقہ بھی پیدا ہوجائے گا، لیکن ان کوتاہیوں کے ذکر کرنے سے کسی کی شخصیت پر طعن وتنقید کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے، اسی طرح جن چیزوں کا یہاں کوتاہیوں کے عنوان کے تحت ذکر کیا جاتا ہے وہ اس ناکارہ کے فکر ومطالعہ کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ نہ سو فیصد اتفاق کرنا ضروری ہے اور نہ ہی اندھی آنکھوں اعتماد کرنا لازم ہے۔

ناقدین کی کوتاہیاں

ا:ناقدین کی طرف سے جو کوتاہیاں پیش آئیں ،ان میں بنیادی حیثیت "غیر اصولی طرزِ عمل" کو حاصل ہے، جس کے مختلف مظاہر ہیں:

الف: انہوں نے خود علمِ تصوف کا جائزہ لیا نہ اس کی تنقیح وتہذیب کیں، بلکہ یوں ہی بعض افراد واشخصیات کے واقعات واقوال سے استدلال کرکے پورے فن کے متعلق ایک رائے قائم فرمائیں۔ان کی تنقیدات کو پڑھنے کے بعد یہی

دکھائی دیتا ہے کہ قلعہ کے اندر تو کیا قریب بھی جائے بغیر ہی دور دراز سے اس پر تیروں کی بارش شروع کر دیں حالانکہ نہ قلعے کی صورت حال کا کچھ علم اور نہ ہی اس کے باشندگان سے کوئی خاطر خواہ واقفیت تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے اقدام سے صحیح نتائج اور درست ثمرات کشید کرنے کی توقع رکھنا خوش فہمی اور خود فریبی ہی ہو سکتی ہے۔

ب: خود شخصیات کے ذاتی سرگرمیوں کی طرف تعرض کرنا ہی غیر اصولی اقدام ہے۔ فن کی مدح و تعریف یا مذمت و تنقید کے لئے خود فن کے مباحث و مسائل کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے، وابستہ افراد کی طرف تعرض کرنا اور اسی پر فیصلے کی بنیاد رکھنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

ج: واقعات و جزئیات سے از خود کلیات و ضوابط کا استخراج۔ یہ غلطی بہت زیادہ دیکھی جاتی ہے، تصوف کی کسی کتاب میں کوئی ضمنی جزئیہ ذکر ہے یا کسی بزرگ کا قصہ مذکور ہے یا تصوف سے وابستہ کسی فرد سے کوئی ایسا قول و عمل منقول ہے جو شریعت سے متصادم ہے، تو اس سے یہ کلی ضابطہ اخذ کیا جاتا ہے کہ یہ چیز تصوف میں جائز ہے یا صوفیاء کا معمول ہے۔ یہ طرزِ عمل قطعاً غلط ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ فیصلہ کرنے والا یا تو حق تک رسائی کا طالب ہی نہیں ہے یا اگر ہے تو اصولی اور معتدل راستے پر چلنے کی عادت نہیں ہے۔ افراد و اشخاص کے کردار و اعمال کے مختلف بنیادیں ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصولی نقطہ نظر سے اقوال اور اعمال میں بڑا فرق ہوتا ہے اور تعارض کے وقت اقوال ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔

د: استقراء ناقص کی بنیاد پر کلی احکام کی بنیاد رکھنا۔ چنانچہ تصوف سے وابستہ بعض حضرات کے بعض واقعات ہی کو لے کر اس پر اکتفاء کیا گیا، حالانکہ ایسے افراد کی ایک طویل فہرست ہے کہ تصوف سے اچھی طرح وابستگی اور عملی اشتغال کے باوجود ان کی زندگی قابل رشک اور لائق اقتدا تھی۔ اسی طرح جن حضرات کے قصے لے لے کر ان سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں، ان ہی کے ایسے ہی واقعات ہیں جو اتباع شریعت کی عمدہ مثال بن سکتی ہیں۔

۲: مانا کہ تصوف شریعت واسلام کی نظر میں انتہائی ناقابل برداشت اور ناقابل تصور چیز اور قرآن وسنت کی تعلیمات سے متصادم ہے، لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ عام افراد کی اصلاح وتربیت ٹھیک اسی نہج پر کیونکر کی جاسکتی ہے جس کو تزکیہ نفس کہا جاسکے اور جو قرآن وسنت کی روشنی میں

مطلوب ومقصود بھی ہے اور فلاحی اسلامی متوازن معاشرے کے لئے سنگ بنیاد اور شرط لازم بھی ہے؟ اگر تصوف کے یہ سارے "دھندے" واقعی اس قابل ہیں جن کو یک لخت چھوڑ دینا ضروری ہے تو اس کا متبادل اسلامی طریقہ کیا ہونا چاہئے؟

تصوف سے وابستہ افراد کی کوتاہیاں

تصوف کے خلاف فضاء ہموار ہونے میں بعض کوتاہیاں ان افراد سے بھی صادر ہوئی ہیں جو خود اس شعبہ سے وابستہ اور اس راہ پر گامزن تھے، ان میں سے چند اہم باتیں یہ ہیں:

۱: تصوف کے اصل مقاصد کی طرف توجہ کی کمی۔ بار بار ذکر کیا جاچکا ہے کہ تصوف کا اصل مقصد اصلاح باطن، تزکیہ نفس اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط وتعلق

کی مضبوطی ہے، بہت سے حلقوں کی طرف سے اس اہم اور بنیادی مقصد پر توجہ کم دی جانے لگی، اس لئے بہت سے طبقات میں اس کی اہمیت کا احساس ہی پیدا نہیں ہوا۔ مقاصد واہداف ہی سے کسی کام کی وقعت بڑھتی یا گھٹتی ہے، خصوصاً جب کوئی کام مشکل اور مزاج کے خلاف ہو تو مقصود کی عظمت ورفعت ہی وہ چیز ہے جو اس قسم کے اقدام کی اہمیت بلکہ جواز کی بنیاد واساس بن جاتی ہے، جب مقصود ہی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے تو انسان مشکل راستے کی خاک کیوں چھان لے!

۲: غیر ضروری کاموں پر ضرورت سے زیادہ توجہ۔ کشف، الہام، اچھے سچے خواب دیکھنا، طرح طرح کی کرامات ظاہر ہونا، وغیرہ وہ چیزیں ہیں جو تصوف کے مقاصد میں سے بالکل نہیں ہیں اور نہ ہی شرعاً یہ چیزیں مطلوب ہیں، لیکن تصوف سے وابستہ بہت سے حلقوں کی جانب سے ان جیسی چیزوں کا غیر معمولی اہتمام پایا گیا۔ اسی طرح خوشی یا غمی کی شدت میں بعض اوقات انسانی عقل مستور ومغلوب ہو جاتی ہے جس کے بعد کچھ ایسی باتیں اور واقعات صادر ہو سکتے ہیں جن کی شرعاً گنجائش نہ ہو، اب ایسا شخص تو مستور ہونے کی وجہ سے مکلف نہیں رہتا اور مکلف نہ ہونے کی وجہ سے اس حد تک ان اعمال کی مسئولیت بھی اس پر عائد نہیں ہوتی۔ لیکن ان جیسی باتوں کو اگر پھیلایا جاتا رہے تو ضرور غلط فہمی کی جڑیں مستحکم ہو جاتی ہیں۔

بہت سے ناقدین کے لئے یہی چیزیں تصوف کے انکار وتنقید کا بنیادی باعث بنی ہیں، گو انہوں نے اپنی تنقید میں دیگر مسائل ومباحث کو بھی نشانہ بنایا لیکن غلط فہمیوں کا اصل سرا یہی چیزیں ثابت ہوئی اور یہی سے بدگمانیوں کے سلسلے

کو تقویت پہنچی۔ حالانکہ ان باتوں کو پھیلانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، اگر کہیں کسی افادیت کے پیش نظر پھیلانا مناسب بھی تھا تو بھی احتیاط واعتدال کا دامن مضبوطی سے پکڑنا ضروری تھا، لیکن افسوس یہ ہے کہ متعدد حلقے اس سلسلہ میں بے اعتدالی اور بے احتیاطی کے شکار ہوئے، یہی سے سینکڑوں مخلص افراد بھی خود تصوف ہی کے حوالہ سے بدگمانیوں کے نذر ہوئے۔

یاد رہے کہ بہت سے رسوم ایسے ہیں جو بذات خود حدود میں رہتے ہوئے بدعت کے زمرے میں داخل نہیں ہے لیکن جاہل صوفیاء اور غیر محتاط خانقاہوں کے تعامل کی وجہ سے یہ حیثیت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے اس کی تنقید وتردید کرنا کچھ زیادہ بے جا نہیں ہے البتہ اس کی وجہ سے اصل کام چھوڑنا اور پورے ہی سلوک وتصوف کو حرام وبدعت قرار دینا غلط ہے۔

۳: متعلقہ شعبہ میں غلو اور دیگر دینی شعبوں سے مزاحمت کا رویہ۔ یہ غلطی صرف شعبہ تصوف ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دیگر دینی شعبوں میں بھی اس کی بہتات ہے، اس کو خوب خوب فروغ ملا، لیکن یہاں چونکہ تصوف پر گفتگو کرنا مقصود ہے، اس لئے اس کی بات کی جاتی ہے۔ اپنے ہی شعبہ کو سب شعبوں سے زیادہ اہم سمجھنا اور دیگر شعبوں کی واقعی حیثیت سے بھی انکار کرنا، یا انکار وتنقیص کا رویہ برتنا، اپنے ہی شعبوں کو پورا پورا دین خیال کرنا، اپنے شعبے کی اس انداز میں مدح وتعریف کرنا جس سے دیگر شعبوں کی تنقیص یا ان سے وابستہ افراد کی حوصلہ شکنی ہو جاتی ہو، یہ سب اسی غلطی کے مختلف مظاہر ہیں۔ دیگر شعبوں کی طرح بلکہ شاید ان سے کچھ زیادہ یہ کوتاہی ان لوگوں کی طرف سے صادر

ہوئی جو عملی طور پر تصوف سے وابستہ تھے اور کم از کم عام افراد کے ذہن کے مطابق تصوف کے ذمہ دار اور اس کے ترجمان کی حیثیت رکھتے تھے۔

اس غلطی کی وجہ سے دیگر شعبوں میں کام کرنے والے مخلص افراد کی ایک بڑی تعداد تصوف اور اہل تصوف کے متعلق بد ظن ہوئی۔

۴: صفائی و یکجہتی کی کوشش نہ کرنا۔ غلط فہمی یا بد گمانی کی وجہ سے اگر کوئی شخص کسی سے ناراض یا برگشتہ ہو جاتا ہے تو اس کا اصل حل یہی ہے کہ بر وقت پوری صفائی کی جائے، بے بنیاد باتوں کو دور کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے اور یکجہتی پیدا کرنے کے لئے ہر ممکن اقدام کیا جائے۔ جس

طرح افراد واشخاص کی زندگی میں یہ طریقہ کار معقول و مجرب ہے، اقوام و جماعات کی زندگی بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، وہاں بھی اسی اصول کو اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ فردی زندگی کی بنسبت قومی اور جماعتی زندگی میں اس کے زیادہ اہتمام کی ضرورت پڑتی ہے اور تھوڑی سی کوتاہی و غفلت بھی بہت نقصان و خسارے کا باعث بن جاتا ہے جس کی تلافی کرنا بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے، لمحوں کی خطا صدیوں کے سزا کی بنیاد بن جاتی ہے۔

تصوف کے خلاف فضاء قائم ہوتے وقت اگر اہتمام کے ساتھ اس اصول کو بروئے کار لایا جاتا، تو امید ہے کہ اتنی بڑی خلیج پیدا نہ ہوتی، لیکن افسوس کہ اس پر جس طرح عمل کر لینا چاہئے تھا، اس طرح نہ ہو سکا۔ جہاں اس اصول پر کچھ عمل بھی ہوا وہاں اس کے بہتر اثرات و فوائد حاصل ہوئے، چنانچہ آسمان تصوف پر چمکتے ستاروں کے مانند ان افراد کی کمی نہیں ہے جو مخالفانہ ذہن و دماغ رکھنے والے تھے،

اس کی مخالفت پر کمر ہمت باندھنے والے تھے لیکن چونکہ تھے مخلص، اس لئے حقیقت حال کھلنے کے فوراً بعد اپنی روِش سے واپس ہوئے اور خود حلقہ تصوف میں داخل ہو کر اس کے آفتاب وماہتاب بن کر چمکیں۔

نیز اس غلطی میں ناقدین کا بھی حصہ ہے کہ اگر وہ حقیقت حال کی تحقیق وتفتیش کرتے تو شاید نتیجہ کچھ اور حاصل ہو جاتا، چنانچہ دورِ اول میں حلقہ تصوف کے امام حضرت حارث محاسبی رحمہ اللہ پر متعدد محدثین اور اہل علم نے جرح کیا، لوگوں کو ان سے دور رہنے کی تاکید وتلقین کیں، لیکن امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنے ایک شاگرد کے ذریعہ خفیہ طور پر حارث محاسبی کی مجلس کا مشاہدہ کیا، ان کی باتیں سنی، جس کے بعد کم از کم امام احمد رحمہ اللہ نے حارث کی پر زور مخالفت نہیں فرمائی۔

موجودہ خانقاہی نظام کی ناکامی اور اس کی وجوہات وتجاویز

کامیابی اور ناکامی کی کسوٹی

کوئی چیز کامیابی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے یا تنزل وپستی کا شکار ہے؟ اس بات کو معلوم کرنے کے لئے عموماً مقاصد اور نتائج کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اسی کے تناظر میں ان باتوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ کسی چیز سے متعلقہ وابستہ مقاصد جس درجے میں حاصل ہوتے ہیں، اسی حد تک اس کی کامیابی وناکامی شمار کی جاتی ہے۔

اس کسوٹی کی روشنی میں جب ہم خانقاہی نظام کا جائزہ لیتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ یہ مبارک اور ضروری نظام اپنی تمام تر رعنائیوں اور بہت

ساری خوبیوں کے باوجود کامیابی اور ترقی کی بجائے انحطاط وزوال کی طرف محوِ سفر اور ترقی معکوس کا شکار ہے۔ اسلامی معاشرے کے عام افراد تو درکنار، خود خانقاہی نظام سے وابستہ افراد کے اخلاق واعمال دیکھ کر اس دعویٰ کی بخوبی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

اسباب کی اس جہان میں جس طرح دیگر تمام چیزوں کے اپنے اپنے اسباب ہیں اور اسباب اختیار کرکے ہی اس کے نتائج حاصل کرنے کی توقع کی جاتی ہے، یوں ہی کامیابی اور ناکامی بھی اسباب کے تابع ہوتی ہے، ناکامی کی سفر کو کامیابی میں تبدیل کرنے کا پہلا قدم یہی ہے کہ ناکامی اور انحطاط کے اسباب ووجوہات معلوم کئے جائیں، اس لئے اسی جذبے کے تحت خانقاہی نظام کے غیر مؤثر ہونے کے بنیادی عوامل وعناصر ذکر کرنے کی ایک کوشش کی جاتی ہے جس میں یہ بھی احتمال ہے کہ درست ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تجزیہ غلط اور خلاف واقع ہو۔ لیکن بہر حال امید ہے کہ یہ بحث فکر و نظر کے لئے ایک مفید دریچہ کھولنے کا ذریعہ بن جائے گا اور پختہ کار دل ودماغ کی توانائی صرف ہونے کے لئے ایک مفید میدان کھل جائے گا جس کے نتیجہ میں امید ہے کہ اصل اسباب کا سراغ لگایا جائے گا۔

اس ناکارہ کے محدود غور وفکر کی روشنی میں اس نظام کے غیر مؤثر ہونے کی مختلف وجوہات ہیں، جن میں سے کچھ اہم اسباب درج ذیل ہیں:

خانقاہی کام کو مستقل کام نہ سمجھنا

تصوف وسلوک کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ یہ خدمت دین کا ایک شعبہ ہے، جس کے ساتھ دینی احکام کا ایک ضروری حصہ متعلق ہے اور یہی ان احکام پر

عمل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کی ایک حیثیت اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ دین اور اس کے احکام و مسائل کو دل میں اتارنا اسی تصوف وسلوک کے ساتھ وابستہ ہے، اور کوئی چیز جب زبان و قالب سے بڑھ کر دل کا حصہ بن جاتی ہے تبھی اس پر اطمینان ہوتا ہے اور وہ زندگی و مزاج کا ایک ضروری حصہ بن جاتی ہے۔ علم سلوک واحسان کی اس حیثیت پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ دیگر شعبوں سے کوئی الگ تھلگ شعبہ نہیں ہے کہ کوئی چاہے تو اس کو اختیار کرے اور کوئی چاہے تو اس کے قریب بھی نہ آئے بلکہ دیگر تمام شعبوں میں استحکام اور دینی روح کو برقرار رکھنے کا یہی کامیاب اور مؤثر ذریعہ ہے ،اس لئے ایک کامیاب داعی، عالم اور مجاہد کے لئے بھی بقدرِ ضرورت اس راستے سے گزرنا پڑتا ہے تاکہ باطن کی اصلاح ہو کر نفس وشیطان کی کدورتوں سے محفوظ ہو جائے اور پھر ہر کوئی اپنی طبعی مزاج ورجحان کے مطابق کسی شعبے میں لگ کر خدمت کرتا رہے۔

اب ضروری یہ تھا کہ خانقاہی نظام پر خاطر خواہ توجہ دی جاتی اوراس کو خوب پروان چڑھانے میں پوری طرح صلاحیتیں صرف کی جاتیں، لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ اگر خانقاہی نظام اور اس کی غیر معمولی اہمیت کا خدمت دین کے دیگر شعبوں اوران کی اہمیت کے ساتھ ایک مقارنہ کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح نکھر کر سامنے آتی ہے، مثال کے طور پر خانقاہ اور مدارس کا مقارنہ کیا جائے کہ دونوں خدمتِ دین کے اہم اور بنیادی ذرائع ہیں اور دونوں میں کسی شعبے کے وجود یا اس کی اہمیت سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے، تاہم:

الف: مدارس کا بڑا مقصود اور اساسی ہدف یہ ہے کہ معاشرے میں دینی علوم وفنون کو پروان چڑھایا جائے، دینی علوم کے ماہر افراد معاشرے کو دئے جائیں تاکہ وہ لوگوں کی درست دینی رہنمائی کرتے رہیں۔ اس ہدف کا اولین دائرہ کار تمام معاشرہ نہیں ہے اور معاشرے کے ہر فرد کو عالم بنانا مطلوب نہیں ہے بلکہ بقدر کفایت افراد سے یہ مقصود حاصل ہوسکتا ہے۔ رہاں یہ کہ مطلوبہ افراد کی تعداد کتنی ہوگی؟ تو ظاہر ہے کہ ایک معاشرے کے افراد کروڑوں میں ہیں اور ساتھ زمانے کے نت نئ ضروریات اور تقاضے بھی ہیں، اس کے لئے خاطر خواہ افراد کی ضرورت ہے تبھی جاکر یہ مقصود اچھی طرح حاصل کیاجاسکتا ہے۔ ہمارے ہاں اس مقصود کے حصول کے لئے ہزاروں مدارس میدان عمل میں اپنی کردار ادا کررہے ہیں ،صرف وفاق المدارس سے منسلک مدارس کی تعداد بیس ہزار کی لگ بھگ ہے۔

ب: خانقاہی نظام کا بڑا مقصود اور بنیادی ہدف یہ ہے کہ لوگوں کے باطن کی اصلاح ہوجائے، ان میں نیک اخلاق اور محمود صفات کا بیج بویاجائے اور برے صفات واخلاق سے ان کو پاک کردیاجائے۔ اس ہدف کا دائرہ کار کوئی خاص یا چند افراد نہیں ہیں بلکہ ہر مکلف مسلمان ہے، ضروری نہیں ہے کہ سب لوگ خانقاہ ہی میں مقیم ہوں لیکن کم ازکم ضروری حد تک اصلاح نفس تو ہر شخص کی شرعی ضرورت ہے اور اس کا عام طریقہ یہی تصوف وسلوک ہے جس کو خانقاہی نظام سے تعبیر کیاجاتا ہے۔ غور کیاجائے تو ہمارے ہاں اس مقصود کی تکمیل کے لئے جو خانقاہیں موجودہیں، ان کی تعداد مدارس کی بنسبت بہت ہی کم بلکہ شاید نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مدارس کو خانقاہوں میں تبدیل کر دیا جائے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خود مدارس سے جو مقاصد واہداف وابستہ ہیں ان کی تکمیل کے لئے یہ موجودہ مدارس کافی نہیں ہیں اور مزید اس نظام میں بھی ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی ضرورت ہے ، لیکن بہر حال اہمیت اور دائرہ کار میں اس فرق وتفاوت کے باوجود خانقاہی نظام میں اس قدر کمی ہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ خانقاہی نظام اور اس سے جڑے مقاصد واہداف پر یا تو یقین نہیں ہے اور یا اگر یقین ہے تو بے ہمتی اور بے کاری کا دیمک ساتھ لگا ہے جس کی وجہ سے ضروری کاموں کی تکمیل بھی نہیں ہو رہی۔

رسمیت کی پابندی اور مقاصد سے غفلت

خانقاہ در اصل سلوک وتصوف کی تعمیل و تکمیل کے مرکز کا نام ہے، سلوک وتصوف باقاعدہ ایک اہم دینی شعبہ ہے جس کی حیثیت ایک مستقل علم وفن کی ہے، اس فن کے کچھ مقاصد ہیں جو شرعاً مطلوب اور ایک بے حد ضروری ولازم ہے، تصوف کا بنیادی اور اہم ہدف انہی مقاصد کا حاصل کرنا ہے۔ ان مقاصد کا جامع عنوان "تزکیہ نفس "اور "تصفیہ قلب" ہے کہ مذموم صفات واخلاق کی اصلاح ہو جائے اور مطلوب ومحمود عادات واخلاق سے باطن کو منور کیا جائے۔ خانقاہ کا بنیادی کام اور اساسی مقصد یہی چیز ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ دور کے بہت سے خانقاہوں میں ان چیزوں کو یا تو کوئی خاطر خواہ اہمیت ہی نہیں دی جاتی یا اگر کچھ اہمیت دی بھی جاتی ہے تو بھی اس کو مقصود کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔

رسمی طور پر بزرگان دین کے خانقاہی اعمال واشغال پر تو خوب خوب توجہ دی جاتی ہے اور ان میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کی جاتی، یوں ہی تصوف سے متعلق غیر مقصودی امور مثلاً کشف وکرامات اور ادب واحترام وغیرہ امور میں خوب خوب صلاحیتیں صرف کی جاتی ہیں اور اس میں بڑھنے کی حوصلہ افزائی اور پیچھے رہنے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے لیکن اخلاق کی درستگی اور باطن کی صفائی پر کما حقہ توجہ نہیں دی جاتی، لوگوں کی اخلاقی و عملی تربیت کا کوئی قابل ذکر اہتمام وانتظام نہیں ہوتا، اس لئے اصل مقصود حاصل نہیں ہوتا اور مطلوبہ نتائج وثمرات برآمد نہیں ہوتے۔

ہمارا محدود مشاہدہ اور کمزور خیال یہ ہے کہ رسم ورواج کی غیر ضروری پابندی اور اپنے مشائخ کے ساتھ غلو کی حد تک وابستگی یا اس کا اظہار بھی ان عناصر میں سے ایک اہم عنصر ہے جس سے تصوف وخانقاہی نظام میں بڑا ہی نقصان پیدا ہورہاہے۔ ایک تو تصوف وسلاسل کی تقسیم در تقسیم ہو رہی ہے، دوسرا بڑا نقصان یہ ہورہاہے کہ غیر ضروری چیزیں ضروری اشیاء اور مقاصد کی فہرست میں جگہ پارہی ہے جس کی بدولت مقاصد دھیمے دھیمے ختم ہوتے جارہے ہیں۔

اتباع شریعت میں کمزوری

صرف یہ نہیں ہے کہ خانقاہ دینی مرکز اور اہلِ خانقاہ عاقل بالغ مکلف انسان ہیں جن کو شرعی احکام کی پوری پابندی کرلینی چاہئے، بلکہ یہ مرکز اور اس کے ذمہ دار افراد معاشرے میں مقتدیٰ اور مثالی نمونے خیال کئے جاتے ہیں، اس لئے اتباع شریعت کی پوری پابندی اور اچھی طرح اہتمام کے ساتھ ساتھ ان کا کردار

وگفتار بالکل مثالی اور محتاط ہونا چاہیئے تاکہ عام افراد کے حق میں وہ کسی نظریاتی یا عملی کج روی کا باعث نہ بنے۔ اس لئے اگر کسی مباح وجائز کام کی وجہ سے لوگ کسی دینی غلط فہمی کے شکار ہوسکتے ہیں تو ایسے ذمہ افراد کے لئے اس کو ترک کرنا بعض اوقات ضروری بن جاتا ہے۔ اسی طرح عام افراد سے اگر کوئی گناہ و غلطی صادر ہوتی ہے تو اس کا اثر اسی پر پڑتا ہے لیکن دینی مناصب پر فائز ذمہ دار کی غلطی اور گناہ عموماً متعدی ہوجاتا ہے اور اس کی وجہ سے دیگر نظریاتی یا عملی گناہ بھی وجود میں آجاتے ہیں یا کم از کم گناہ کے صادر اور قابل برداشت سمجھا جانے کا راستہ کھل جاتا ہے۔

دور حاضر میں بہت سی خانقاہوں میں اتباع شریعت کے جذبے کی کمزوری نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے، اس بات کا جائزہ لینا تو خاصے تطویل کا باعث ہے کہ خانقاہی کام میں کہاں کہاں اور کس کس طرح شرعی احکام کی خلاف ورزی کی جاتی ہے؟ اور یہ اس کتاب کا مقصود بھی نہیں ہے، اللہ کرے کہ کسی صاحب علم کو اس بات کی توفیق نصیب ہوجائے اور وہ گہرائی وگیرائی کے ساتھ پورے نظام خانقاہ کا شرعی جائزہ لے لے۔ تاہم اگر احساس ہوجائے اور مزید ہمت سے کام لیا جائے تو اس خامی کو دور کرنا کوئی مشکل نہیں ہے خصوصاً خانقاہی ماحول میں ان جیسی باتوں پر قابو پانا کوئی مشکل نہیں کہ وہاں ماحول ہی محاسبہ اور مراقبے کا ہوتا ہے۔

قول وفعل کا تضاد

لوگوں کو زہد اور ترک دنیا وغیرہ نیک صفات اور محمود اخلاق کی تعلیم وتلقین کی جاتی ہے، لیکن ذمہ دار افراد کا اپنا طرزِ عمل اس سانچے میں پوری طرح

ڈھلا نہیں ہوتا۔ لوگوں کو دین اور ذکر وفکر کی طرف راغب کیا جاتا ہے لیکن خود دل کی دنیا آباد نہیں ہوتی۔ اتباع سنت اور محبت رسول ﷺ کا سبق دیا جاتا ہے لیکن اپنی زندگی اس کی پوری طرح نمائندگی کرتی ہے اور نہ ہی خانقاہی ماحول میں ان چیزوں کی عملی تصویر محسوس کی جاسکتی ہے حالانکہ انسان تو فطری طور پر کردار وعمل سے زیادہ سیکھنے کا شوقین ہے اور خود تزکیہ نفس اور تربیت اخلاق کے عمل کے لئے بھی مثالی نمونہ پیش کر دینا ضروری ہے۔ غرض ارباب خانقاہ کے کردار وگفتار میں تضاد ومخالفت بھی ان اہم اسباب میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے اس نظام کی افادیت اور تاثیر میں حد درجہ کمی واقع ہوتی ہے۔

نااہل لوگوں کا براجماں ہونا

خانقاہ بلکہ کسی بھی نظام وتحریک کے ناکامی اور کمزوری کا یہ ایک بنیادی سبب ہے۔ "صحیح بخاری" کی روایت ہے:

عن أبي هريرة قال: بينما النبي صلى الله عليه وسلم في مجلس يحدث القوم، جاءه أعرابي فقال: متى الساعة؟ فمضى رسول الله صلى الله عليه وسلم يحدث، فقال بعض القوم: سمع ما قال فكره ما قال. وقال بعضهم: بل لم يسمع، حتى إذا قضى حديثه قال: «أين – أراه – السائل عن الساعة» قال: ها أنا يا رسول الله، قال: «فإذا ضيعت

الأمانة فانتظر الساعة»، قال: كيف إضاعتها؟ قال: «إذا وسد الأمر إلى غير أهله فانتظر الساعة».[١]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن آپ ﷺ مجلس میں لوگوں باتیں فرمارہے تھے کہ ایک اعرابی صحابیؓ آئے اور کہنے لگے: قیامت کب ہوگی ؟ آپ ﷺ نے اپنی بات جاری رکھی، اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ آپؐ نے بات سنی مگر اچھی نہیں لگی، اور بعض نے کہا کہ: آپؐ نے بات نہیں سنی، یہاں تک کہ آپ بات مکمل کرکے فرمانے لگے: کہاں ہے؟ (میرا خیال ہے) قیامت کے بارے میں پوچھنے والا، اس نے عرض کیا حضور میں ہوں، فرمایا: جب امانت ضائع ہونے لگے تو قیامت کا انتظار کرو، عرض کیا: امانت کیسے ضائع ہوگی؟ فرمایا: جب کام نااہل کے حوالہ کیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔"

یہاں جو نا اہل کے بڑے بن جانے کے وقت قیامت کے انتظار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کی مختلف وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ایسے شخص سے ارشاد امت واصلاح احوال کی توقع بے جا بلکہ خود رشد وصلاح کی امید بھی بے محل ثابت ہوجاتی ہے، ایسے شخص میں چونکہ نا اہلیت ہوتی ہے اور ساتھ بڑاپن اور عزت ودبدبہ بھی ہوتا ہے اس لئے ایک آدھ بار تنبیہ ورہنمائی سے اس کا سدھرنا ممکن نہیں ہوتا اور زیادہ بار رشد وہدایت کی بات سننے کی اس میں

[١] صحيح البخاري: باب من سئل علما وهو مشتغل في حديثه، فأتم الحديث ثم أجاب السائل، ج١ص٢١.

لیاقت و تحمل نہیں ہوتی۔اس لئے نتیجہ بہر صورت یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اصلاحی کوششیں بے سود ثابت ہو جاتی ہیں آخر کار قیامت ہی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

یوں تو کوئی بھی منصب نا اہل کے حوالہ کر دیا جائے تو بے انصافی اور ماتحت لوگوں کے ساتھ ظلم وتعدی کے مترادف ہے چاہے وہ دنیوی عہدہ ہو یا دینی منصب۔ لیکن چونکہ دین سب چیزوں سے زیادہ عزیز اور قابل التفات سرمایہ ہے،اس لئے دینی منصب میں اس طرح بے جا تصرفات کا نقصان مزید زیادہ ہوتا ہے اور دینی مناصب میں بھی خصوصیت کے ساتھ خانقاہی نظام میں اگر اس طرح کوئی بے جا اقدام کیاجائے تو اس کے اثرات نہایت خطرناک ثابت ہوتے ہیں، ہمارے ہاں "خانقاہیں" "درگاہوں" میں تبدیلی ہوئے ہیں،اس کی بڑی وجہ یہی ہے۔

ایسی خانقاہوں میں تزکیہ نفس کا بلند تر مقصود دور دور تک حاصل نہیں ہوتا، بلکہ ایسی جگہیں یا تو دنیوی کر وفر کا میدان بن جاتی ہیں اور یا تو شرک وبدعات اور رسوم ورواج کے اڈے۔خانقاہی نظام کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ وہاں اعتراض وتنقید کا مادہ کمزور ہوتا ہے اور شیخ ومرشد کے ساتھ حسن ظن،ادب واحترام اور اگر کوئی قابل اعتراض پہلو سامنے آجائے تو تاویل کا التزام ہوتا ہے،اس لئے نا اہل شیوخ باطنی صفات واخلاق کے لحاظ سے نہایت پستی کے شکار ہو جاتے ہیں اور پھر اپنی اس منصب اور اس کی بلندی وبرتری کو بچانے کے لئے وہ ایسے حربے استعمال کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔

نااہل کی دخل اندازی کی دوصورتیں

خانقاہی نظام میں نااہل افراد کی دخل اندازی بنیادی طور پر دو صورتوں میں ہوتی ہیں اور دونوں ہی کا ہمارے ہاں بہتات نظر آتا ہے:

الف: پہلی صورت: خاندانی وراثت۔ ہمارے یہاں کا مزاج بن چکا ہے کہ باپ کے انتقال کرنے کے بعد بیٹا اس کا منصب سنبھال لیتا ہے چاہے اس منصب کی لیاقت بیٹے میں موجود نہ بھی ہو، اگر باپ کسی خانقاہ کا ذمہ دار تھا تو بیٹا خواہ کیسا ہی ہو لیکن خانقاہ کا میر کارواں وہی قرار دیا جائے گا۔ مناصب اور عہدوں پر اجارہ داری کی یہ ایک شکل ہے جو دنیوی عہدوں میں بھی مذموم ہے دینی مناصب میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس چیز کی وجہ سے خانقاہی نظام کو بے تحاشا نقصان پہنچا ہے، بہت سے بزرگوں کی خانقاہیں جہاں سے دوائے دل تقسیم ہوتے تھے وہ کاروباری اڈوں اور عزت ومال کے دھندوں کی تصویر بن چکے ہیں، جہاں کبھی اتباع سنت کی اہمیت اور بدعات ورسومات کی نفرت ومذمت کی تحریک اٹھتی تھی وہاں اب بدعات ورسومات کی ریاست ہے۔ یاد رہے کہ نقصان صرف یہی نہیں ہے کہ ایک آدھ خانقاہوں میں تصوف وسلوک کے عمل کا تسلسل برقرار نہ رہا، ایسا ہونا تو حدوث وحدت کی اس جہاں میں کوئی اچنبھی بات نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اور اصل نقصان یہ ہے کہ عام مسلمانوں اور معاشرے کی غالب اکثریت کے دل ودماغ میں تصوف وسلوک کی جو کچھ تصویر واہمیت تھی، گنتی کے چند خانقاہوں کی غلط رویہ کی وجہ سے وہ ذہنیت تبدیل ہوگئی اور اب نئی نسل اس ادارے کو وہ اہمیت دینے پر کسی

طرح آمادہ نہیں ہوتی جس کی وہ مستحق ہے،اس طبقہ کے بڑے خود اس بات کے قائل ومعترف رہے ہیں۔

ب: دوسری صورت:خلافت کی تقسیم میں غیر معمولی سخاوت سے کام لینا۔

دوسری وہ بنیادی چیز جس کے نتیجے میں خانقاہی نظام میں نااہل افراد کی دخل اندازی شروع ہوئی اور متعدد خانقاہیں نااہل افراد کے زیر نگیں آگئیں جس کی وجہ سے عام مسلمان خود اس نظام سے بیزاری کے شکار ہوئے، وہ یہی خلافت دینے میں بے احتیاطی وبے اعتدالی کا رجحان ہے۔

پرانے بزرگوں کے ہاں اس باب میں بہت ہی احتیاط سے کام لیا جاتا تھا اور جب تک مختلف مجاہدات کے ذریعے نفس کا زور بالکل کمزور نہ پڑ جاتا، تب تک ایسے مرید کے سرپر خلافت کا بوجھ ڈالنے سے گریز کرتے تھے کیونکہ کسی کو خلافت دینا ایک اعزاز ومنصب ہی نہیں ہے بلکہ ایک بھاری ذمہ داری اور بوجھ برداری ہے اور ظاہر ہے کہ کسی پر اتنا ہی بوجھ لادنا مناسب ہو سکتا ہے جتنے بوجھ کو وہ اچھی طرح اٹھا کر منزلِ مقصود تک لے جاسکے، اگر اتنا بوجھ لاد دیا جائے جس کو ہدف تک پہنچانے سے پہلے ہی بے چارہ پہنچانے والا اس کے تلے دب جائے، تو یہ ظلم وزیادتی تو ہو سکتی ہے لیکن اعزاز واکرام سے اس کو تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔یوں ہی اگر کوئی شخص ایک صاحب کا بوجھ پہنچانے کے لئے راستہ میں دس بیس افراد یا ان کے مال ومتاع کی ضیاع کا باعث بنتا ہے تو بھی یہ نقصان وخسارہ ہی شمار ہو گا۔

بس یہی صورت حال خلافت کی بھی ہے کہ نفس میں جب تک خود کمال اور نیکی و شریعت پر پختگی واستحکام کی سعادت حاصل نہ ہو، اس سے یہ توقع بجا نہیں ہے کہ وہ دیگر لوگوں کو نفس و شیطان کی گرفت سے بچا بچا کر قربِ الٰہی کے منزل تک پہنچائے گا، ناپختگی میں خلافت مل جانے اور عملی طور پر ارشاد وہدایت کا منصب سنبھالنے میں یہی خطرہ غالب ہوتا ہے کہ جاہ ومال کے میدان میں کود پڑنے کی وجہ سے خود نفس کی مکاری میں پھنس کر ترقی معکوس کا شکار نہ ہو جائے۔ اس لئے قدیم بزرگان دین کو دیکھا جائے تو سالہا سال گزارنے کے باوجود بھی وہ ہر کسی کو خلیفہ مقرر نہ کرتے تھے بلکہ اس باب میں وہ بڑے محتاط رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری زندگی خانقاہ کی خدمت میں گزری اور ذاکر وشاغل افراد بھی ہمہ تن موجود رہے مگر انتقال کے بعد جب ان کی خلفاء کو گنا جاتا ہے تو ان کی تعداد اتنی ہی ہوتی ہے جن کو آسانی کے ساتھ انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔

ہمارے ہاں بہت سی خانقاہوں میں اس چیز کی بھی بہتات ہے کہ وہ خلافت کی تقسیم میں بڑی فراخدلی اور سخاوت سے کام لیتے ہیں، اور بہت سے افراد کی زندگی ہی میں ان کے خلفاء کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو جاتی ہیں۔ یہاں ایسے شیوخ سے بدگمانی کرنی مقصود ہے نہ لوگوں کو ان سے خواہ مخواہ بدظن کرنے کا خیال ہے اور ہمیں اس کا حق بھی نہیں ہے بلکہ حسن ظن کا تقاضا یہی ہے کہ وہ کسی دینی مقصد کے پیش نظر اخلاص کے جذبے سے ایسا کرتے ہیں چنانچہ بعض نیک لوگوں کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ خلافت ملنے کے بعد طالبین آئیں گے اور وہ اس کے ساتھ منسلک ہو جائیں گے تو یہ خود بخود محنت کرنے لگ جائے گا اور ذکر وشغل کا

ماحول بھی بڑھتا رہے گا جس کا اثر معاشرے پر پڑے گا۔ یہ ایک نیک نیت اور مستحسن جذبہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے نقصانات اور غلط اثرات بھی کچھ کم نہیں ہیں، دیکھا یہی گیا ہے اور معقول بھی یہی ہے کہ ایسے صورت حال میں دینی فائدہ کے بجائے دینی نقصان و مضرت کی صورتیں زیادہ پیدا ہو جاتی ہیں۔

ایسے خلفاء کی چونکہ واقعی تربیت اور اخلاقی تصفیہ مکمل نہیں ہو پاتا یا مکمل تو ہوتا ہے لیکن اس میں رسوخ واستقامت کا مادہ ابھی مکمل نہیں ہوا ہوتا، اس لئے منصب ملنے اور اعزازی نام ومقام ملنے کے بعد بعض اوقات وہ ایسے حرکات کا ارتکاب کر جاتے ہیں جن سے سارا طبقہ اور پورا نظام بدنام قرار پاتا ہے۔ اس ناکارہ نے خود ایسے خلفاء بھی دیکھے ہے جو باجماعت نماز وغیرہ ظاہری واجبات میں بھی کوتاہی کے عادی ہیں اور ایسے لوگوں کا بھی مشاہدہ ہوا ہے جو ظاہری محرمات تک میں مبتلا ہوتے ہیں۔

دینی شعبوں کی مزاحمتی فضاء

پچھلے دو صدیوں میں متعدد ایسے عوامل پیدا ہوئے جن کی وجہ سے دین کی کاملیت اور جامعیت کے اعتقاد والی فضاء کمزور تر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کو دین کی سیادت وسلطنت سے نکالنے کی محنت کی جاتی ہے۔ عام معاشرے پر اس سیکولر یلغار کا کیا اثر پڑا؟ وہ تو ایک الگ اور مستقل موضوع ہے لیکن یہاں جو بات بتانے کی ہے وہ یہ ہے کہ دینی طبقات اور خدمت دین کے مختلف شعبوں پر اس کا ایک مذموم اثر یہ پڑا کہ ہر شعبے والے غیر شعوری طور پر دوسرے شعبوں کو ان کی واقعی اہمیت ومقام دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے

۔ چنانچہ کبھی دوسرے کسی شعبے یا اس سے وابستہ افراد کی تنقیص کرتے ہیں، بعض شعبوں والوں کی کوشش ہوتی ہے کہ تمام لوگ ہر جگہ سے ہٹ کٹ کر ہمارے ہاں ساتھ مل کر دین کا کام کرنے لگ جائیں، اس لئے وہ دیگر شعبوں سے وابستہ افراد کو اپنے ساتھ لگانے میں مصروف ہو جاتے ہیں، بعض شعبوں والے اپنے ہی خاص شعبہ کی ایسے انداز میں اہمیت جتاتے ہیں جس سے "حبّ علی نہیں، بغض معاویہ ہے" والا مقولہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

تصوف کا شعبہ بھی اس مزاحمتی مذموم فضاء سے محفوظ نہ رہ سکا، چنانچہ رقابت کے میدان میں خود اس سے وابستہ افراد آگے نکلنے لگے اور دیگر شعبوں والوں نے بھی اس کے ساتھ یہی رویہ شروع کیا، طرح طرح سے اس کی اہمیت گھٹانے میں مصروف عمل رہ گئے۔ افسوس بالائے افسوس یہ ہے کہ پھر ایک ہی شعبے کے مختلف طبقات میں بھی یہی تزاحم و تقابل کا سرطان پیدا ہونے لگا، اس میں بھی رفتہ رفتہ تناؤ ہی پیدا ہوتا رہا جس سے بڑے بھیانک اور افسوسناک نتائج پیدا ہوئے۔ اس سے خود خانقاہی نظام کے اندر بھی محدودیت کا مزاج اور ضد وعناد کی خرابی جنم لینے لگی اور عام معاشرے میں بھی اس حوالہ سے رائے عامہ میں فرق آنا شروع ہوا۔

فتنوں کا سیلِ رواں

دینی شعبوں (خانقاہی نظام سمیت) کی تاثیر وافادیت کم ہونے کا ایک اہم اور بنیادی سبب "فتنوں کی کثرت" بھی ہے، پہلے زمانے میں اس قدر فتنے نہ تھے، آج کیفیت اور مقدار ہر لحاظ سے اس میں اضافہ ہوا ہے اور یہ سلسلہ رکنے کا نام

نہیں رہابلکہ مسلسل بڑھتاہی رہاہے چنانچہ آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ سر اٹھارہاہے۔ فتنوں کے اس سیلِ رواں کا اثر صرف خانقاہی نظام ہی پر نہیں پڑا بلکہ خدمت دین کے تمام شعبے اس سے برابر متاثر ہوئے، یہ فتنے "سونامی" کے مانند ہے جس کی ضد میں جو چیز بھی سامنے آئی ، دیکھتے ہی دیکھتے اس کا حصہ بن کر اس کی قوت وشدت میں اضافے کا ذریعہ ثابت ہوئی۔

فتنوں کے سیلاب کا اڈنا اگرچہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے بلکہ ان تکوینی امور میں سے ہے جس پر انسان تسلیم ورضا کا ہی مظاہرہ کر سکتا ہے، لیکن اسباب کی حد تک ہر شخص اس بات کا مکلف ہوتا ہے کہ اپنی استطاعت کے بقدر خود بھی فتنے سے بچنے کی کوشش کرتا رہے اور امت کو بھی اس کی ضد میں آنے سے بچانے میں اپنا مقدور بھر کردار ادا کرتا رہے، فتنوں کے طوفان کے وقت ہاتھ پے ہاتھ دھرے بیٹھنا کہاں درست ہے! ہمیں تو اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ انسانی تاریخ کے سب سے ہولناک منظر یعنی قیامت کے نمودار ہوتے وقت بھی کوئی بے عملی کا شکار نہ رہے، چنانچہ "مسند احمد" کی روایت ہے:

عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " إن قامت على أحدكم القيامة، وفي يده فسيلة فليغرسها "[1]

---

[1] مسند أحمد ط الرسالة: ج٢٠ص ٢٥١.رقم الحديث: ١٢٩٠٢.

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی پر قیامت قائم ہو جائے اور اس کے ہاتھ میں کھجور کا پودا ہو، تب بھی اسے چاہئے کہ اسے گاڑ دے"۔

لہٰذا فتنوں کی کثرت اور بے دینی کی محنت عام ہونے کے زمانے میں کرنے کا کام یہ تھا کہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق ان فتنوں کا مقابلہ کرتا، دینی خدمت کے مختلف شعبوں میں مقدار اور معیار ہر لحاظ سے عمدگی اور ترقی کرنے کی بھرپور کوشش کرتا۔ اگر فتنوں، گمراہیوں اور دین سے دوری کے لئے جان ومال خرچ کئے جاسکتے ہیں، عزت ومنصب اور غیرت وحمیت کی قربانی دی جاسکتی ہے اور اس کے علاوہ ہزار اختلافات کے باوجود صفوں میں یکجہتی وجود میں آتی ہے تو کیوں نہ حق کی نشرواشاعت اور دین کی سربلندی کے لئے ہر طرح کی قربانی دی جائے، قرآن کریم نے بڑے حکیمانہ انداز میں مسلمان کو للکارا، فرمایا:

{وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا}.[١]

ترجمہ: "اور ان لوگوں کا پیچھا کرنے سے ہمت نہ ہارو اگر تم تکلیف اٹھاتے ہو تو وہ بھی تمہاری طرح تکلیف اٹھاتے ہیں حالانکہ تم اللہ سے جس چیز کے امیدوار ہو وہ نہیں ہیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت ولا ہے"۔

---

[١] النساء: ١٠٤.

لیکن افسوس کہ ہماری کم ہمتی وغیرہ مختلف عناصر کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ دینی طبقات اور خدمت دین کے مختلف شعبے محدود ہوتے گئے، ایک دوسرے کے ساتھ چلنے اور تعاون وتناصر کا برتاؤ عنقاء ہوتا گیا۔

راہِ تصوف اور تطہیر کی ضرورت

کتاب کے شروع علم سلوک وتصوف کی جو کچھ اہمیت بیان کی گئی، اس کی طرف امت کی مسلمہ کی ضرورت اور احتیاج کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اپنی جگہ بالکل برحق ہے، عقلی اور تجرباتی طور پر اس میں دو رائے نہیں ہیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے معاشرے میں سلوک وتصوف کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ درست اور شرعی ضرورت ہے، بلکہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس راستے بعض نااہل اور ناعاقبت اندیش لوگوں نے بدعات ومنکرات کا بھی بہت کچھ سامان درآمد کیا ہے جس کو کبھی طریقت اور بعض اوقات خود شریعت کے نام پر گوارا کر لیا جاتا ہے۔ بیسیوں ایسی چیزیں ہیں جس کے حرام وممنوع ہونے میں کم از کم ائمہ اربعہ کا کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن تصوف اور اس سے وابستہ

بعض طبقات اس کو سلوک وطریقت کے نام پر اختیار کئے ہوئے ہیں جن میں بلا مبالغہ ہزاروں افراد شریک ہوتے ہیں۔

کیا تصوف کو بالکل چھوڑا نہ جائے!

اس تناظر میں یہ سوال اٹھ کر امت کے بہی خواہوں کی توجہ اپنی طرف پھیرتا ہے کہ ان منکرات کا کیونکر سدّباب کیا جائے؟ کیا ان خرابیوں سے نمٹنے کے لئے خود سلوک وتصوف کے شعبہ ہی کو خیرباد کیا جائے اور اس کو دینی شعبوں یا

دینی علوم وفنون کے زمرے سے نکال کر ممنوع وبدعات کی فہرست میں ڈال دیاجائے یا بر آمد ہونے والے اعمال ومنکرات کا مقابلہ کیاجائے اوراس کی روک تھام کے لئے کوئی بند باندھاجائے تاکہ اسلامی معاشرے کواس سیل رواں کے شکار ہونے سے محفوظ رکھاجاسکے!

امت کے ماضی وحال پر غور کیاجائے تو اچھی طرح واضح ہو جاتاہے کہ اس سلسلے میں جمہور اہل علم کی ہمیشہ سے یہ روش رہی ہے کہ پورے شعبہ کو چھوڑنے اور ممنوع ٹھہرانے کی بجائے درآمد کئے جانےوالے منکرات وبدعات کا مقابلہ کیاجائے اور یہی بات عقل ونقل کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ کر مناسب ومتوازن معلوم ہوتی ہے جس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ تصوف وسلوک کے ساتھ بہت سے ایسے امور ومقاصد وابستہ ہیں جن کا حصول شرعاضروری اور ان میں غفلت وسستی کرنا شرعا جرم اور ناجائز ہےاور سلوک وتصوف کے متوارث ترتیب کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا متبادل راستہ موجود نہیں ہے جو عام افراد امت کے حق میں مفید مطلب بھی ہو اور قابل عمل بھی۔ لہٰذا خود تصوف وسلوک کی مخالفت کے بجائے پوری توانائی اسی پر صرف کرلینی چاہئے کہ آنے والے منکرات کا راستہ بند ہو جائے۔

اصلاحِ تصوف کا تسلسل

یوں تو ان تمام اہل علم نے اس باب میں خدمت انجام دی ہیں جن کو سلوک وتصوف کے عملی مراحل سے گزرنے کا تجربہ ہوا تھااور استعداد وصلاحیت، مزاج ومذاق، موقع ومحل وغیرہ عناصر کی بنیاد پر ان کے مساعی میں باہم تفاوت بھی

رہاہے تاہم درج ذیل حضرات کا اس سلسلہ میں بڑااہم کردار رہاہے اور انہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں ان رسومات وبدعات کی تردید میں غیر معمولی محنت صرف فرمائی ہیں جو تصوف وسلوک کے گلی کوچہ میں در آئے تھے یا آرہے تھے اوران کی خدمات کے نتیجے میں ایک حد تک اس شعبے کی تطہیر تنقیح ہوئی تھی۔

امام قشیری رحمہ اللہ کی اصلاحات

امام قشیری (تاریخ وفات: ٤٦٥ھ) انہوں نے اپنے زمانے میں تصوف کے علمی وعملی دونوں میدانوں کو ان ناجائز رسوم وبدعات سے پاک وصاف کرنے میں بڑی محنت اٹھائی تھی۔ان کی کتاب "رسالہ قشیریہ "تصوف وسلوک کی قدیم اوراہم کتب میں سے شمار کی جاتی ہے، اس میں اس فن کے ائمہ واعلام کے اقوال وملفوظات، ان کے عقائد ونظریات کا بھی ذکر ہے اور تصوف کے مقاصد وثمرات کا بھی بیان ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ کتاب تصوف کے مستند مصادر میں سے ایک اہم مرجع کی حیثیت رکھتی ہے اور بعد میں جتنی کتابیں اس سلسلے میں لکھی گئیں ہیں، ان میں کسی نہ کسی درجہ میں استفادہ کیا گیاہے۔

علامہ زرّوق مالکی رحمہ اللہ

علامہ احمد زرّوق فاسی (تاریخ ولادت ٨٤٦ھ۔وفات ٨٩٩ھ)۔ آپ فاس کے رہنے والے ہے، فروعی لحاظ سے مالکی ہے۔اپنی دادی کی تربیت وغیرہ اسباب کی برکت سے بچپن ہی سے سلوک وتصوف کے ساتھ طبعی وابستگی برقرار رہی اور زندگی بھر اس میدان کے ساتھ وابستہ رہے۔تصوف کے باب میں متعدد کتابیں کتب ورسائل تالیف فرمائے ہیں جن میں سے "عدۃ المرید الصادق" اور " قواعد

التصوف" زیادہ مفید ہیں۔ان کتابوں میں جگہ جگہ ان غلطیوں کے اصلاح وازالہ کرنے کی کوششیں فرمائی ہے جو اس زمانے میں اس باب میں پیدا ہوئے تھے۔

حضرت مجدّد صاحب رحمہ اللہ کی اصلاحات

حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ(تاریخ ولادت ۹۷۱ھ۔وفات ۱۰۳۴ھ) آپ صحیح معنی میں مجدّد تھے، آپ نے جس طرح دین وشریعت کے دیگر مختلف شعبوں کے اصلاح و درستگی فرمائی، یوں ہی سلوک وتصوف کا میدان بھی آپ کی اصلاحات ومساعی کا دائرہ کار رہا بلکہ اس باب میں بڑی سخاوت کے ساتھ اپنی خداداد صلاحیتیں صرف فرمائی۔ آپ کی مکتوبات اس حوالہ سے ایک بیش بہا خزانہ ہے۔

امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی اصلاحات

امام شاہ ولی اللہ صاحب(تاریخ ولادت:۱۱۱۴ھ۔وفات:۱۱۷۶ھ)حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ کے بعد سرزمین پاک وہند پر آپ کی دینی خدمات، اصلاحی مساعی شاید سب سے زیادہ معلوم ہوتے ہیں،یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے اہل علم میں سے ایک جم غفیر نے آپ کو اپنے زمانے کا مجدّد قرار دیاہے۔ آپ نے اپنی زندگیوں میں دین کی سربلندی اور شریعت کے سرحدات کی حفاظت کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں،ان میں سے ایک اہم اور نمایاں خدمت یہ بھی ہے کہ اپنے عہد میں تصوف وسلوک کے راستے سے در آنے والے رسوم وبدعات کا کھل کر مقابلہ کیا، مختلف محاذوں کی طرح اس محاذ میں بھی آپ کو خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔اس سلسلہ میں آپ نے متعدد کتابیں بھی تصنیف فرمائی ، "ہمعات"،

"سطعات"، "لمعات" اور "الطاف القدس" وغیرہ کتابیں اسی موضوع پر آپ نے تصنیف فرمائی ہیں اور اپنی مشہور و مفید کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" وغیرہ میں بھی اس موضوع پر قابلِ قدر بحثیں فرمائی ہیں۔

علامہ رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کی اصلاحات

علامہ رشید احمد گنگوہی (تاریخ ولادت: ۱۲۴۸ھ۔ تاریخ وفات: ۱۳۲۲ھ) آپ نے اس موضوع پر کوئی مستقل تو تصنیف نہیں فرمائی۔

"رسالہ مکیہ" کے چند فصول کے ترجمہ کے علاوہ اس موضوع پر آپ کی کسی مستقل کتاب کا اس ناکارہ کو علم نہیں ہے، تاہم عملی زندگی کا بڑا محور یہی رہا کہ اپنے عہد میں دین و شریعت کے نام پر عموماً اور تصوف و سلوک کے عنوان سے خاص طور پر جو بدعات و رسومات داخل ہوگئیں تھیں اور ان کو دین وایمان کا حصہ سمجھا جارہا تھا، یا طریقت و معرفت کے نام پر ان کو مقدس قرار دیا جارہا تھا، ان کا خوب مقابلہ کیا اور اس باب میں پوری ہوشیاری، جوانمردی اور استقامت کے ساتھ مصروف رہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ کی اصلاحات

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ (تاریخ ولادت: ۱۲۸۰ھ۔ تاریخ وفات: ۱۳۶۲ھ)۔ آپ کی زندگی بھی ہمہ جہت رہی اور دین و شریعت کی تقریباً تمام شعبوں میں ہمہ گیر خدمات انجام دی۔ تاہم بنیادی طور پر آپ کی زندگی تصوف و سلوک کے ساتھ وابستہ رہی، چنانچہ پوری زندگی خانقاہ میں گزاری ، سو سے زیادہ افراد تو ایسے ہیں جو آپ کی اصلاح و تربیت کے تمام

مراحل سے گزر کر اجازت وخلافت کے منصب پر فائز ہو چکے تھے۔ آپ نے دیگر دینی شعبوں کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر سلوک وتصوف کے میدان کو اپنی تجدیدی خدمات کا خاص جولان گاہ بنائے رکھا اور تقریباً تمام پہلوؤں سے اس کی اچھی طرح حد بندی کر کے بے بنیاد رسوم وبدعات کا اچھی طرح ازالہ فرمایا۔اس موضوع پر آپ کی مستقل کتابیں بھی دسیوں کی تعداد میں شاہد عدل ہیں اور آپ کے خطبات وملفوظات کے خزانے بھی اس سے بھرے پڑے ہیں۔

تصوف سے متعلق مولانا کیلانی صاحب کے ۱۵ اشکالات اور ان کے جوابات

یوں تو تصوف کے ناقدین بہت ہیں اور اس حوالہ سے تالیفی کام بھی کافی ہوا ہے لیکن اہل حدیث کے ایک صاحبِ قلم عالم دین مولانا عبد الرحمن کیلانی صاحب مرحوم نے تصوف کی نقد وتنقید پر "شریعت وتصوف" کے نام سے ایک ضخیم کتاب تالیف فرمائی ہے جس میں انہوں نے تصوف اور اہل تصوف کے حوالہ سے بہت سے اشکالات واعتراضات ذکر فرمائے ہیں، اور کتاب کے آخر میں تصوف کے حوالہ سے متعدد پندرہ ۱۵ سوالات واشکالات قائم فرمائے ہیں اور ساتھ ذکر کیا ہے کہ اگر تصوف وسلوک واقعۃً شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے تو "مشائخ عظام" ان سوالات کے جواب دینے کی تکلیف فرمائیں۔ یہ ناکارہ اگرچہ اس خطاب میں بالکل شامل نہیں ہے لیکن دو باتوں کے پیش نظر رہنے کی وجہ سے جواب دینے کی ہمت کر رہا ہے:

الف: "مشائخ عظام" کے لئے اس وقت بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دینی انحطاط اور امت کی ناگفتہ بہ حالت کو راہِ راست سے

قریب تر کرنے کا درد ایسا ہے جس کی وجہ سے ہر دین دار شخص کی مصروفیات میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوا ہے، اس لئے شاید ان کو اس قسم کے سوالات کے جواب دینے کا موقع مہیانہ ہو۔

ب: ناقدین کی طرف سے تصوف کے حوالے سے اس قسم کے اشکالات بار بار اٹھائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے ملت کا بہت نقصان ہو تا ہے، اس لئے ان کا منصفانہ جائزہ لینا مناسب معلوم ہو تا ہے۔ اسی جذبے سے یہاں وہ سوالات اور ان کے مختصر جوابات ذکر کئے جاتے ہیں۔

مولانا کیلانی صاحب مرحوم کی کتاب "شریعت و تصوف" میں ہے:[۱]

"مشائخ عظام سے چند سوالات": اس کتاب میں دو باتوں کی وضاحت کی گئی ہے:

ا: دین طریقت بذات خود ایک الگ دین ہے جس کے اپنے مخصوص عقائد و نظریات ہیں۔[۲]

---

[۱] شریعت و تصوف، ص ۵۲۴.

[۲] قطعاً خلاف واقع اور بالکل بے بنیاد دعویٰ ہے جس کی وضاحت کے لئے اسی کتاب کا پہلا باب ملاحظہ فرمائیں۔

۲: جو شخص یہ دین اختیار کرتا ہے تو اس پر اسی کا رنگ غالب آجاتا ہے اور اس کے پہلے دین (مثلا اسلام، عیسائیت یا ہندو مت وغیرہ) کی حیثیت ثانوی بن کر رہ جاتی ہے، اگرچہ وہ زبانی اس کی تردید بھی کرتا رہے۔[۱]

اب ہمارے صوفیاء کو اصرار ہے کہ طریقت، شریعت ہی سے ماخوذ ہے، شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں[۲]۔ اگر اُن کا یہ دعوی صحیح ہے، تو کیا براہ کرم درج ذیل سوالات کا جواب دینے کی تکلیف فرمائیں گے۔

"پہلا اشکال وجواب"

ا۔ کیا وحدت الوجود کا عقیدہ یا حلول و شہود کے عقائد کی ازروئے شرع گنجائش ہے؟ اگر ہے تو دلائل سے مطلع فرمائیں۔ ورنہ یہ بتلائیں کہ ایسے عقائد کے حامل صوفیاء کی حمایت کیوں کی جاتی ہے؟"

جواب:

الف: کسی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے حلول کا عقیدہ تو بالکل کفر ہے، جہاں تک وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بات ہے تو اس کی مختلف تشریحات کی جاتی ہیں

---

[۱] محض افسانہ ہی ہے۔ جہاں تک "الصوفی لا مذہب لہ" والا جملہ ہے تو تصوف کی صحت اس پر کسی طرح موقوف نہیں ہے، اور اس جملے کا مطلب بھی وہ ہرگز نہیں ہے جس کا فاضل مؤلف مرحوم نے حصر کے ساتھ دعویٰ کیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی اپنی من مانی و من چاہی نہ کرے بلکہ اپنے معتمد مشائخ کی ہدایات پر عمل کرتا رہے۔ اب مستند مشائخ کون ہیں؟ کتب تصوف میں شیخ و مرشد کی جو شرائط ذکر کی گئی ہیں، ان کو ایک نظر دیکھ لیا جائے تو بات بالکل صاف ہو جائے گی ان شاء اللہ۔

[۲] اس اصرار کے باوجود کیوں ان سے بلاوجہ بدگمان ہو جایا جائے اور ان کے سر وہ چیزیں بھی تھوپ دی جائیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں۔

اور کی جاسکتی ہے جن میں سے بعض تشریحات ایسی بھی ممکن ہیں جن کے نتیجے میں یقینی طور پر وجود خداوندی کا انکار، غیر اللہ کو اللہ کہنا، اللہ تعالیٰ کی توہین وتذلیل یا شرائع واحکام کا انکار کرنا لازم آتا ہے، اس تفسیر کے مطابق تو ایسا عقیدہ رکھنا یقیناً کفر ہے اور اگر کسی شخص کے متعلق واقعۃً ثابت ہو جائے کہ وہ اس معنیٰ میں وحدت الوجود یا وحدت الشہود کا مدعی ہے تو اس کو مسلمان سمجھنا ہی مشکل ہے چہ جائیکہ اس کو صوفی ہونے کا اعزاز حاصل ہو سکے۔ لیکن معتمد اہل تصوف سے یہ تشریح ثابت نہیں ہے اور ان کے نزدیک ان الفاظ کا جو مفہوم ہے، اس میں یہ اور اس جیسی دیگر عناصر حرمت موجود نہیں، اسی لئے غلط تشریح کرنے والوں کی غلط تشریح کی وجہ سے ان لوگوں کو الزام نہیں دیا جاسکتا جو اس سے بالکل بے زار اور درست منہج پر قائم تھے۔

ب: علم تصوف واحسان کے لئے ان تینوں مسائل کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ پورا علم وفن صرف ان مسائل سے عبارت یا انہی پر موقوف ہے؟ اگر نہیں، اور یقیناً نہیں تو پورے فن کو کیونکر "الگ دین" قرار دیا جارہا ہے؟ وحدت الوجود کا علمبردار شیخ ابن عربی مرحوم ہے جس کی تاریخ وفات ۶۳۸ھ ہے اور وحدت الشہود کے بڑے علمبردار حضرت (مجدد الف ثانی) شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ ہے جن کی تاریخِ وفات ۱۰۳۴ھ ہے، تو کیا ان حضرات سے پہلے علم تصوف وسلوک موجود نہ تھا؟

"دوسرا اشکال وجواب"

"۲۔ کیا اسلام میں پختہ قبریں بنانے، ان پر سربفلک عمارات تعمیر کرنے، ان پر چراغ جلانے، روشنیاں کرنے، جھاڑو دینے، غلاف چڑھانے، اعتکاف بیٹھنے، طواف کرنے کا جواز ہے؟"

ج: پختہ قبر بنانا، ان پر قبے بنانا، بلاضرورت روشنی کا التزام کرنا، غلاف چڑھانا اور اس کا طواف کرنا ناجائز اور ممنوع ہیں، اعتکاف سے مراد اگر یہ ہے کہ جس طرح مسجد میں تقرب وعبادت کی نیت سے رہا جاتا ہے اسی طرح قبر کے پاس بھی رہا جائے تو یہ بھی بدعت ہے۔ اگر زیارت کے لئے کوئی حاضر ہو یا وہاں مراقبہ کرے اور وہ مراقبہ ان جیسے تمام منکرات سے خالی ہو تو اس کی ممانعت کیوں کی جاتی ہے؟ نیز تصوف کے ساتھ ان امور کا جوڑ کیا ہے؟ کیا یہ چیزیں تصوف کی ضروری اجزاء ہیں؟ اور کیا خود تصوف یہ راستہ دکھاتی ہے؟

"تیسرا اشکال وجواب"

"۳: قبروں پر چلہ کشی کرنے، حبس دم، ہمیشہ روزہ رکھنے، پوری رات قیام کرنے اور ہمیشہ قیام کرنے، نفس کو اذیتیں پہنچا کر مضمحل کرنے، نکاح نہ کرنے کو بہتر سمجھنے اور ترک علائق کی ازروئے شرع گنجائش ہے؟"

جواب: اس میں مختلف چیزیں ذکر کی گئیں ہیں جن کے نمبروار جوابات درجِ ذیل ہیں:

ا: چلہ کشی میں اگر دیگر بدعات ومنکرات نہ ہوں تو کیا مضائقہ ہے؟

۲: "حبس دم" شیطان کے وساوس وخطرات دور کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور ذرائع کا منصوص ہونا کوئی ضروری نہیں ہے بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ اس سے کسی حکم شرعی کی مخالفت لازم نہ آئے، حبسِ دم کا بھی یہی حال ہے۔

۳: ہمیشہ روزہ رکھنا اگر صوم وصال کی شکل میں ہو جس میں افطاری کی نوبت ہی نہ آئے، تو یہ ممنوع ہے اور اگر وہ معمول کے مطابق روزہ رکھے اور جن ایام میں روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے، ان کو روزہ نہ رکھا جائے تو اس کو فقہاء کرام "صوم دہر" سے تعبیر فرماتے ہیں، یہ بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ اس پر دوام کی صورت میں خود روزہ ایک عادت سی بن جائے گی اور عبادت کا جذبہ کچھ مغلوب ہو جائے گا۔

"فتح القدیر" میں علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:

ویکره صوم الوصال ولو یومین، ویکره صوم الدهر لأنه یضعفه أو یصیر طبعا له. ومبنى العبادة على مخالفة العادة، ولا یحل صوم یوم العید وأیام التشریق.[1]

ترجمہ: "صومِ وصال (مسلسل بغیر افطاری کے روزے) مکروہ ہے اگر چہ دو دن کیوں نہ ہو، اور صوم الدہر (افطاری کے ساتھ مسلسل روزے) بھی مکروہ ہے اسلئے کہ یہ روزہ دار کو کمزور کر دیتا ہے یا روزہ رکھنا اس کی طبیعت بن جاتی ہے، جبکہ عبادت کی بنیاد ہی عادت کی مخالفت ہے، اور عید اور ایامِ تشریق کے روزے بھی جائز ممنوع ہے"

---

[1] فتح القدیر، کتاب الصوم، ج۲ص۳۵۰.

۴: پوری رات یا ہمیشہ قیام کرنے کی اگر کسی کو توفیق مل جاتی ہے اوراس کی وجہ سے اہل وعیال کے ضروری حقوق متاثر نہیں ہوتے تو زہے قسمت۔ حضرت مولانا عبد الحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ "اقامۃ الحجۃ علیٰ اَنّ الا کثار فی التعبّد لیس ببدعۃ" میں اس موضوع پر مفصل گفتگو فرمائی ہے،اس کی طرف مراجعت کرنا مفید ہے۔

۵: نفس کو اس حد تک اذیت دینا تو شاید ضروری ہو کہ واجب احکام کی ادائیگی ہوسکے، اس حد تک تکلیف دینا کہ جان جانے کا گمان غالب ہونے لگے، ناجائز ہے ،اس کے درمیان اگر جائز طریقہ سے اور جائز مقصد کے لئے مجاہدہ کیا جائے تو بہتر ہے۔

٦: نکاح عبادت بلکہ ہمارے نزدیک عام حالات میں سنت مؤکدہ ہے، اس لئے کرنا ہی بہتر ہے ، لیکن بعض افراد کے مخصوص حالات کے پیش نظر مکروہ بھی ہوسکتا ہے جس کی تفصیل فقہی کتابوں میں ذکر کی جاتی ہے، اسی طرح نکاح نہ کرنا اور اس کو بہتر نہ سمجھنا، دونوں ایک چیز نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے مخصوص حالات کے تحت عملی طور پر نکاح نہ کرے تو اس پر یہ بدگمانی جائز نہیں ہے کہ وہ ایک اسلامی حکم وعبادت کو بہتر نہیں سمجھتا۔ علامہ عبد الفتاح ابو غدہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "العلماء العزاب" میں ایسے جلیل القدر اہل علم کی ایک فہرست ذکر فرمائی ہے جنہوں نے علمی ودینی مشاغل کو پیش نظر رکھ کر نکاح نہیں کیا، ان میں سے ایک شخصیت علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ہے جو ناقد کی محبوب شخصیت ہے۔

"چوتھا اشکال وجواب"

۴: کیا جتنی وحی رسول ﷺ پر نازل ہوئی تھی۔ خصوصاً جس کا تعلق دین سے تھا وہ آپ نے سب امت کو پہنچادی تھی یا اس میں سے کچھ باطنی حصہ عوام کو نہیں بتلایا گیا؟ زیادہ واضح الفاظ میں کیا دین کا کچھ حصہ اسرار ورموز کی صورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیا گیا تھا، جو اس طبقہ کے پیشوا تسلیم کئے گئے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس کی دلیل درکار ہے، اگر نفی میں ہو تو تصوف میں باطنی علوم کے ماخذ کیا ہیں؟ اور صوفیاء جو اپنے ہم رتبہ بزرگوں سے خلوت میں اسرار ورموز کی باتیں کرتے ہیں، وہ دین کی باتیں ہوتی ہے یا کچھ اور؟ اور اگر دین کی باتیں ہوتی ہیں، تو ان کو عوام سے چھپایا کیوں جاتا ہے، جبکہ رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ " بلغوا عنی ولو آیۃ" یعنی کسی کے پاس صرف دین کی ایک بات بھی ہو تو اسے لوگوں تک پہنچانا چاہیئے۔

جواب:

الف: اس عبارت " یا اس میں سے کچھ باطنی حصہ " کا پہلی والی عبارت کے ساتھ تقابل درست نہیں ہے، چنانچہ عوام کو نہ بتلانا اس بات کو لازم نہیں ہے کہ ان چیزوں کی تعلیم امت کو نہیں دی گئی، امت صرف عوام میں منحصر نہیں ہے۔

ب: "باطنی علوم " سے یا تو قرآن وسنت کی تعلیمات ہی کا وہ حصہ مراد لیا جاتا ہے جس کا تعلق باطنی احوال وکیفیات کے ساتھ ہوتا ہے اور یا کشف والہام کی ایسی باتیں مقصود ہوتی ہیں جو قرآن وسنت سے متصادم نہیں ہوتیں، لیکن وہ چونکہ اس معنٰی میں دین کا حصہ نہیں ہے جس کا لوگوں کو مکلف کیا جاسکے، اس لئے اس کی تبلیغ

غیر ضروری ہے، خصوصاً جب بات ایسی ہو کہ عام افراد سے اس کا تعلق نہ ہو یا ان کے لئے کسی غلط فہمی کا باعث بن جانے کا اندیشہ ہو۔

ج: دین کا کوئی حصہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا دیگر کسی صحابی کے ساتھ ایسا مخصوص نہیں ہے کہ دیگر امت کو اس کا بالکل علم نہ ہو، البتہ قرآن وسنت کے سرچشمے سے ہر شخص اپنی فہم واستعداد کے مطابق استفادہ کر سکتا ہے، اس باب میں خلفاء ثلاثہ کے ساتھ ساتھ حضرت علی مرتضی، ابن عباس، عبد اللہ بن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا نام نہایت نمایاں ہے، ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک شخصیت کو قرآن وسنت کی روشنی میں بعض ایسے نکات واسرار معلوم ہوں جو دیگر حضرات کو معلوم نہ ہو۔

د: درج بالا روایت مبارکہ سے یہ استدلال کرنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ ہر دینی بات ہر شخص کو پہنچانا ضروری ہے، چنانچہ اصول حدیث، اصول فقہ اور کلام وعقائد کے دقائق عوام کے سامنے بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

"پانچواں اشکال وجواب"

"۵: کیا تصور شیخ کی ازروئے شرع گنجائش ہے؟"

جواب: "تصور شیخ" توحید مطلب اور ارتکازِ خیال کے لئے فی نفسہ ایک مفید وسیلہ ہے، اسی لئے قدیم مشائخ کے ہاں اس کا معمول رہا ہے، لیکن ان کے ہاں بھی اس کی حیثیت کسی شرعی حکم کی تھی اور نہ ہی یہ کوئی امر لازم تھا کہ اس کے بغیر ان کا تصوف ہی پورا نہ ہوتا ہو، بلکہ ایک مفید وسیلے کی حیثیت سے اس پر عمل جاری رہا اور جہاں کہیں اس کو مفید نہ پاتے تھے وہاں اس پر کوئی اصرار بھی نہ ہوتا تھا۔

حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ کا قصہ ان کی سوانح میں ذکر کیا گیا ہے کہ ان کو "تصور شیخ" کے متعلق تسلی نہیں تھی اور اس کو شرعاً درست نہ سمجھتے تھے اور اپنے شیخ حضرت امام شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ نے جب اس کی تلقین و تعلیم دی تو ان سے بھی صاف صاف فرمایا کہ میرے نزدیک اس کی شرعاً گنجائش نہیں ہے، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی بلکہ دوسرے وسائل سے مقصود حاصل کرنے کا طریقہ سکھایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ "تصور شیخ" نہ فی نفسہ ناجائز ہے اور نہ ہی تصوف کا کوئی جزء لازم۔ چنانچہ بعد میں جب اس میں شرعی حدود سے تجاوز کیا جانے لگا تو خود مشائخ تصوف ہی نے اس کو عملی طور پر ترک کر دیا، بلکہ زبانی طور پر اس کی ممانعت فرمانے لگے، چنانچہ کوچہ تصوف ہی کے ایک فرد فرید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ اسی سے متعلق ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"نفس تصور جائز ہے اگر کوئی امر ممنوع اس کے ساتھ نہ ہو جیسا تمام اشیاء کا آدمی خیال و تصور کرتا۔ جب اس کے ساتھ تعظیم اس شکل کا کرنا اور متصرف باطن مرید میں جاننا مفہوم ہوا تو موجب شرک کا ہو گیا لہٰذا اقدما اس کی تجویز کرتے تھے کہ اس میں خلط معصیت کا نہ تھا اور متاخرین نے اس کو حرام کہا تو یہ حکم کا اختلاف اہل زمانہ کے ہوا ہے۔"

ایک دوسرے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

"کسی کا تصور کرنا بطور خیال کے کچھ حرج نہیں مگر رابطہ جو مشائخ میں مروج ہے کہ اس کو مشائخ نے کسی علاج کے واسطے تجویز کیا تھا اگر اس ہی حد پر رہے کہ جس حد پر بزرگوں نے تجویز کیا تھا تو چنداں دشواری نہیں گو ترک اس کا بھی اولیٰ ہے کہ مختلف فیہ بین

العلماء ہے اور ایسا بھی نہیں کہ بدوں اس کے کام نہ چل سکے اور جو اس حد سے بڑھ جاوے تو البتہ ناجائز ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔"[1]

"مشائخ تصوف" کی اس قدر انصاف پسندی اور حکمت بینی کے بعد بھی کیا محض اس مسئلے کو لے کر سلوک و تصوف ہی کو دین اسلام کا متصادم دین قرار دیا جاسکتا ہے!

"چھٹا اشکال و جواب"

"٦: کیا اخروی نجات کے لئے سلوک کی منازل طے کرنا ضروری ہے؟ اگر جواب نفی میں ہو تو کیا اس کا ترک بہتر نہیں، جبکہ اس کے مصالح سے اس کے مفاسد بہت زیادہ ہیں، خصوصاً ایسے ادوار میں جبکہ تحریک باطنیت اس تصوف پر بُری طرح محیط ہو چکی ہے۔"

جواب: اس کا جواب اس کتاب کے پہلے باب میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاچکا ہے کہ سلوک و تصوف کا راستہ اختیار کرنا فی نفسہ ضروری نہیں ہے لیکن اصلاح قلب کی ایک حد وہ ہے جو شرعاً ضروری ہے اور اس کے حصول کے گو مختلف صورتیں اور وسائل ممکن ہیں لیکن عام متبادر راستہ یہی تصوف ہے، اس لئے اس کی ترغیب دی جاتی ہے۔ مزعوم مفاسد کی وجہ سے تصوف ہی کو ترک کرنا اس لئے غلط ہے کہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے مفاسد کا جو زعم کیا جاتا ہے وہ واقع کے مطابق

---

[1] فتاوی رشیدیہ، شیخ کے تصور کا حکم، صفحہ نمبر: ۴۰.

نہیں اور جو مفاسد واقعۃً موجود یا ممکن ہیں، ان کے اصلاح وازالہ کی دیگر صورتیں ممکن ہیں۔

"ساتواں اشکال وجواب"

"۷: کیا کشف کا علم یقینی ہے۔ اگر جواب نفی میں ہے تو جن صوفیاء نے شریعت کے بجائے اپنے کشف پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

جواب:

امتی کا کشف غیر یقینی ہے۔ "شریعت کی بجائے کشف پر عمل کرنے" کا مطلب اگر یہ ہے کہ محض کشف وخواب کی وجہ سے قرآن وسنت کا کوئی حکم چھوڑ دے تو یہ جائز نہیں ہے اور ایسا اقدام کرنا بھی درست نہیں ہے، لیکن جس کشف پر عمل کرنے کی وجہ سے کسی شرعی حکم میں خلل نہ آتا ہو تو اس پر عمل کرنا بھی درست ہے جس طرح کوئی شخص اپنی قلبی رجحان یا عقلی تجویز پر عمل کرتا ہے۔

"آٹھواں اشکال وجواب"

"۸: جس رہبانیت کو اسلام نے ناپسند فرمایا تھا اس رہبانیت اور موجودہ تصوف میں مابہ الامتیاز فرق کیا ہے؟"

جواب: اول تو تصوف کے لئے معاشرے سے بالکل الگ تھلگ ہونا کوئی ضروری نہیں ہے بلکہ معاشرے کا جزء بن کر تصوف کے تقاضوں کی تعمیل وتکمیل کی جاسکتی ہے، چنانچہ ایسے ہزاروں ہی نہیں لاکھوں افراد ہیں جو سلوک کے مختلف منازل اسی معاشرے کے اندر رہ کر اور مختلف دنیوی اشغال ومصروفیات کو برقرار

رکھ کر پوری کررہے ہیں۔ جو رہبانیت مذموم ہے وہ یہ ہے کہ اپنے یا اہل وعیال وغیرہ کسی مسلمان کے ضروری حقوق میں کوتاہی کی جائے اور تصوف رعایت حقوق کی پوری تاکید واصرار کرتا ہے۔

"نواں اشکال وجواب"

"۹: محفل سماع ووجد اور حال کی کوئی مثال دور صحابہ میں ملتی ہے اگر یہ چیزیں کچھ فضیلت رکھتی ہیں تو صحابہؓ کا دور اِن سے کیوں خالی ہے؟ اور اگر مذموم ہیں تو ان کو اختیار کرنے کے مصالح کیا ہے؟"

جواب: ان چیزوں کی فضیلت کی بحث ہی نہیں ہے بلکہ وجد اور حال تو ہیں بھی غیر اختیاری چیزیں۔ یہ دونوں چیزیں جس طرح مطلوب نہیں ہیں یوں ہی بلا دلیل ان کو ممنوع وحرام کہنا بھی بالکل غلط ہے، جہاں تک محفل سماع کا حکم ہے تو اس کے حکم میں کچھ تفصیل ہے جو احیاء العلوم وغیرہ کتابوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، البتہ اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ موجودہ گانے بجانے ناجائز ہیں۔

"دسواں اشکال وجواب"

"۱۰: کیا وجہ ہے کہ تین چار لاکھ صحابہ سے، جو پوری ایک صدی پر پھیلا ہوا ہے، تو دس بارہ سے زیادہ کرامات وقوع پذیر نہیں ہوئیں، لیکن صوفیاء کے ایک ایک بزرگ سے بیسوں بلکہ سینکڑوں کرامات وقوع پذیر ہونا تذکروں سے ثابت ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات یہ کرامات اتنی رفیع الشان ہوتی ہیں کہ ان کے مقابلے میں انبیاء کے معجزات ہیچ نظر آنے لگتے ہیں؟ کیا یہ استدراج تو نہیں ہوتا؟"

جواب: پہلے تو یہ بات تسلیم ہی نہیں ہے، عدم علم یا عدمِ نقل سے عدم وقوع لازم نہیں آتا کہ دونوں باتوں میں کوئی استلزام نہیں ہے اور یہ کوئی دین کا حصہ بھی نہیں جس کو نقل کرنا ضروری اور نہ نقل کرنا کوتاہی یا جرم شمار کیا جاسکے۔ لیکن بالفرض اشکال میں ذکر کردہ بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی آخر اشکال کیا اور کس پر ہے؟ جب یہ بات طے ہے کہ کرامات و معجزات کا صدور انسان کے اختیار میں نہیں ہے تو اس سوال کا رخ خود اللہ تعالیٰ کی طرف پھر جاتا ہے!

"گیارہوں اشکال و جواب"

"١١: ایسی قبور یا مزارات جہاں کسی انسان کے بجائے مردہ حیوان کی ہڈیاں دفن کی جاتی ہیں یا وہ بھی نہیں ہوتیں، ایسے مزارات سے لوگوں کی حاجت روائی کی کیا وجوہ ہیں؟"

تبصرہ: یہ غیر سنجیدہ سوال ہے۔

"بارہواں اشکال و جواب"

"١٢: اہل طریقت نے جو باطنی نظام مقرر کر کے غوث، قطب، ابدال، اوتار وغیرہ کے مناصب کی تعیین کر رکھی ہے اور ایک بڑا ولی، چھوٹے ولی کی پل بھر میں ولایت ختم کر دیتا ہے اور کسی نئے شخص کو آنِ واحد میں ولایت عطا کر بھی دیتا ہے۔ ان باتوں کا عہد نبوی میں کہیں سراغ ملتا ہے؟"

جواب: اول تو اس بات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ یہ اصطلاحات و مقامات تصوف کے ضروری اجزاء میں سے نہیں ہیں اور اس کے نہ ماننے کی وجہ سے کوئی

شخص تصوف سے بے گانہ ونابلد نہیں ہوتا۔ جو حضرات اس کے قائل ہیں انہوں نے بعض آثار اور کچھ مشاہدات وتجربات پر اس کا مدار رکھا ہے، اس لئے ان پر بلا وجہ نکیر کرنے کی بھی کوئی خاص ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

جہاں تک ولایت ختم کرنے کی بات ہے تو ولایت کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور وہی کسی کو یہ نعمت بخشتا یا اس سے چھین لیتا ہے جس میں کسی انسان کا دخل نہیں ہوتا، البتہ بعض اوقات کوئی شخص نیکی اور تعلق مع اللہ کے باوجود کسی بڑے عالم یا صالح شخص کو کوئی اذیت پہنچاتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس خاص تعلق کی دولت سے محروم ہوجاتا ہے، اس میں بھی بعض اوقات اس عالم وصالح کو دینی فراست وغیرہ سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ شخص اپنے اس تجاوز کی وجہ سے اس انجام سے دوچار ہوجائے گا اور بسا اوقات اس بات کا اظہار بھی کردیتا ہے۔

"صحیح بخاری" میں ہے:

عن عطاء، عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلىٰ الله عليه وسلم: " إن الله قال: من عادىٰ لي وليا فقد آذنته بالحرب.[1]

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: جس نے میرے کسی ولی کے ساتھ بغض وعداوت رکھی میرا اس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے"

---

[1] صحيح البخاري: باب التواضع، ج٨ص ١٠٥.

اعلان جنگ کے بعد ولایت بلکہ ایمان واسلام کی نعمت بھی چھینی جاسکتی ہے کہ جنگ میں ہر فریق دوسرے فریق کو اسی چیز سے محروم کرنے کا خواہاں ہوتا ہے جو اس کے نزدیک زیادہ قیمتی اور نفیس ومؤثر ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان اور ولایت کی نعمت ہی زیادہ عزیز ہے، قرآن کریم میں ہے:

{ وَرِضۡوَانٌ مِنَ اللهِ أَكۡبَرُ }[1]

ترجمہ: "اور اللہ کی رضا ان سب سے بڑی ہے"۔

"تیرہواں اشکال وجواب"

"١٣: کیا وجہ ہے کہ علمائے تصوف آغاز تصوف سے ہی علمائے شریعت کو یہ یقین دہانی کراتے چلے آئے ہیں کہ طریقت یا تصوف شریعت ہی سے ماخوذ ہے اور شریعت کے اتباع کے بغیر چارہ نہیں مگر علمائے شریعت نے کسی دور میں بھی ان کی اس بات کا اعتبار نہیں کیا اور ہمیشہ گرفت کرتے چلے آئے ہیں؟"

جواب: یہ بات تسلیم نہیں ہے، بعض صوفیاء کی بعض خرابیوں اور تجاوزات پر تنقید کرنا اور اس کی اصلاح ودرستگی کی کوشش کرنا اہل علم کی ذمہ داری اور ان کا فرض منصبی ہے جو پہلے بھی تھا اور الحمد اللہ اب بھی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ "علمائے شریعت نے کسی دور میں بھی ان کی اس بات کا اعتبار نہیں کیا اور ہمیشہ گرفت کرتے چلے آئے ہیں"۔ اگر اہل تصوف کی بعض غلطیوں سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے تو پھر علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ کی

---

[1] التوبة: ٧٢

کتاب" تلبیسِ ابلیس" اور اس جیسی دیگر کتابوں سے یہ نتیجہ بھی اخذ کرنا کوئی زیادہ بعید نہیں ہے کہ علمائے دین نے ہر دور میں عباد وزہاد، محدثین، مفسرین، فقہاء، متکلمین، مجاہدین اور تمام انسانوں کو کوئی وزن نہیں دیا اور ان پر ہر دور میں اور ہمیشہ گرفت کرتے چلے آئے ہیں۔

"چودھواں اشکال وجواب"

"۱۴: جن اولیاء اللہ کے متعلق تذکرہ نگاروں کی یہ شہادت موجود ہے کہ وہ خلاف شریعت کام کیا کرتے تھے۔ان کو عزت و تکریم کا مستحق کیوں سمجھا جاتا ہے؟ ان کو قدس سرہ کیوں لکھا جاتا ہے؟ اور انہیں اولیاء اللہ کی فہرست سے خارج کیوں نہیں کیا جاتا؟"

جواب: ہر تذکرہ نگار کی ہر بات پر کہاں اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ علم جرح وتعدیل سے متعلق کتابیں عام تاریخ اور تذکرہ نگاری کی کتابوں سے زیادہ معتمد سمجھی جاتی ہیں لیکن کیا وہاں ذکر کردہ ہر بات پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ البتہ یہ طے شدہ امر ہے کہ گناہ کا ارتکاب کرنا بہر حال مذموم ہے اور اس پر اصرار کرنا اور توبہ نہ کرنا شانِ ولایت کے منافی ہے۔

"پندرہوں اشکال وجواب"

"۱۵: کیا ایسے صوفی جو لامذہب تھے ان کو مسلمان کہنا یا اولیاء اللہ سمجھنا درست ہے؟ "

جواب: جب لامذہب ہونے کا اعتراف ہے تو مسلمان یا ولی اللہ کہنا کہاں درست ہو سکتا ہے؟

مصادرومراجع

- ❖ اتمام الدرایۃ لقراء النقایۃ: عبد الرحمن بن ابی بکر، جلال الدین السیوطی (المتوفی:۹۱۱ھ)
- ❖ احیاء علوم الدین: ابو حامد محمد بن محمد الغزالی الطوسی (المتوفی:۵۰۵ھ)
- ❖ اخلاق اور فلسفہ اخلاق: مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، میر محمد کتب خانہ آرام باغ، کراچی
- ❖ آداب النفوس للمحاسبی: الحارث بن اسد المحاسبی، ابو عبد اللہ (المتوفی:۲۴۳ھ)
- ❖ الاربعین فی اصول الدین: الامام ابی حامد محمد بن محمد بن محمد الغزالی، مکتبہ الاحرار
- ❖ الاعتصام للشاطبي ت الهلالي، المؤلف: إبراهيم بن موسى بن محمد الشهير بالشاطبي (المتوفى:۷۹۰ھ-)
- ❖ اعتقادات فرق المسلمين والمشركين، المؤلف: أبو عبد الله محمد بن عمر بن الحسن الملقب بفخر الدين الرازي (المتوفى:۶۰۶ھ-)
- ❖ اعتلال القلوب للخرائطی: ابو بکر محمد بن جعفر بن محمد (المتوفی:۳۲۷ھ)
- ❖ الإعلام بأنّ التصوّف من شریعۃ الإسلام:
- ❖ إغاثۃ اللفہان فی مصاید الشیطان ط عالم الفوائد: محمد بن ابی بکر بن ایوب ابن قیم الجوزیۃ (المتوفی:۷۵۱ھ)

❖ البحور الزاخرة فی علوم الآخرۃ: محمد بن احمد بن سالم بن سلیمان السفارینی الحنبلی(۱۱۱۴-۱۱۸۸ھ)
❖ بریقۃ محمودیۃ فی شرح طریقۃ محمدیۃ وشریعۃ نبویۃ فی سیرۃ احمدیۃ: محمد بن محمد بن مصطفی بن عثمان (المتوفی:۱۱۵۶ھ)
❖ بصائر حکیم الامت، ڈاکٹر عبد الحیٔ عارفی
❖ البهجة السنّية في آداب الطّريقة العليّة الخالدية النّقشبندية
❖ ت:شعَيب الأرنؤوط- محمَّد كامل قره بللي، دار الرسالة العالمية
❖ تاج العروس: محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسینی (المتوفی:۱۲۰۵ھ)
❖ تبلیغ دین: الامام ابی حامد محمد بن محمد بن محمد الغزالی، ترجمہ: مولانا عاشق الہی صاحب، ادارۃ المعارف، کراچی
❖ ترتیب العلوم للمرعشی: محمد بن أبی بکر المرعشی الشہیر بساجقلی زادہ (المتوفی:۱۱۴۵ھ)
❖ الترغیب فی فضائل الاعمال وثواب ذلک لابن شاہین: ابو حفص عمر بن احمد بن عثمان (المتوفی:۳۸۵ھ)
❖ التعرّف لمذہب اہل التصوّف: ابو بکر محمد بن ابی اسحاق بن ابراہیم الکلاباذی البخاری الحنفی (المتوفی:۳۸۰ھ)
❖ التعریفات: علی بن محمد بن علی الزین الشریف الجرجانی (المتوفی:۸۱۶ھ)
❖ التفسير المظهري، المؤلف: المظهري، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتّی رحمہ اللہ
❖ التّفهيمات الإلهية، ص ا ضمن مجموعة رسائله الّتي قدْ طُبعتْ بعناية فضيلة الشيخ المفتي عطاء الرحمن القاسمي،

❖ جامع العلوم والحکم ت ماہر الفحل: زین الدین عبد الرحمن بن احمد بن رجب الحنبلی (المتوفی:۷۹۵ھ)

❖ جامع معمر بن راشد : معمر بن أبي عمرو راشد الأزدي مولاهم (المتوفی:۱۵۳ھ)

❖ جدیدیت، جناب حسن عسکری صاحب

❖ جمع الجوامع مع شرح الجلال المحلی:

❖ الجهاد لابن ابي عاصم: ابو بكر بن ابي عاصم وهو احمد بن عمرو بن الضحاک (المتوفی:۲۸۷ھ)

❖ حاشیۃ ابن عابدین علی الدر المختار : ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین الدمشقی الحنفی (المتوفی:۱۲۵۲ھ)

❖ حجۃ اللہ البالغۃ: الإمام أحمد بن عبد الرحيم المعروف بـ «ولی الله الدہلوی» (المتوفی:۱۱۷۶ھ

❖ حسن التلطف فی بیان وجوب سلوک التصوف:

❖ الحکم العطائیہ مع شرح العلامۃ بن عباد النّفری:

❖ دار الجیل، بیروت-لبنان

❖ الدعوات الکبیر: أحمد بن الحسین بن علی الخراسانی (المتوفی:۴۵۸ھ)

❖ الرسالۃ القشیریۃ: المؤلف: عبد الكريم بن هوازن بن عبد الملك القشیری (المتوفی:۴۶۵ھ)

❖ رسالة المسترشدين، المؤلف: الحارث بن أسد المحاسبي، أبو عبد الله (المتوفى:۲۴۳ھ)
❖ رسالۃ إنقاذ الہالکین فی حکم اخذ الاجرۃ علی تلاوۃ القرآن الکریم: تقی الدین، محمد بن بیر علی البرکوی الحنفی (المتوفی:۹۸۱ھ)
❖ الزہد الکبیر للبیہقی: احمد بن الحسین بن علی الخراسانی، ابو بکر البیہقی (المتوفی:۴۵۸ھ)
❖ الزواجر عن اقتراف الکبائر: احمد بن محمد بن علي بن حجر الہیتمی السعدی الأنصاری (المتوفی:۹۷۴ھ)
❖ سنن ابن ماجہ ت الأرنؤوط : أبو عبد اللہ محمد بن یزید القزوینی (المتوفی:۲۷۳ھ)
❖ سنن ابی داود ت الأرنؤوط: ابو داود سلیمان بن الأشعث بن اسحاق الأزدی السِّجِسْتانی (المتوفی:۲۷۵ھ)
❖ سنن الترمذی ت بشار: محمد بن عیسی بن سَوْرۃ بن موسی الترمذی (المتوفی:۲۷۹ھ)
❖ السنن الکبری للبیہقی ت الترکی : ابو بکر احمد بن الحُسین بن علی البیہقی (۳۸۴-۴۵۸ھ)
❖ السنن الکبری للنسائی: أبو عبد الرحمن أحمد بن شعیب بن علی الخراسانی، النسائی (المتوفی:۳۰۳ھ)
❖ سنن سعید بن منصور : أبو عثمان سعید بن منصور بن شعبۃ الخراسانی الجوزجانی (المتوفی:۲۲۷ھ)

❖ سیر السّلوک الی ملک الملوک:
❖ شرح النووی علی مسلم: ابو زکریا محی الدین یحیی بن شرف النووی (المتوفی:٦٧٦ھ)
❖ شرح عین العلم وزین الحلم: ملا علی قاری رحمہ اللہ
❖ شریعت وتصوف:
❖ شعب الایمان: احمد بن الحسین بن علی بن موسی الخُسرَوْجِردی الخراسانی (المتوفی:۴۵۸ھ)
❖ الشفا بتعریف حقوق المصطفی مع حاشیۃ الشمنی: ابو الفضل القاضی عیاض (المتوفی:۵۴۴ھ)
❖ شفاء السّائل وتھذیب المسائل: علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ
❖ صحیح ابن حبان: محمد بن حبان بن احمد، التمیمی (المتوفی:۳۵۴ھ)
❖ صحیح البخاری: محمد بن إسماعیل أبو عبد اللہ البخاری الجعفیت: محمد زہیر بن ناصر الناصر، دار طوق النجاۃ
❖ صحیح مسلم: مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشیری (المتوفی:۲٦۱ھ)
❖ صفۃ الصفوۃ، المؤلف: جمال الدین أبو الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي (المتوفی:۵۹۷ھ)
❖ الصمت لابن أبي الدنیا: أبو بکر عبد اللہ بن محمد بن عبید المعروف بابن أبي الدنیا (المتوفی:۲۸۱ھ)
❖ صید الخاطر، المؤلف: جمال الدین أبو الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي (المتوفی:۵۹۷ھ)

❖ الطریقة المحمدیة: محمد بن بیر علی البرکوی(المتوفی ۹۸۱)ت : محمد رحمۃ اللہ، حافظ محمد ناظم الندوی، مکتبہ حقانیہ

❖ عدۃ المرید الصادق، المؤلف: شھاب الدین أبو العباس أحمد بن أحمد بن محمد المعروف ب۔زروق(المتوفی:۸۹۹ھ۔)

❖ عیوب النفس: محمد بن الحسین بن محمد بن موسی النیسابوری (المتوفی:۴۱۲ھ)

❖ الفتاوی الحدیثیة لابن حجر الھیتمي، المؤلف: أحمد بن محمد بن علي بن حجر الھیتمي(المتوفی:۹۷۴ھ۔)

❖ الفتاوی الھندیة: لجنة علماء برئاسة نظام الدین البلخی، الناشر: دار الفکر

❖ فتاوی رشیدیہ: مولانا رشید احمد گنگوہی، (المتوفی ۱۳۲۳ھ)، ادارہ اسلامیہ لاہور

❖ فتح القدیر: المؤلف: کمال الدین محمد بن عبد الواحد ابن الھمام (المتوفی:۸۶۱ھ)

❖ فضائح الصوفیة: عبد الرحمن بن عبد الخالق الیوسف، مکتبة ابن تیمیة، الکویت

❖ فیض القدیر: زین الدین محمد المدعو بعبد الرؤوف بن تاج العارفین (المتوفی:۱۰۳۱ھ۔)

❖ قطب الإرشاد: للحاج فقیر اللہ بن عبد الرحمن الحنفی، مکتبہ حقانیہ و مکتبہ امدادیہ

❖ قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب: محمد بن علی بن عطیۃ الحارثی، ابو طالب المکی (المتوفی:٣٨٦ھ)

❖ الکافی شرح البزوی: الحسین بن علی بن حجاج بن علی، حسام الدین السِّغْنَاقی (المتوفی:٧١١ھ)

❖ کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم: محمد بن علی ابن القاضی محمد حامد التھانوی (المتوفی: بعد ١١٥٨ھ)

❖ کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون: مصطفی بن عبد اللہ کاتب جلبی المشھور باسم حاجی خلیفۃ (المتوفی:١٠٦٧ھ)

❖ کشف المشکل من حدیث الصحیحین: المؤلف: جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي (المتوفی:٥٩٧ھ)

❖ الکلیات: ایوب بن موسی الحسینی القریمی الکفوی، أبو البقاء الحنفی (المتوفی:١٠٩٤ھ)

❖ کیمیائے سعادت: الامام ابی حامد محمد بن محمد بن محمد الغزالی، دار الاشاعت کراچی

❖ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، المؤلف: أبو الحسن نور الدین علي بن أبي بکر بن سلیمان الھیثمي (المتوفی:٨٠٧ھ)

❖ مختصر منھاج القاصدین: نجم الدین، أبو العباس، أحمد بن عبد الرحمن بن قدامۃ المقدسی (المتوفی:٦٨٩ھ)

❖ مدارج السالکین بین منازل إیاک نعبد وإیاک نستعین، المؤلف: محمد بن أبي بکر بن أیوب ابن قیم الجوزیۃ (المتوفی:٧٥١ھ)

❖ المستدرک علی الصحیحین للحاکم، المؤلف: أبو عبد اللہ الحاکم محمد بن عبد اللہ بن محمد المعروف بابن البیع (المتوفی: ۴۰۵ھ)

❖ مسند احمد ط الرسالۃ: ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل (المتوفی: ۲۴۱ھ)

❖ مصنف ابن ابی شیبۃ: ابو بکر بن ابی شیبۃ، عبد اللہ بن محمد بن ابراھیم (المتوفی: ۲۳۵ھ)

❖ المعجم الکبیر للطبرانی: سلیمان بن احمد بن أیوب بن مطیر اللخمی الشامی (المتوفی: ۳۶۰ھ)

❖ معجم مقالید العلوم فی الحدود والرسوم: عبد الرحمن بن ابی بکر، جلال الدین السیوطی (المتوفی: ۹۱۱ھ)

❖ معید النعم ومبید النقم، المؤلف: تاج الدین عبد الوهاب بن تقي الدین السبکي (المتوفی: ۷۷۱ھ)

❖ مقاصد الرعایۃ لحقوق اللہ عز وجل، المؤلف: أبو محمد عز الدین عبد العزیز بن عبد السلام (المتوفی: ٦٦٠ھ)

❖ مقدمۃ تاریخ ابن خلدون: عبد الرحمن بن محمد بن محمد، ابن خلدون (المتوفی: ۸۰۸ھ)

❖ موارد الظمآن لدروس الزمان، المؤلف: عبد العزیز بن محمد بن عبد المحسن السلمان (المتوفی: ۱۴۲۲ھ)

❖ موطأ مالک ت الاعظمی: مالک بن انس بن مالک الاصبحی المدنی (المتوفی: ۱۷۹ھ)

❖ میزان العمل، أبو حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي (المتوفی: ۵۰۵ھ)